جیلانی بانو
نئی عورت

فکشن ہاؤس کی مطبوعات

علم و ادب کی نمائندہ کتابیں

تاریخ اور فلسفہ تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی
شاہی محل	ڈاکٹر مبارک علی
تاریخ کی روشنی	ڈاکٹر مبارک علی
تاریخ اور عورت	ڈاکٹر مبارک علی
تلاش حق (آپ بیتی)	مہاتما گاندھی
خانہ بدوش (آپ بیتی)	اجیت کور
فالتو عورت (اجیت کور کی کہانیاں)	اجیت کور
گوری (ناول)	اجیت کور
خانماں برباد (ناول)	سلمیٰ مسعود
نئی عورت (افسانے)	جیلانی بانو
انسانی تہذیب کا ارتقاء	ول ڈیورانٹ
روشن خیالی	سبط حسن/احمد سلیم
نیا عالمی نظام اور پاکستان	احمد سلیم
پشتون اینڈ بلوچ ہسٹری ۔ انگریزی	احمد سلیم
خیال و خواب (سیاست)	افتخار علی شیخ
تحریک آزادی اور باچا خان	فارغ بخاری
صوبہ سرحد کی انقلابی تحریکیں اور مولانا عبدالرحیم پوپلزئی	ڈاکٹر عبدالجلیل پوپلزئی
خلیل جبران کے شاہکار افسانے	مرتب= ملک اشفاق
شاہکار سندھی افسانے	مرتب=طاہر اصغر
کالام سے کافرستان تک (سیاحت)	محمد پرویش شاہین
ہمایوں نامہ	گلبدن بیگم
ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں	ڈاکٹر کنور اشرف
فیض احمد فیض تنقیدی جائزہ	خلیق انجم
یورپ کا بہترین ادب	سجاد بخاری
اردو ادب کی خواتین ناول نگار	نیلم فرزانہ
کرشن چندر اور افسانہ نگاری	ڈاکٹر احمد حسن
کشمیری انشائیے کانٹے	ڈاکٹر زمان
ٹوٹتے بکھرتے لوگ ۔ ناول	یوگیش کمار
بیدی نامہ	ڈاکٹر شمس الحق عثمانی
وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا (شاعری)	ازہر منیر
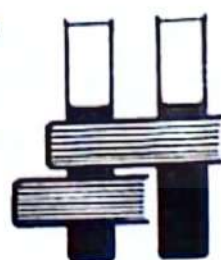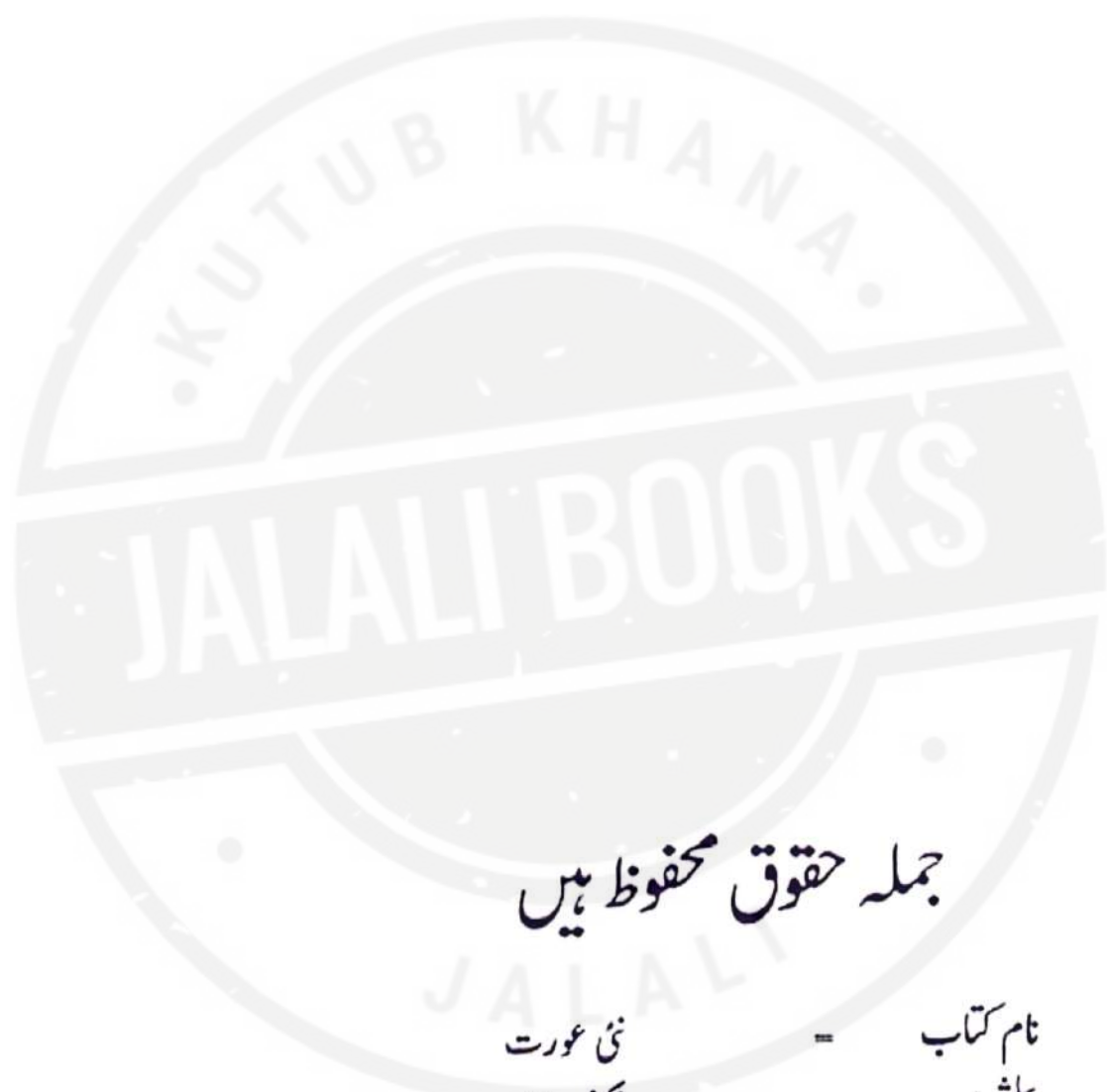
جیلانی بانو

نام کتاب = نئی عورت
پبلشرز = فکشن ہاؤس
18 مزنگ روڈ لاہور فون 7237430
کمپوزنگ = ا-یکوگرافکس شادمان لاہور 481819
پرنٹرز = زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
سرورق = ریاظ
اشاعت اول = 1993ء

پبلشرز نوٹ

"نئی عورت" جیلانی بانو کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جیلانی بانو اردو فکشن میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ انہوں نے اردو ادب میں افسانوں کے علاوہ ناول بھی لکھے ہیں جن میں "ایوان غزل" اور "بارش سنگ" قابل ذکر ہیں۔

ایوان غزل 1976 میں شائع ہوا۔ یہ بنیادی طور پر ایک سماجی اور تہذیبی ناول ہے۔ ایوان غزل کی اشاعت کے طویل عرصہ بعد جیلانی بانو کا دوسرا ناول بارش سنگ (1985ء) منظر عام پر آیا۔ بارش سنگ میں حقیقت کی تصویر کشی بالخصوص دیہی زندگی اور اس زندگی کے مسائل کی کامیاب حقیقت پسندانہ عکاسی کی گئی ہے۔

جیلانی بانو نے اپنے افسانوں میں ناانصافی۔ ظلم و جبراور خصوصاً" عورت کے استحصال کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ حقیقت پسند لکھاری وہی ہوتا ہے جو اپنے معاشرے کی حقیقی منظر کشی اپنی تحریروں میں کرتا ہے۔ ایسے ادیب کو عوام پڑھتے ہیں اور اس سے محبت بھی کرتے ہیں۔ گذشتہ سال جیلانی بانو کے افسانوں کا مجموعہ "یہ کون ہنسا" شائع ہوا جو قارئین نے بہت پسند کیا۔

فکشن ہاؤس کی روایت ہے کہ وہ معیاری ادبی کتب شائع کرتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین کو اردو فکشن کی ممتاز افسانہ نگار محترمہ جیلانی بانو کی کہانیوں کا مجموعہ "نئی عورت" پسند آئے گا اور ہمیں اپنی آرا سے آگاہ فرمائیں گے۔ قارئین کی تعمیری تنقید ہمارے لئے رہنمائی ہو گی۔

ظہور احمد خان / رانا عبدالرحمان

فروری 1993ء

ترتیب

تین لکیریں

یہاں ایک نقاد سے آپ کو ملاقات کرانی تھی' جو میری کہانیوں کی' ترکیب استعمال' کے ساتھ آپ کے نام ایک سفارشی چٹھی بھی میرے ہاتھ میں تھما دیتا۔ اس طرح جہاں آپ میری تعریفیں سننے سے بچ گئے وہاں نقاد کے فرائض بھی آپ ہی پر عائد ہو گئے ہیں۔

اپنی کتاب کا خود ہی پیش لفظ لکھنے سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے! اس طرح میں نے اپنے آپ کو"فن کار"منوانے کے سارے موقعے کھو دیے ہیں۔

یوں کہانیاں لکھنا تو آسان سی بات ہے۔ لیکن اپنا پوسٹ مارٹم کرنے کے لئے خود ہی آسینیں چڑھا کے بیٹھنا بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ اب میں اس بچے کی طرح جو ماسٹر کی صورت دیکھ کر کرسیوں کے نیچے چھپتا پھرتا ہے' اپنے آپ سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہوں۔

یہ بڑی مایوس کن بات تھی کہ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو ادب میں موضوع کچھ ختم سے ہو چکے تھے۔ یعنی وہ ایک خاص فضا نہیں تھی جب موضوع کا مینہ سا برستا ہے۔ افسانہ نگاروں اور شاعروں کی بن آتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم' 47ء کا تہلکہ' حیدر آباد کا پولیس ایکشن اور تلنگانے کے نعرے' اب ہر طرف سناٹا چھا رہا تھا۔ بھیمڑی کانفرنس بھی ہو چکی تھی۔ یعنی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے اور ایک صبح اچانک "مشہور ادیب" بنے ہوئے جاگنے کے سارے موقعے نکل چکے تھے۔ البتہ امن کانفرنسوں کی دھوم مچی ہوئی تھی اور کوریا میں ابھی تک لاشیں اٹھائی جا رہی تھیں۔ کچھ افسانہ نگار فسادوں میں چھپی دبی لاشیں کریدتے پھر رہے تھے۔ ویسے عام فضا میں صرف تو تو' میں میں گونج رہی تھی۔ بڑے لکھنے والوں میں پھوٹ پڑ چکی تھی ور صبح شام پروگرام بدل رہے تھے۔

یعنی اخباروں کی خبریں اور ترقی پسند مصنفین کا منی فیسٹو سامنے رکھ کر ادب تخلیق کرنے کا عام رواج تھا۔

کہتے ہیں ادیب بننے سے پہلے لکھنے والے کو ایک طلسمی غار میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جہاں راہ میں اسے زندہ اور مردہ ادیبوں کے بھوت پریت ملتے ہیں۔ کوئی دیدے نکال نکال کے ڈرا رہا ہے۔ کوئی طلسمی سبزہ زاروں کی سیر کروا رہا ہے۔ ایک طرف سے دودھ کے پیالے چلے آ رہے ہیں تو کہیں نعمتوں کے خوان چنے ہوئے ہیں۔ ہر ایک اس کی لاٹھی تھام

کے اپنی جانب گھسیٹنا چاہتا ہے۔ اب یہ لکھنے والے کے اعمال پر منحصر ہے کہ وہ خبیث روحوں میں گھر کے اپنا عمل بھول بیٹھا اور ہذیان بکنے میں لگا۔ یا کسی فرشتہ صفت روح نے اس پر سایہ کیا اور اس نے اپنی راہ پالی۔

لیکن ہم جیسے چھٹ بھیوں کے ساتھ یہ بھی نہ ہوا۔ نہ کسی نقاد نے بسم اللہ پڑھائی۔ نہ پہلی کہانی لکھتے ہی ادب ٹس سے مس ہوا۔ جب میں نے "ڈریم لینڈ" لکھی (جو غالباً" میری تیسری کہانی تھی) تو ایک مشہور ادیب نے کہا۔

"آپ امن کے متعلق کہانیاں لکھئے' آج کل یہی موضوع پسند کیا جارہا ہے۔"

مگر میں کوشش کے باوجود امن پر کچھ نہ لکھ سکی' حالانکہ اس کے لیے میں نے جنگ سے متعلق سارا عبرت ناک ادب پڑھ کر اپنے اوپر رقت طاری کرنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن چار سال کے بعد میں نے "آگ اور پھول" لکھ کر اس ادیب کی فرمائش پوری کردی۔ اس کہانی کے متعلق پاکستان کے ایک قاری نے لکھا "آج کل تو امن کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ چکی ہیں' تعجب ہے اس سرد فضا میں آپ نے اتنی گرم کہانی کیسے لکھ لی۔"

اس طرح موسم کا لحاظ رکھتے ہوئے مجھ سے کہانی کبھی نہ لکھی گئی۔

ان کہانیوں میں آپ کو ان سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے' جو ایسے موقعوں پر مجھ سے کیے جائیں گے۔ اگر یہاں آپ کی تشفی نہ ہو تو میری ان کہانیوں کا انتظار کیجئے' جو میں آئندہ لکھوں گی۔

ان میں سے کچھ کہانیاں وقتی تاثر ہیں۔ مثلاً" "پنچوں کی رائے"' "ڈریم لینڈ"' "جھمیا" وغیرہ۔ یہ میں نے ایک ہی نشست میں لکھیں اور ان کے کرداروں نے ایسا مجبور کیا کہ مجھے پلاٹ سنوارنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ کچھ کہانیاں ایسی ہیں جن کے لیے میں نے لکھنا سیکھا۔ مثلاً" "روشنی کے مینار"' "مٹی کی گڑیا"' "بہاروں کے بیچ"' "نئی عورت" وغیرہ۔ یہ کہانیاں مجھے خود بھی پسند ہیں۔ شاید اس لیے کہ ان کہانیوں کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے پیچھے بے شمار کہانیوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ جنہیں میں کبھی نہ کبھی ضرور لکھوں گی۔ ان کہانیوں کا محور اندھرا کی سرخ مٹی اور نیلے پتھروں والی خوبصورت دھرتی ہے۔ اسی فضا نے مجھے قلم کی اہمیت سمجھائی اور لکھنے کے لیے موضوع دیئے۔

"موم کی مریم"' "تلچھٹ"' "ایک انار"' "آگ اور پھول"' اور "دیوداسی" وغیرہ وہ کہانیاں ہیں جو شاید سب سے زیادہ پسند کی گئیں۔ خصوصاً" "موم کی مریم" پر تو کئی نقادوں

نے میری اگلی پچھلی خطائیں معاف کردیں۔ یہ کہانیاں کئی کئی بار مختلف انتخابی سلسلوں میں منتخب ہو چکی ہیں۔

بہرحال یہ میری ساڑھے پانچ برسوں کی محنت ہے۔ اس میں میرے خون دل کی کشید شامل نہیں ہے' نہ برسوں کی کڑی ریاضت' البتہ یہ ریاض کرنے کی ابتداء ضرور ہے۔ یہاں میں نے "کچھ" کرنے کی راہ میں ڈھونڈنا شروع کی ہے۔

اس طرح ان کہانیوں میں مختلف تجربے بھی ہیں اور مختلف فضائیں بھی' لیکن ان میں پھر بھی میرا نقطہ نظر واضح ہے۔ میں نے کبھی پہلے سے زبان اور فضا کو سنوارنے کا اہتمام نہیں کیا۔ الفاظ خود ہی کہانی کے خط و خال اجاگر کردیتے ہیں اس لیے میں الفاظ کے برتنے میں کسی احتیاط سے کام لینے کی بجائے انہیں خود ہی اپنی جگہ تلاش کرنے کا موقعہ دیتی ہوں۔ الفاظ مجھے رنگین پھڑپھڑاتی ہوئی تتلیاں سی لگتے ہیں' زبردستی مٹھی میں بند کرنے سے ان کا دم نکل جاتا ہے۔ دراصل کہانیاں تو لکھی لکھائی خود ہی ہمارے سراغ میں نکلتی ہی - صرف الفاظ کا جامہ پہنانا ہمارا کام ہے۔ تاکہ وہ اس طرح چھپ جائیں کہ سب کو نظر آسکیں۔

اپنے پیچھے روایتوں کے جھلملاتے چراغوں کی ایک لمبی کڑی مجھے دکھائی دیتی ہے' جس نے مجھے لکھنا سکھایا۔ اپنے دیس کی ان ساری خوبصورت اور ناقابل یقین روایتوں پر مجھے یقین بھی ہے اور فخر بھی۔ جہاں سانپوں کو دودھ پلایا جاتا ہے' جہاں ہر قدم پر مندر ہے اور ہر محلے میں درگاہیں' جہاں لوگ گائے کو ماں کہتے ہیں اور دیپک راگ سے آگ لگا دیتے ہیں۔ اگر میں زیادہ غور سے دیکھوں تو میری افسانہ نگاری پر ان آریاؤں کی چھاپ بھی ہے جو نگر نگر علم و تہذیب کے چراغ جلاتے پھرے۔ ایران و عجم کی ثقافت بھی میرے خون کا جزو ہے' جو میرے آباؤ اجداد اپنے ساتھ لائے تھے۔

اپنے پیچھے جانے پہچانے چہروں کا ہجوم ہے۔ ارجن اور کرشن' کالی داس' غالب' میرا' اقبال' ٹیگور اور فیض یہ الگ الگ رنگوں کے پھول ایک جگہ کھلے ہیں اور ان سب رنگوں کی چھوٹ میرے ذہن پر پڑ رہی ہے۔ میں نے ان سب کو پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ کتابیں بھی اور چہرے بھی اپنے آس پاس کی فضائیں بھی اور وہ تحریریں بھی جو لکھی نہیں جاتیں۔

جانے کس بڑے نقاد نے کہا ہے کہ لکھنے والا اس وقت بولتا ہے جب وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ میں نے بھی کہانیں اس لیے لکھی ہیں کہ میں چپ نہیں رہ سکتی تھی۔ ابتداء

میں مجھے صرف لکیریں کھینچنے کا شوق تھا۔ ہر چیز پر، دیواروں پر، زمین پر، کپڑوں پر اور کاغذ پر۔ یہ لکیریں میرے لیے سر زمین تھیں، جن کے اندر دنیا بھر کی رنگینیوں کی سیر کی جاتی ہے۔ ان لکیروں کے اندر میں نے بڑے بڑے سمندروں کی طاقت، ناقابل حصول پھولوں کی خوبصورتی، اڑتی ہوئی تتلیاں اور تحیر زا کہانیوں کو سمیٹ رکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تارے، چاند، مینہ کی بوندیں اور آنگن میں پھڑکنے والی چڑیاں، سب میری سنتی تھیں اور اپنی کہتی تھیں۔

مگر لوگ ایسے اندھے بنتے کہ انہیں کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ الٹے بہلا پھسلا کے پنسل چھین لیتے، اپنے پیروں سے ان لکیروں کو روند ڈالتے تھے۔ اس طرح انہوں نے نہ جانے کتنی چڑیوں کو، پھولوں کو اور تتلیوں کے پروں کو روند ڈالا اور میں ان لکیروں کے مزار اپنے دل میں اونچے کرتی رہی۔

پھر کچھ شعور آیا تو میں نے ان لکیروں میں رنگ بھرنا شروع کیا۔ رنگوں کی دوستی بڑی خوبصورت نکلی۔ رنگ انسان کا مطلب جلد سمجھ جاتے ہیں۔ بلکہ بعض منہ پھٹ رنگ تو ڈانٹنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ان ڈانٹوں سے میں بھی کھسیا گئی۔ کیونکہ بات کچھ بنتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اکتا کر میں نے پھر لکیریں کھینچنا شروع کیں (یا کہانیاں لکھنے لگی)۔ نہ جانے لوگ اب بھی میری بات سمجھ سکے یا نہیں--- میں تو مطمئن نہیں ہوں۔

ایک بات پھپھی نے مجھے ایک کہانی سنائی تھی:---

"رام چندر جی نے سیتا کے آس پاس تین لکیریں کھینچ دیں کہ اس کے باہر پاؤں نہ دھرنا اور شکار کو چلے گئے۔ مگر سیتا جی کی قسمت میں تو دکھ اٹھانا لکھے تھے۔ اس لیے راون کے بہکانے پر انہوں نے ان لکیروں کو روند ڈالا اور راون انہیں لنکا لے گیا---"

شاید پھپھی نے یہ کہانی پوری نہ سنائی تھی یا پھر سیتا جی پر اتنی بپتا مجھ سے نہ دیکھی گئی۔ دوسرے دن جب میں اپنے قارئین کرام کے حلقے میں گھری بیٹھی تھی تو سیتا نے ان لکیروں کو ہرگز نہ روندا۔ انہوں نے راون کی چلتربازیوں پر اسے خوب خوب لتاڑا۔ رام چندر جی لوٹے تو انہوں نے راون کی آنکھوں میں مرچیں بھر دیں۔ اسے درخت پر الٹا لٹکا دیا اور ایک زور دار دھول رسید کر کے بھگا دیا۔

پھپھی نے یہ کہانی سنی تو دھک سے رہ گئیں۔ وہ اس کہانی میں ذرا سا لفظی تصرف بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھیں۔ لیکن میں بھی بیٹھے بٹھائے سیتا جی پر اتنی بڑی آفت لانے کو

تیار نہ ہوئی۔ اس دن سے کہانی سنانے والوں کی میرے ساتھ باقاعدہ ٹھنی رہتی۔

لیکن میں ان کہانیوں کے خوفناک اور شہ زور جنوں کو اتنی چھوٹ دینا نہیں چاہتی تھی۔ جب جی چاہتا انہیں ایسی مضحکہ خیز سزائیں دیتی کہ سب بچے اچھل اچھل کر تالیاں پیٹتے اور ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا تھا۔

یہ وہی لکیریں کھینچنے کا بدلا ہوا جذبہ تھا۔ اس دن سے سیتا کے ارد گرد سلامتی کے حصار باندھنا میرا مشغلہ ہو گیا۔ اسی کو میری کہانیوں کی بنیاد کہہ لیجئے گا۔

کہانیں صرف کاغذ پر ہی نہیں لکھی جاتیں۔ شاعری کے لیے بندھی ٹکی بحروں اور عروض کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تو اودے شنکر کے رقص، ہیرا بائی کے خیال اور چغتائی کی تصویروں میں بھی کہانیاں لکھی نظر آتی ہیں۔ صرف غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یوں واضح اور کھری بات کہنا نامہ نگاروں کا کام ہے فن کاروں کا نہیں۔ آرٹ تو جتنا گہرا اور خوبصورت ہو اتنا ہی بلند ہے۔ زندگی دائروں اور قوسوں میں گھری ہوئی نہیں ہے۔ لیکن زندگی کے کسی ایک لمحہ کو الفاظ میں یا رنگوں میں یا آوازوں میں قید کرنے کے لیے ان بکھرے ہوئے عناصر میں شعور ترتیب ضروری ہے۔ یہ فنی مناسب (Relevance) پیدا کرنے پر ہی کسی فن کار کی بڑائی کا انحصار ہے۔ان متناسب خطوط کو میں افسانہ نگاری کہتی ہوں، کسی کا جی چاہے شاعری کہہ لے یا مصوری--- بات ایک ہی ہے۔

فن کو خوابوں کی تجارت کہنا بڑی نپی تلی بات ہے۔ ہزاروں برس پہلے الف لیلہ کی کہانیوں میں جس سیمرغ کے انڈے، جادوئی چراغ اور اڑن کھٹولوں کے خواب فن کاروں نے دیکھے تھے، آج ان کی تعبیریں پوری ہو رہی ہیں۔ ان طلسمی خزانوں کی انتالیس چابیاں ڈھونڈ لی گئی ہیں۔ اب چالیسویں چابی کی تلاش کا فرض نئے فن کاروں پر عائد ہوتا ہے۔

ایک مشترک دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس آدرش کی ذمہ داری فن کار کی اپنی ذات پر ہے۔ اس کے پیچھے عظیم روایتوں کے چراغ جل رہے ہیں اور آگے امیدوں کی ٹھنڈی چھاؤں بھی ملے گی۔ اس کے باوجود اسے گھپ اندھیرے میں کانٹوں پر چلنا پڑتا ہے۔ یہ کڑی مشقت ہی اسے دوسروں سے ممیز کرتی ہے۔ حاتم طائی کی طرح اسے خود ہی سارے ناممکن سوالوں کے جواب ڈھونڈنا ہیں۔ اس راستے میں اپنی ذات پر جتنا بھروسہ ہو اتنی ہی راہ آسان ہوتی ہے۔ "لائٹ آف ایشیا" کے سدھارت کی طرح جو اپنے آدرش کے سفر پر روانہ ہوتے وقت کہتا ہے۔

"Since there is hope for man only in man, And none
hath sought for this as I will seek, Who cast away
my world to save my world"

(Arnold)

میں نے بھی یہ کہانیاں نہیں لکھیں، تین لکیریں کھینچی ہیں۔ تاکہ دنیا کی سب سیتائیں امن اور حفاظت کے حصار میں محفوظ رہیں اور ساری دنیا کے راونوں کی آنکھوں میں مرچیں بھر کے انہیں الٹا لٹکا دیا جائے۔

یہی میری کہانیوں کا آدرش ہے---

جیلانی بانو

○

نئی عورت

ہمیشہ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر شہاب اندر والا دروازہ یوں بند کر دیتا تھا جیسے وہاں اڑنے کو بے قرار چڑیاں بند کر رکھی ہوں۔ حالانکہ وہ جانتا تھا اب کسی چڑیا کے پر و بال سلامت نہ تھے' پھر بھی احتیاط لازمی تھی۔

جب اپنے نئے مؤکل پر رعب گانٹھنے کے لیے وہ دنیا کے ہر مسئلہ میں ٹانگ اڑانے لگتا تو' ایران کے بحران' امریکی پالیسی اور روس کی مصلحت اندیشی کو' نگما کی گالیاں بریک کی طرح روک دیتی تھیں۔ پھر سگریٹ کا دھواں دروازے کی جانب وہ یوں پھینکتا جیسے نگما کا حلق تھکانے کے لیے منتر پڑھ رہا ہو۔ اس کے اضطراب کو دیکھ کر موکل اپنے مطلب پر آ جاتا تھا۔ لیکن اس بار بھی اس کے باپ کی حرامی اولاد اور سوتیلی ماں کی آوارگیاں' نگما کی فحش گالیوں میں شرما کے رہ جاتیں۔ دل شکستہ ہو کر شہاب صوفے کی پشت سے جا لگتا۔ سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں یوں مسل ڈالتا جیسے نگما کی گردن رگڑ رہا ہو۔ مقدمے کے سارے داؤ پیچ دماغ سے نکل بھاگتے۔

صرف نگما کی گالیاں ہی سنتا ہوتیں تو وہ اپنی جان حزیں پر سہہ لیتا' مگر ان ہنگاموں کے فوراً بعد دروازہ ٹوٹ گرنے کے انداز میں کھلتا اور وہ اپنے سیاہ فام چہرے اور سفید دانتوں سمیت طلوع ہوتی۔

"چھوٹے صاحب۔ آپ نے کہیں جمال بی بی کی کتاب دیکھی ہے۔۔۔؟"

اور شہاب رو دینے کے انداز میں اپنے موکل کو دیکھتا۔ جی چاہتا ابھی نگما کو باغ والے کنوئیں میں دھکیل آئے اور ہر چودھویں رات کو اس کے رونے چیخنے کا تماشا دیکھے۔ اس لمحے میں نگما کو مارنے کے بے شمار طریقے اس کے سامنے آنے اور ہر بار کوئی قانونی دفعہ ابھر کے اس کا ہاتھ روک لیتی۔ گالیوں کا بے پناہ ہجوم حلق میں جمع ہو جاتا۔ اس کے سرخ چہرے کا کرب دیکھ کر مؤکل جلدی سے کسی اخبار کی دیوار اپنے سامنے کھڑی کر لیتا تھا۔

"وہ مجھ سے کتاب کا پتہ پوچھ رہی ہے۔۔۔؟ مجھ سے۔۔۔؟"

وہ گرج کر پوچھتا اور اس کی آواز کے پیچھے بہت سی آوازیں دبی رہتیں۔۔۔ مجھ سے۔۔۔ جو نواب نصرت جنگ کا پوتا ہے۔ جو بیرسٹرایٹ لا ہے۔ جو شادی شدہ ہونے کے

باوجود اپنے آپ کو کنوارا سمجھتا ہے۔ ابھی تک اپنے خوابوں میں ایک تعلیم یافتہ بیوی
ڈھونڈتا ہے۔ جسے پکا یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ راز ضرور کھلے گا کہ وہ اس فضول
گھرانے میں پیدا نہیں ہوا' کتے کی طرح کسی یورپین لیڈی نے اسے بھی تحفے میں ابا کو دیا
تھا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اتنا روشن دماغ انسان اس دقیانوسی' کمر جھکی' بغیر پلستر
کی ڈیوڑھی میں پیدا ہوا ہو۔ اس گھر میں ایک چیز بھی تو ایسی نہ تھی جو شہاب کو پسند ہو'
جس سے وہ نفرت کیے بغیر نبھا سکے۔ اپنے نام سے لے کر ثریا تک اس کے لیے ناقابل
برداشت بن چکی تھی--- ثریا' جسے وہ امیدواروں کے ہجوم سے یوں جیت لایا تھا جیسے نشے
میں چور جواریوں کو جل دے کر ان کی دولت سمیٹ لایا ہو' لیکن صرف دو سال بعد ہی یہ
دولت اپنا ملمع اتار کے کھوٹے سکوں میں بدل گئی۔ پھر لکیر کی فقیر بنی ہوئی لٹھیا والی ممانی
تھیں' جن کی موجودگی میں انسان اپنے من مانے طریقے پر کھا بھی نہ سکتا تھا۔ اور
نکما--- کتنا ارمان تھا اسے نکما کو جوتے مارنے کا۔ مگر اسے پیٹو تو یوں لگتا جیسے صرف
نکما کے خیال کو مار رہے تھے۔ وہ خود تو ساری کا پلو منہ میں ٹھونسے ہنسے جاتی تھی۔ "ہر
وقت کی ہائے ہائے نے گھر میں رکھا ہی کیا ہے --- لٹھیا والی ممانی اپنا خطبۂ صدارت
شروع کرتیں۔

"پہلے ہی ڈیوڑھی اجاڑ ہو گئی۔ یہ چپ نام کی دو ایک لونڈیاں چھوکرے رہ گئے ہیں
تو وہ خود ہی روز بھاگتے ہیں' روز پکڑوانے جاتے ہیں۔ کل کو نواب بڑا ہو گا تو اس گھر میں
نکما اور بی جانی کی بیٹیاں بھی نہ ہوں گی۔"

بڑے گھرانوں میں لڑکوں کے پیدا ہوتے ہی ان کے نام پر لونڈیاں پالی جاتی تھیں۔
لیکن اب یہ روایت سنبھالنا لٹھیا والی ممانی کے اختیار سے باہر گیا تھا۔

اس گھر کی روایتوں کو سینے سے لگائے جیئے جانے کا انھیں بڑا ارمان تھا' مگر روایتیں
تھیں کہ آندھی میں رکھے ہوئے کاغذ کی طرح اڑی چلی جا رہی تھیں۔

اللہ کی قدرت ہے۔ یہ نصرت جنگ کی ڈیوڑھی تھی' جہاں کے شاہانہ ٹھاٹ دیکھ کر
صرف خاص کر نواب بھی رشک کرتے تھے۔ نصرت جنگ کو فخر تھا کہ یہ عزت انھوں نے
ورثے میں پانے کی بجائے اپنی محنت سے 'اپنی چالاکی' سے کمائی تھی۔ لیکن تین پشتوں کے
بعد ہی ڈیوڑھی بس اس قابل تھی کہ اس کے زنگ آلودہ گیٹ پر' شہاب الدین بیرسٹرایٹ
لا' کی گرد آلود تختی لٹکی رہے اور اندر موہن جو داڑو کی طرح بڑے بڑے اسرار پوشیدہ تھے

جنھیں صرف تحقیق کرنے والی نگاہیں پرکھ سکتی تھیں۔ کہ پہلے یہاں ایک شاداب باغ ہو گا۔ ان مٹی کے ڈھیروں تلے ریشمی گھاس کے قطعے بچھے ہوں گے۔ آم' شمشاد' ہارسنگار اور سیتا پھلوں کے نیچے تما اور بی جانی کی نانیوں پرنانیوں نے باغ ارم سجایا ہو گا۔

اب لمبی لمبی گھاس کی جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے کنوئیں کے پاس بڑا خوفناک سناٹا چھایا رہتا تھا۔ ہار سنگار کا پیڑ اپنی لمبی شاخوں کو جھکا کے یوں کوئیں پر پھول برساتا تھا جیسے کسی قبر پر گل پوشی کر رہا ہو۔ دن بھر خزاں رسیدہ پتے باغ کے صحن میں بگولے بن کر اڑتے پھرتے تھے۔ جنگلی چڑیاں مل کر شور مچاتیں اور رات کو چمگادڑیں ایک دوسرے سے ٹکرا کے چیختیں تو ثریا ریڈیو بند کر کے یوں سہم جاتی تھی جیسے صور اسرافیل سننے والی ہو۔

لٹھیا والی ممانی دوسرے کمرے میں بلند آواز سے کوئی آیت پڑھنا شروع کر دیتیں۔

بڑی بھابی کسی آپا کی چولی ستے میں ہاتھ روک کر پوچھتیں:۔

"آج چاند کی کون سی تاریخ ہے دلہن---؟

مگر ثریا جواب دینے کی بجائے شرما کے منہ پھیر لیتی--- "توبہ ___ بڑی بھابی کے ایک بچہ نہ ہوا' مگر دوسری عورتوں کا چہرہ دیکھ کر ہی پہچان لیتی ہیں---"

"آج پورے چاند کی رات ہو گی---؟" وہ تھوک نگل کے خود ہی گھبرائے ہوئے لہجے میں اپنے سوال کا جواب دیتیں' سینے پرونے کا سامان سمیٹ کر خود ہی اپنی بے ہوشی کی تیاری کرنے لگتی تھیں۔

"پورے چاند کی رات---" ثریا کے دل میں کوئی ایک پتھر اچھال دیتا اور لہریں دور دور تک دائرے بنانے لگتیں۔

ہاں آج پورے چاند کی رات ہو گی' جب ہی آج شہاب گھر آنے کی بجائے مون لائٹ کا لطف اٹھانے اپنے دوستوں کے ساتھ بوٹ کلب گیا ہے۔ اب تھوڑی دیر کے بعد شہاب کا کتا زور زور سے رونے لگے گا۔ تیز ہواؤں میں درختوں کے پتے یوں شور مچائیں گے جیسے بہت سی عورتیں سسکیاں لے رہی ہوں۔ پھر کوئی زخمی چمگادڑ تڑپ کر چیخ اٹھے گی۔

اس کے بعد کیا ہوتا---؟ اس کے بعد لٹھیا والی ممانی باغ کی طرف کھلنے والی سب کھڑکیاں بند کر دیتی ہیں۔

"دلہنوں بیٹیوں کو ایسی باتیں نہیں سننا چاہئیں---" اس وقت لٹھیا والی ممانی کے

چہرے سے مکاری اور سرد مہری کا اندھیرا غائب ہو جاتا ہے۔ ایک ہاتھ سے لاٹھی تھامے' ایک ہاتھ میں تسبیح لیے وہ صرف ایک عورت بن جاتی ہیں۔ ایک بوڑھی' کمر جھکی عورت۔ جو مہربانی اور تقدس کی انتہا دکھائی دیتی ہے۔

اس وقت نہ سنایا تو کیا ہوا--- وہ بیسیوں بار اپنی بہو بیٹیوں کو یہ قصہ سنا چکی تھیں کہ نصرت نواب نے نافرمانی کرنے پر نگما کی پرنانی کو اس کنوئیں میں دھکیل دیا تھا۔

وہ بھی ایسی ہی پورن ماشی کی رات تھی' جب باغ کی بہار شباب پر تھی اور نگما کی پرنانی اپنے شباب کی انتہا پر۔ نصرت نواب ابا حضرت کے پاس مردانے میں بیٹھے طوائفوں کا گانا سن رہے تھے۔ مگر ان زرق برق طوائفوں پر سے پھسلتی ہوئی نصرت نواب کی نگاہ پوشا پر گئی۔ یہ بھی پوشا کے نصیب تھے کہ ہر وقت پوشا کو قابل التفات سمجھا۔ مگر یہیں' پیڑ کے نیچے' پہلے تو اس نے چیخنا چاہا' پھر نصرت نواب کے منہ پر ایک بھرپور تھپڑ مارا--- یہاں پر لٹھیا والی ممانی اپنی آواز بالکل دبا لیتی تھیں۔

وہ تو خیر ہوئی یہ بات زیادہ نہ پھیلی--- ورنہ شہر میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ ایک لے پالک دھیڑنی کی اتنی ہمت کہ--- دیکھ لو مرنے کے بعد بھی چڑیل کو چین نصیب نہ ہوا۔ ہر پورے چاند کی رات کو یوں ہی روتی چلاتی باغ میں نکلتی ہے--- اس کی کہانی سن کر سب ہی سہم جاتے تھے سوائے نگما کے۔ اس کی طبیعت میں تو نسلی چھچھورا پن بھرا تھا۔ ہر بات کو مذاق میں ٹال جاتی۔ "آج ہماری نانی ماں آ رہی ہیں---" وہ شام ہی سے سب کو ہنس ہنس کر اطلاع دیتی پھرتی۔

"اٹھارہ برس کی سانڈ ہو گئی مگر بچپنا نہ گیا---" لٹھیا والی ممانی بیزار ہو جاتیں۔ نگما کے لیے زندگی بھی ایک مذاق تھی۔ بالکل فضول اور بیہودہ مذاق۔ جب دیکھو اپنے بے حد سفید دانت نکوسے کھی کھی ہنسے جا رہی ہے۔ یا پھر آوارہ لونڈوں سے سیکھے ہوئے تھے گیت اور فلمی گانے گائے جاتی۔ گھر کے تمام اہم کام لٹھیا والی ممانی نے اس کے سپرد کر رکھے تھے' مگر نگما نے کسی کام کو بخیرانجام تک پہنچا کر اپنا ریکارڈ خراب نہیں کیا تھا۔ جب بھی لٹھیا والی ممانی کی پن کٹی اس سے کھو جاتی یا شہاب کے جوتوں پر پالش کرنا یاد نہ رہتا تو پہلے سے ہی بڑی بھابی کے کمرے میں پردے کے پیچھے کھڑی ہو جاتی تھی۔ شہاب کی ڈانٹوں پر ہنسی کے مارے اس کا دم نکل جاتا تھا۔ اسے درختوں پر چڑھ کر چڑیوں کے گھونسلے توڑنے اور بچوں کے ساتھ کھیلنے سے اتنی فرصت یہ نہ ملتی تھی کہ کوئی کام کر سکے۔ پھر

دوسرے نوکروں کے ساتھ باقاعدہ مورچہ قائم کر کے دنوں لڑنا اور بڑی بھابی کی دل جوئی کرنا بھی اس کے پسندیدہ مشاغل تھے۔

ایک بی جانی بھی تو تھی۔ صبح ہی اٹھ کر بڑی بھابی اور ماما کا ہاتھ بٹانے چولہے کے پاس پہنچ جاتی۔ وہاں سے انھی تو زبردستی دوستی کی فضاء پیدا کرتے ہوتے شہاب کے سارے کام بھی اسی کے ذمے تھے' اور اگر ثریا موجود نہ ہوتی تو تھوڑا بہت ہنسی مذاق بھی ہو جاتا۔ وہاں سے ہٹی تو لٹھیا والی ممانی کی پٹی سے لگی ان کی نصیحتیں سن رہی ہے' ان کے لیے پن کٹی میں پان کوٹ رہی ہے' ان کی دوائیں کھرل میں کوٹ رہی ہے۔

اس باوجود نکما سارا دن مصروف دکھائی دیتی تھی اور بی جانی لٹھیا والی ممانی کی نگاہ بچا کے سنگار پٹار میں جٹی رہتی۔

صبح پرندوں کے جاگنے سے پہلے اس گھر میں نکما طلوع ہوتی۔ جھاڑو تھامے' ساڑی کمر سے لپیٹے کوئی اوندھا سیدھا فلمی گیت گاتی وہ سب کے کمروں میں صبح کی نوید سنانے آجاتی ہے۔ سب سے پہلے اس کی لڑائی ہوا کے تیز جھونکوں سے ہوتی' جو صاف جگہ پر خاک دھول کو پھر ہاتھ پکڑ کے کھینچ لاتے تھے۔ پھر جمال اور نواب کے جوتوں اور کھلونوں کو ایسی ضد تھی کہ الماریوں میں سے اتر کے محض نکما کو ستانے کی خاطر راستے میں پڑے رہتے۔

"ایک جگہ کیوں نہیں بیٹھتے جی تم لوگاں--- چلو تم سب میز کے نیچے مرو۔ یہ ماٹھی ملا جوتا' جب دیکھے جب گم ہو جاتا---"

شہاب کی مسہری کے نیچے گھس کے' اس کے کان میں منہ اڑا کے' وہ صحن میں سوتے ہوئے دوستو کو پکارتی:۔

"او ماٹھی ملے دوستو۔ اب ہے یا آکر پانی ڈالوں۔ آگے مجت میں اذاناں ہو رہی نا رے---؟"

نکما کی گالیوں' کوسوں سے مجوب سا ہو کر اجالا ڈیوڑھی میں جھانکتا تو سب سے پہلے چولہے کے پاس دھوئیں میں چھپا ہوا' بڑی بھابی کا ہیولی دکھائی دیتا تھا۔ یوں جیسے گیلی لکڑیوں کے ساتھ وہ خود بھی سلگ رہی ہوں۔ فجر کے وقت لٹھیا والی ممانی کے لیے بادام کا حریرہ بنانا ان کا وہ اہم کام تھا جسے بخیر و خوبی انجام دینے پر ہی وہ پورا دن روئے بغیر کاٹ سکتی تھیں۔ جب دھوئیں کو دونوں ہاتھوں سے دھکیلنے میں وہ ہار جاتیں تو ان کی گھٹی ہوئی

آواز سارے گھر میں گونج اٹھتی:--

"اوئی میرا دم گھٹ رہا ہے۔ ارے کوئی جلدی مجھے سنبھالو۔ ہائے سب مر گئے کیا---!"

سب مرنے والے اس آواز کو سن کر جاگ پڑتے، مگر نگما کے علاوہ کوئی ان کے بے سہارا جسم کو تھامنے نہ پہنچتا۔

"اپنا دل سنبھالو جی بڑی بیگم صاحب، میں آ رہی ہوں---" اور جھاڑو پھینک کر وہ چولھے کی طرف دوڑی۔

جب بھی شہاب اور ثریا میں لڑائی ہوتی تھی، محلے میں کوئی مرجاتا، لنھیا والی ممانی اپنا کارنامہ سناتیں یا پورن ماشی کی رات آجاتی تو صبح اٹھ کر وہ چولھے کے پاس بیٹھی کوئلے سے لکیریں کھینچے جاتیں۔پھر کوئی ان کی چیخ نہ سنتا تو وہیں گر کے بیہوش ہو جاتی تھیں۔ پھر انہیں پنکھا جھلتے ہوئے نگما سوچتی: بھابی میں کتنی آگ بھری ہوئی ہے، جو پندرہ سال گزرنے پر بھی سلگے جاتی ہیں---!

سرد مزاج، صلح جو، اور نرم دل بھابی گھر کے سارے کام کرتیں۔ نوکر تک ان پر حکم چلا لیتے تھے۔ کوئی ذرا سختی سے بات کرتا تو وہ معافی مانگ لیتیں۔ سب ہی ان سے کام لیتے مگر کوئی ان کی آواز نہ سنتا تھا۔ دن بھر کے لیے آنے والے مہمان تو انہیں گونگی سمجھ کے ترس کھاتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ تیس پینتیس برس کی عمر میں وہ ہر رنگینی کو پیچھے چھوڑ چکی تھیں۔ ان کے چاندنی میں نہاتے ہوئے خوبصورت جسم پر مرگھٹ کا سناٹا چھا چکا تھا۔

جب ثریا شہاب سے لڑتی، یا لنھیا والی ممانی ان کی نحوست پر طعنے دینے لگتیں تو ثریا کے دل میں بھی بڑی بھابی کے لیے ہمدردی جاگتی تھی۔

اس گھر میں جس کی آنکھ سے آنسو بہتے وہ نیچے گرنے کی بجائے بھابی کی آنکھوں میں چلے جاتے۔ جو آہ اٹھتی وہ ان کے دل پر پھیل جاتی۔ پھر وہ اختلاج کی شدت سے کٹی ہوئی مرغی کی طرح تڑپنے لگتیں تو ثریا ان کے ملائم ہاتھ تھام لیتی تھی۔

ان مضبوط ہاتھوں کو تھام کر کتنا سکون ہے۔ لیکن طاہر نے اس مسرت کو ٹھکرا دیا۔ لنھیا والی ممانی ہزار بار بھابی کے کرتوت سب کو سنا چکی تھیں۔

جب بیاہ ہوا تو بھابی کے لبوں سے ایک لمحہ کو بھی ہنسی دور نہ ہوتی تھی۔ جو زیادہ ہنستا ہے وہ روتا بھی ہے۔ انسان کو موت یاد نہیں رہتی--- آخر وہی ہوا۔

ان کے قہقہے باہر ڈیوڑھی تک جاتے تو طاہر بھنایا ہوا اندر آتا:۔

"تمھاری ہنسی میری ناک کٹوائے بغیر نہ تھمے گی۔ لوگ کیا کہیں گے کہ ذرا دیر کو ان کے ہاں جاؤ تو اندر سے عورتیں ہنسا کرتی ہیں۔ یعنی بے شرمی کی حد ہو گئی۔"

بھابی سہم جاتیں۔ ذرا دیر لٹھیا والی ممانی کی نصیحتوں کو گھونگھٹ میں لپیٹے، آنگن میں قدم رکھتیں کہ سونے کی پائلیں بھی نہ بجیں، مگر ذرا سی دیر بعد ساری بندشوں کو ہنسی کا ریلا بہا لے جاتا۔

لیکن طاہر ان لوگوں میں سے تھا جو یورپ جا کر بھی یوں لوٹ آتے ہیں جیسے گنگا نہا آئے۔ شہاب کی طرح یورپ کی آبوہوا میں بھی اس نے اپنے تہذیب و تمدن کو نہ بھلایا تھا۔ اسے بے دین بننا بالکل پسند نہ تھا۔ ڈاکٹری کے امتحان دینے جرمنی تک ہو آیا، مگر کبھی کوٹ پتلون کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ ہمیشہ تنگ موری کا پائجامہ اور اورنگ آبادی ہمرو کی شیروانیاں پہنیں، جن کے بٹن کالر تک بند رہتے تھے۔ کبھی ننگے سر باہر ڈیوڑھی تک نہ گیا۔ اسے اپنے خاندان کی عزت کا بڑا خیال رہتا تھا اور اپنے اجداد کی روایتیں دھرانا اس کے لیے حدیث تھا۔ جبھی تو اس نے مسز جوزف لیزا سے شادی کر کے مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کی سعادت حاصل کرنا چاہی تھی، لیکن لٹھیا والی ممانی کے اسرار پر ایک اور شادی کے لیے بھی تیار ہو گیا تھا، کیونکہ اس ڈیوڑھی کے ہر مرد پر لازم تھا کہ ایک بار ضرور باقاعدہ دولھا بنے۔ زر بفت کی شیروانی اور جڑاؤ دستار بہنے، پیروں کو چھوتا ہوا سہرا باندھ کے دھوم دھڑکے سے جائے اور شہر کے پانچ ہزار معززین کو گواہ بنا کے دس لاکھ مہر کے عوض ایک چینی کی گڑیا خرید لائے۔۔۔ آگے اس کے اختیاروں کی فہرست شروع ہو جاتی تھی۔ وہ ڈیوڑھی اور بچوں کا انتظام بیوی کے سپرد کر کے پھر اپنے رنگین شبستانوں کی جانب لوٹ جاتا تھا۔

رفتہ رفتہ بھابی کی ہنسی میں ٹھہراؤ آ گیا، مگر طاہر کا شک بڑھتا گیا۔۔۔ اس گھر میں آج تک کوئی بیوی اپنے دکھوں کو ٹال کر نہیں ہنس سکی تھی۔

انھوں نے بھابی کا آنا جانا بند کر دیا، کیونکہ ان کی ماں نے اکلوتی بیٹی کی قسمت پر ابھی سے رونا شروع کر دیا تھا۔ طاہر نے ہدایت کر دی کہ اگر ابھی انھوں نے اپنی ماں کی صورت دیکھی تو طاہر کی جانب سے اسی وقت طلاق ہو جائے گی۔

تین سال تک بھابی اپنی ماں کی صورت سے موت کی طرح خوف کھاتی رہیں اور

لٹھیا والی ممانی کا انتظار کرب میں بدل گیا۔ لیکن بھابی کے ہاتھ بہت مضبوط تھے' ان کی سادگی دیکھ کر ظلم کرنے والا دل بھی کانپ جاتا تھا۔ پھر طاہر تو ڈاکٹر تھا۔ نبض پر ہاتھ رکھ کر دل کو جانچنے والا۔ تین سال تک وہ اس گرفت کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا اور ایک دن بازی جیت گیا۔ لٹھیا والی ممانی نے حلف اٹھا کے کہہ دیا کہ بھابی چھت پر کھڑی اپنی ماں سے باتیں کر رہی تھیں۔

اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھ کر بھابی سوچتیں۔۔۔ کتنا کمزور ہوتا ہے یہ بندھن' جو ایک سنی سنائی بات کی ضرب سے ٹوٹ گیا۔ اسے جوڑنے کا خواب بھابی بچپن سے دیکھتی آئی تھیں۔ پندرہ برس تک اپنے من میں ننھے ننھے دیے جلاتی رہیں اور پنجرے میں بند چڑیا کی طرح اس دن کا انتظار کرتی رہیں جب وہ کھڑے دوپٹے اور تنگ پائجامے کو چھوڑ کر لس لس کرتی ساڑیاں پہنے' ہونٹوں پر لاکھا جمائے' ہنس ہنس کر محفل میں بیٹھا کریں گی۔

اپنی بیٹی کے خوابوں کو سجانے کے لیے ان کی ماں نے اپنی ہر خواہش کو قربان کر دیا تھا۔ ایک ایک پیسہ جمع کر کے بیس ہزار کے جہیز نے انھیں بیاہیوں کی صف میں لا بٹھایا تھا۔

پھر طاہر کا تبادلہ پٹنہ ہو گیا اور وہ اپنے ساتھ مسز جوزف لیزا کو مسز طاہر بنا کے لے جانے لگا تو لٹھیا والی ممانی نے مجبور کیا تھا کہ بیس روپے مہینہ بھابی کو ملتے رہیں۔
اس پر بھی وہ ہر وقت منہ لپیٹے پڑی رہیں تو یہ خدا کی ناشکری ہے۔ اس میں لٹھیا والی ممانی کا کیا قصور۔۔۔!

جس دن ثریا کو اپنی بے بسی کا خیال آتا تو وہ کہنیوں پر ٹھوڑی ٹکائے بھابی کے متعلق سوچتی اور نگما کو ثریا پر ترس آتا تھا۔ صحن کے نل پر کپڑے دھوتے میں وہ سوچتی کہ چھوٹی دلہن بیگم کا تو خود ہی پلو بھیگا ہوا ہے' وہ کیا کسی کے آنسو پونچھیں گی۔
"اوئی ماں مٹھی پڑو۔ یہ مردوں کی صورت کو انگھار لگنے دو۔ کوئی میری طرح عورت رہنا تھا تو بتاتی۔۔۔"

یوں نگما کی بکواس پر کوئی دھیان نہ دیتا تھا' لیکن ثریا کے گڑھے میں پانی مرتا تھا اس لیے وہ بپھر جاتی۔ اللہ کی شان تھی کہ اس گھر میں یہ کم ذات چھوکریاں بھی بیگموں پر ہنس لیتی ہیں۔ لیکن نگمی اپنی دانست میں ہمدردی جتائے جاتی۔
"شبو میاں تو جب گھر میں آتی کوئی جھگڑا ٹنٹا نکالتے۔ آپ کیوں چپ بیٹھتے جی چھوٹی

دلہن۔ آپ بھی ہماری جیسی لونڈی چھوکری ہیں کیا---!"

"چل مردار---" لٹھیا والی ممانی اپنی لاٹھی سے مارنے دوڑتیں۔

"مرد نہ ہوا پیر کی جوتی ہو گیا۔ رانڈ کی دیکھا دیکھی چولھا بھونکی گھر کی سب بہواں بیٹیاں بھی ویسی ہو جاوئیں۔ تو جواب دے کر دیکھ لینا۔ تھوک کر گیا نا سندریا تیری صورت پر۔"

"جاؤ بہت دیکھے ہیں اس کے جیسے۔" نِما حقارت سے بولی۔

"میں بتا دی نا اس کو تماشا۔ وہ کون ہے میرے انگ کو ہاتھ لگانے والا۔ مجھے بٹھا کے کھلاتا کیا جو اس کی دھونس سہوں گی---؟"

"بے غیرت ہے وہ اجاڑ صورت بھی---" لٹھیا والی ممانی جل کر کہتیں۔

"جبھی تو بڑے لوگاں بولے کہ عورت کمانے لگے تو مرد اپنی عزت کھو دیتے ہیں۔"

"مگر میں کمائی کر کے اس کے جوتے نئیں مارتی نا---!" بولتے بولتے نِما یوں سہم کر چپ ہو گئی جیسے اس کی جوتی نادانستہ ثریا کے منہ پر جا لگی ہو۔

ایک دفعہ ثریا نے اپنی کسی کالج کی دوست مسز ریڈی کو 'امن' کے لیے پانچ روپے چندہ دیا تھا۔ شام کو رسید شباب نے دیکھی تو یوں لگا جیسے اس ڈیوڑھی کے اجڑنے کا سبب ابھی معلوم ہوا ہے۔

"روز نئی نئی راہیں نکلتی ہیں خرچ کرنے کی۔ کیا ساڑیوں اور میک اپ کی فضول خرچیوں سے کچھ رقم بچ گئی تھی---! تمھاری سزا یہ ہے کہ اکٹھا خرچ دیا ہی نہ جائے۔"

اس وقت نِما بھی آیا کے ساتھ جمال بی بی سے کھیل رہی تھی۔ یوں بھی یہ دمڑی کے نوکر اس قابل نہیں ہوتے کہ انسان اپنے گھر میں بات کرتے وقت بھی ادھر ادھر دیکھ لے۔ اور شباب بچارا بھی کیا کرتا۔ جتنا وہ اپنے خاندان کی روایتوں سے بچنا چاہتا تھا اتنا ہی یہ اس کے پیچھے سایے کی طرح دوڑتی پھرتیں۔

حسب دستور ڈیوڑھی آج بھی پتھر گٹی کے ایک مارواڑی کے پاس رہن تھی اور دو چار مقدموں سے اتنا بھی نہ ملتا کہ مہینہ بھر کا خرچ کسی سیٹھ کے آگے ہاتھ پھیلائے بغیر پورا ہو جائے۔ رہی سہی جائیداد تو اپنے شاہی زوال کا اتنا صدمہ تھا کہ انھوں نے حیدر آباد نہ دیکھنے کی قسم کھالی تھی---! پھر اس نِما جیسی چھوکری کی کیا حقیقت تھی---! اس کی پرنانی یہاں پیدا ہوئی۔ نانی نے یہاں جنم لیا۔ ماں کی ارتھی یہیں سے اٹھی۔ یہ تو اس کی

نسل کا پہلا واقعہ تھا کہ طاہر نما کی جوانی سے پہلے ہی جا چکا تھا اور شہاب بیوی کی جہالت سے مجبور ہو کر تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ اسے نما کی ناقابل برداشت بدصورتی اور بدتمیزی سے ہمیشہ نفرت رہی۔ اس کے مقابلے میں بھیگی بلی کی طرح مٹھی میں سمٹ جانے والی بی جانی ہزار درجہ بہتر تھی۔ اس لیے شہاب کی نظروں سے گر کے وہ سندریا ڈرائیور کی باقاعدہ بیوی کہلانے لگی تھی' حلانکہ اس سے بھی نما کی کبھی نہ بنی۔ وہ گھر میں تو بچوں سے جوتے کھاتے وقت بھی سر دھکا دیتی تھی مگر سندریا کی ذرا سی ڈانٹ برداشت کرنا بھی اسے برا لگتا تھا۔ ایک دن سندریا سیندھی پی کر آیا تو محض تفریحاً" اس نے نما کو مارنا چاہا' مگر نما نے لکڑی چھین کر الٹا اسے اتنا مارا کہ وہ بوریا بستر لے کر چلا گیا۔ نما نے پھر کبھی اسے بلانے پر اصرار نہ کیا' نہ پھر اس کے ساتھ رہنے پر راضی ہوئی۔ جب کبھی ننھیا والی ممانی اس کے جی پر تنہائی کا سانپ لہرانا چاہتیں' اس کے نصیبوں پر افسوس کرتیں تو وہ بڑے سکون سے جواب دیتی:۔

"کیا مجھے پالتا تھا وہ ننگا منھی ملا۔ میرے کو نکو اس کی کمی (کمائی)۔۔ "

اس طرح بے نکیل پھرنے کے باوجود کسی نے اس کی جانب دھیان نہ دیا۔ کبھی ڈیوڑھی کے چپراسی ہنسی مذاق کر لیتے یا وہ دوستو سے خاطر مدارات میں لگی رہتی تھی۔ اس کی برائیوں کو سب برداشت کرتے تھے۔ حالانکہ رائے عامہ لی جاتی تو بڑی بھابی کے علاوہ سب ہی اسے نکال دینے کا ووٹ دیتے۔ شہاب اس کی چیخ پکار اور گالیوں سے بیزار تھا۔ ننھیا والی ممانی اس کی زبان درازی پر اٹھتے بیٹھتے لعنت بھیجا کرتیں اور ثریا کے لیے تو وہ سب سے بڑا خار تھی۔ نما کی سدا بہار ہنسی اور بے فکری دیکھ کر ثریا کے دل میں شعلے بھڑکنے لگتے تھے۔ ایک مرد اسے سزا دے کر بھی گھاٹے میں رہا۔ کتنی بار جب اپنی زندگی سے نما کی آزادی کو ملا کے دیکھا تو اس کا جی چاہا سب چھوڑ چھاڑ کر میکے چلی جائے' مگر یہ تو دنیا کی سب ہی جاہل عورتیں کرتی آئی ہیں۔ اسے ایک تعلیم یافتہ عورت بننے کا شوق تھا' مگر وہاں پہنچ کر تو وہی اماں کی نصیحتیں اور ابا کا جھوٹ موٹ کا دلار۔

"شاباش میری بیٹی بڑی اچھی ہے۔ اچھی بیٹیاں اپنے گھر سے نہیں بھاگ آتی ہیں۔ پھر تم نے تو شادی اپنی مرضی سے کی تھی۔"

پچیس برس ہو گئے ابا کو ایک ہی ٹیون میں شاباشی دیتے۔ نہ جانے کتنے کڑوے کسیلے حکم وہ اپنی شاباشی کے بل پر ثریا کے حلق میں انڈیل دیا کرتے تھے' اور یہ تو حقیقت تھی

کہ وہ اپنی دوسری بہنوں کی طرح شباب کے پلے نہیں بندھی تھی بلکہ ایک سال تک ٹھونک بجا کے شباب کو چنا تھا۔ یوں اگر ابا اپنی پٹھانی ہٹ پر اتر آتے تو شباب کی ساری خوشامد دھری رہ جاتی' لیکن ابا کا تو ہمیشہ یہ قاعدہ رہا کہ اس کام سے منع کرتے جو ثریا کے لیے بہتر ہوتا اور اس وقت ڈھیل چھوڑ دیتے جب ثریا گرنے لگتی۔۔۔ کاش ایک بار وہ ابا کا کہنا مان لیتی اور اس اینٹوں کی بھٹی والے سیٹھ کو قبول کر لیتی' بلا سے ایک بار اینٹوں میں دفن ہو جانا پڑتا مگر یہ ہروقت کے چرکے تو نہ لگتے۔

ہائے کتنی کوشش کی اس نے ایک تعلیم یافتہ نئی عورت بننے کی' لیکن جاہل عورتوں والی ساری باتیں قدم قدم پر اس کے استقبال کو لپکتیں۔ شادی کے پانچویں سال ہی گھر کے بجٹ کے ساتھ ساتھ ان کی محبت کا بجٹ بھی بگڑنے لگا تھا۔

شباب کو اپنی حماقت پر افسوس ہوتا' جب وہ ایک تعلیم یافتہ بیوی کی آرزو میں ثریا کی سند پر پھسل پڑا تھا۔ ثریا نے یہ ڈگری یوں حاصل کی تھی جیسے کسی سہیلی کو جلانے کے لیے ایک بنارسی ساڑی خرید لی ہو۔ جسے دیکھو وہ یہی کہتا کہ لڑکیوں کو پڑھاؤ' ورنہ کوئی ٹکے سیر نہ پوچھے گا۔ پھر روز صبح تڑکے ایک ایک شکرم میں پچیس پچیس لڑکیاں آموں کی طرح اوپر نیچے لد کر چیختی چلاتی اسکول جانے لگیں۔

بعض اوقات تو ثریا کو اس حماقت پر ہنسی آتی۔ یہ کیا کہ اچھی اچھی قمیضیں سینے اور بالوں کے نئے اسٹائل ڈھونڈنے کی بجائے الجبرا کے سوالوں میں بیٹھے الجھ رہے ہیں' لیکن سردار آپا کو دیکھ کر ہمت بندھتی تھی۔ وہ کالج جاتیں تو سارے رشتے ناتوں کے بھائی انھیں پڑھانے کے لیے اپنی خدمت پیش کرتے۔ پھر اماں سے روز نئی نئی ساڑیوں کی فرمائش کرو۔ کالج کا بہانہ کر کے جہاں جی چاہے گھومو پھرو۔ اوپر سے ہر وقت کی دھونس الگ۔

"بھئی یہ گریجویٹ ہونا کوئی ہنسی مذاق ہے نہیں۔ بڑے بڑے مرد ہمت ہار جاتے ہیں۔"

وہ کالج سے نکلی تو کچھ بھی یاد نہ رہا۔ شیکسپیئر بہت بڑا ڈرامہ نگار تھا جس نے رومیو جولیٹ' لکھا۔ اور یہ غالب کیسے اجاڑ شعر بولتا تھا۔۔۔! ذرا سمجھ میں نہیں آتے۔ پھر یہ اکنومکس کی تھیوریاں۔ اللہ توبہ۔ کچھ ہو مگر بی۔اے کی ڈگری کافی امیدواروں کو کھینچ لائی تھی' لیکن شباب کے گھر آ کے تو وہ ضرورت سے زیادہ آ جانے والی چیز کی طرح ناقابل التفات بن گئی۔ جہیز اور جوڑ کی ہڈی سے آنسو تو پونچھ لیے لیکن ننھیا والی ممانی کو ثریا کی سند

بالکل پسند نہ آئی۔ پڑھے لکھے میاں کا کیا رعب جمے گا جب بیوی اس کی ہر الٹی سیدھی بات کا جواب دے سکے۔ گھر میں تو وہی بیوی کہلاتی ہے جو بیوی سے زیادہ ماما دکھائی دے۔ یہ سرخی پاؤڈر تھوپے ہوئے بیوی تو صرف الماری میں سجا کر دیکھنے کے لیے ہوتی ہے۔

لنھیا والی ممانی ان لوگوان میں سے تھیں جو ایک بار دنیا میں آکر ابھی واپس جانے کا اردہ نہیں رکھتے۔ زندگی کا ابدی پرمٹ حاصل کر لیتے ہیں۔ جوانی میں انھوں نے اپنی ساس اور شوہر کی داشتاؤں سے اتنے دکھ اٹھائے تھے کہ اب انتقام کی آگ میں جل کر وہ عورت سے ناگن بن گئی تھیں۔ اس گھر کی بہت سی بھاوجوں' دیورانیوں اور بہوؤں کو قبر تک پہنچا کر وہ مایا کا سانپ بنی بیٹھی تھیں۔ جس وقت شہاب اور ثریا کا موڈ ٹھیک دیکھتیں تو شہاب کی پچھلی منگیتر کی خوبصورتی اور سگھڑاپے کے قصے لے بیٹھتیں۔ ہر وقت ڈاکٹروں' حکیموں میں گھری وہ اس عزم سے جیا کرتی تھیں جیسے ابھی بہت سی نئی دلہنوں کو تپ دق میں مبتلا کریں گی۔ کنبے' رشتے کے دس پانچ مردوں کو دوسری شادی پر اکسائیں گی اور بے شمار بچوں کو اپنی ڈاکٹری کی بھینٹ چڑھائیں گی۔

بہوؤں میں بیٹھ کر وہ ہمیشہ یوں بات شروع کرتیں کہ اس ڈیوڑھی پر کسی کا سایہ ہے جو یہاں ہر بہو تپ دق سے مری۔ اس خاندان کی دلہنوں نے ہمیشہ یہاں کے طور طریقے کا خیال رکھا۔ پھر وہ اپنے اسلاف کے کارنامے سناتیں۔ زوال کے واقعات' خاندانی عداوتوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں جو بعض اوقات اتنی بڑھ جاتیں کہ بڑے بڑے کنبے تباہ ہو جاتے تھے۔ ان رنڈیوں کے قصے سنتیں جنھیں شہاب کے باپ دادا غیر فانی شہرت عطا کر گئے تھے۔ نوابوں کے قہر و غضب کے حیرتناک کارنامے اور ان کی بیویوں کے صبر کی مثالیں' جو ہمیشہ سے یہاں اپنی جان کے نذرانے پیش کرتی آئی ہیں۔ وہ نیک نصیب بیبیاں جنھیں ہمیشہ اپنے شوہروں کے ہاتھوں سے کفن ملا اور ان کی دین دنیا سرخرو ہو گئی۔

جتنی دیر لنھیا والی ممانی قریب بیٹھی رہتیں ثریا کو اپنی لاش آنگن میں رکھی نظر آتی تھی۔ ہر طرف سے کفن پہنے روتی چلاتی عورتیں اسے بلانے لگتیں۔ اس کی گھبراہٹ بھانپ کر بڑی بھابی کے ہاتھ اسے تھام لیتے۔

"ڈرو مت دلہن' تم پڑھی لکھی ہو اس گھر کے چلن بدل ڈالو۔"

مگر وہ پڑھی لکھی عورت ابھی کہاں پیدا ہوئی تھی---!

ثریا کو آج بھی اپنے ہاتھوں میں غیر مرئی بیڑیاں نظر آتی تھیں۔ آج بھی اس کے

چاروں طرف حصار کھنچا ہوا تھا۔ نہ جانے کون سی کمی رہ گئی تھی کہ وہ نئی ترقی یافتہ عورت نہ بن سکی۔ نڈھال ہو کر وہ شباب کی گود میں یوں گر پڑتی جیسے پھانسی کی سزا پا چکی ہو۔

شروع میں شباب اس کے خوف پر ہنستا رہا' لیکن اب وہ شباب کی ہنسی پر خوف کھانے لگی تھی۔ اس کی ہنسی میں صاف قصائیوں والی بے رحمی جھلکتی۔ شباب کی ذرا سی ناراضگی پر وہ اچھل پڑتی تھی۔ خوف زدہ نظروں سے دیکھتی کہ کہیں وہ میز پر سے چھری تو نہیں اٹھا رہا ہے۔ لٹھیا والی ممانی سے وہ سرگوشی میں کیا کہہ رہا ہے---!

ادھر ہر سال ایک بچے کی پیدائش نے بڑی بوریت پھیلا رکھی تھی۔ پھر ہر وقت کی ہائے واویلا الگ--- شباب کو راضی رکھنے کی خاطر اس نے زندگی بھر خرچ کرنے والے ناز نخرے ایک دم الٹ دیے کہ شباب گھبرا گیا۔

"ہر وقت میک اپ میں ہی مصروف رہتی ہو۔"

"کبھی ہمارے سامنے اپنی تعلیم کا بھی تو کوئی ثبوت پیش کرو۔"

جب شباب اسے اپنے افلاطون دوستوں میں لے کر جاتا تو ثریا کو کہنے کے لیے کوئی بات ہی نہ ملتی تھی۔ لو بھلا یہاں تو روز اخبار دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ملتی' پھر وہ ادب اور سیاسیات پر کیا بحث کرے---! اور یہ پالیٹکس بکواس ہی تو ہے۔ کہیں جنگ ہو رہی ہے تو ہوا کرے اور نہ ہو تو کیا ہرج ہے۔

جب دوسری عورتیں وہاں بیٹھ کر آئزن ہاور کی وہ دلی تمنا بتاتیں جس کا حال ان کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم ہے--- ناظم حکمت' پبلو نرودا اور پکاسو پر بحث کرتیں تو شباب انہیں حسرت بھری نظروں سے دیکھتا تھا۔

"کل سے جمال اسکول نہیں جائے گی۔"

"کیوں---؟" وہ حیران ہو جاتی۔

"بس یوں ہی۔ ماں نے پڑھ لکھ کر کون سا فیض پہنچایا ہے جو بیٹی کو پڑھایا جائے۔"

پھر گھنٹہ بھر کی بک بک' جھک جھک کے بعد شباب پیر پٹکتا باہر چلا جاتا تو اسے سردار آپا کی بات سچ ہوتی نظر آتی۔ یہی کہ محبت کی شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں۔ پھر نگما اس کے قریب فرش پر جا کر بیٹھ جاتی۔

"اوئی میرے کو تو تعجب نکلتا آپ کو دیکھے تو۔ یہ پڑھ لکھ کر کیا اچھا ہوا جب انگریجی میں لڑائیاں لڑنا پڑیں---؟"

"چل مردار---" ثریا مار کے اسے دھکیل دیتی۔

"ہم بھی تمھارے کمینوؤں کی طرح ہر وقت لڑنے لگے۔"

"ہاؤ ماں' اپن تو لڑے بغیر نئیں مانتے---" وہ اپنی کمینگی پر اترا کے کہتی۔

پھر ثریا ایک بار اور عہد کرتی کہ اس گھر میں لڑائی کبھی نہیں ہو گی۔

یہ دس روپے کمانے والی نوکری اتنا گھمنڈ کر سکتی ہے تو آخر اس میں کون سی کمی ہے۔ لیکن جس وقت شباب تاؤ دلانے والی بکواس شروع کرتا تو نہ جانے کون سی طاقت اسے جواب دینے پر مجبور کر دیتی تھی۔

اور نگما دوستو سے اترا کے کہتی:۔

"میں بنگلوں میں رہنے والی بیگم صائب نئیں ہوں جو سب کی دھونس سہوں گی۔"

اس کی بات سن کر ثریا کے ساتھ لتھیا والی ممانی کے بھی کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ لیکن شباب گھر میں گھستے وقت کوئی نہ کوئی بات ضرور لے کر آتا تھا۔

خلوص اور ایثار کے تحفوں سے زندگی کا پنڈارہ اب خالی ہوتا جا رہا تھا۔ روشن خیالی کے لبادے اوپر سے سرکتے جا رہے تھے۔ جب وہ دونوں بالکل روزمرہ والی زبان میں لڑتے تو تعلیم اور روشن خیالی سہم کر کمرے سے باہر نکل جاتی اور شباب کے جانے کے بعد ناک پر انگلی رکھے نگما آ جاتی۔

"کیا ہے جی یہ ہر وقت کی کھٹ پٹ۔ کب تک آپ اس کے آنسو پونچھتا جی میں---؟"

"اللہ میاں وہ دن نکو لاؤ جب تو شریف زادیوں کے آنسو پونچھے"

لتھیا والی ممانی لاٹھی ٹیکتی چیختی چلاتی آ جاتیں۔

"جبھی تو کہتے ہیں کہ کمینوں کو منہ نکو لگاؤ۔ دنیا میں سب مرد عورتوں کو بول بک کر اپنا جی خوش کرتے ہیں' مگر ایسی ہائے واویلا مچانے والی دلہنیں کہیں نہیں دیکھیں۔ اس اجاڑ صورت دھیڑنی کا کیا ہے۔ مرد چھوڑ کر چلا گیا' اب باؤلے کتے کی طرح پھرتی ہے۔ میں بیزار ہو گئی جی یہ رانڈ سے۔ اس کی صورت کو انگھار لگو۔ کبھی اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا تو معلوم ہو گا۔"

پھر بہت جلدی اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا۔

آج بھی پورن ماشی کی رات تھی' مگر سیاہ بادلوں نے اماوس کا اندھیرا پھیلا دیا تھا۔ چگادڑوں کی چیخوں پر بجلی کی کڑک چھا رہی تھی۔ آج بارش کی شدت نے شباب کو بھی کمرے میں بند کر دیا تھا۔ مجبوراً" وقت کاٹنے کے لیے وہ ثریا سے لڑتا رہا۔ پھر سگریٹ اور چائے پی پی کر قانونی کتابیں پڑھنے لگا۔

نیچے قالین پر بیٹھی ہوئی بڑی بھابی ثریا سے سوئیٹر کا کوئی نمونہ سیکھ رہی تھیں۔ بار بار وہ گھبرا کے سوئی ہوئی جمال کو دیکھ لیتیں۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں بھی آج ثریا کا دل کانپ رہا تھا۔ جی چاہتا وہ جمال سے لپٹ کے سو جاتے۔ ادھر بڑی بھابی یہ نیا نمونہ سیکھنے پر تلی ہوئی تھیں۔ ہر پورن ماشی کی رات کو وہ کسی نہ کسی بہانے ثریا کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھیں۔

"آج تو پوری دنیا بہتی نظر آ رہی ہے۔ توبہ! ایسی بجلی پہلے کبھی چمکی تھی---!" ثریا نے خاموشی سے اکتا کر کہا۔

"کتنی ہی بجلیاں گریں' لیکن ہمارا یہ کمرہ پھر بھی سلامت رہے گا۔" شباب نے کتاب سے نگاہ ہٹا کے کسی کو مخاطب کیے بغیر ہی کہا۔

لیکن اس بلا کی سردی میں بھی شباب کی اس بات نے ثریا کے دل میں آگ لگا دی۔

"تم گھبراؤ جی۔ اللہ نے چاہا تو اس گھر پہ بھی بجلی گرے گی۔" وہ رونے لگی۔

"ہمارے ایسے نصیب کہاں---" شباب کے لہجے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ آج لڑ لڑ کے مر جانا چاہتا ہے۔

"آج پورے چاند کی رات ہے دلہن--- اب چھوڑو یہ لڑائی جھگڑے---"

بڑی بھابی کی آواز میں آنے والی بے ہوشی کا اعلان صاف جھلک رہا تھا۔

"ہونے دو بھابی---" وہ سوئیٹر پھینک کر کھڑی ہو گئی۔

"آج کی رات مجھے بھی ایک فیصلہ کرنا ہے۔" جمال کے بستر پر گر کے وہ سسکیاں لینے لگی۔

"سچ---؟" شباب نے سگریٹ سلگانے میں پوچھا۔

"تو جاؤ۔ بھئی وہ پوشا تمہیں باغ میں ڈھونڈتی پھر رہی ہے---"

آگے اس کی بات شور میں دب گئی۔ باغ کی طرف سے ایک عورت اور مرد کی

چیخیں بلند ہونے لگیں۔

ثریا نے سر اٹھا کے غور سے سنا اور چیخ مار کے شہاب کی طرف لپکی۔

بھابی اپنی جگہ ساکت ہو چکی تھیں اور باہر کا شور اب واضح آوازوں میں بدل گیا تھا۔

بڑا آیا میرے کو پالنے والا۔ کس کو اکڑ دکھا رہا ہے۔ ذرا ہاتھ لگا کے دیکھ کنوئیں میں پھینک دوں گی تجھے---" جواب میں سندریا کی گھگھیاہٹ سمجھ میں ہی نہ آئی۔ ایک ہاتھ سے ثریا کو تھامے شہاب کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ ہار سنگار کے پیڑ سے لگا ہوا سندریا کھڑا تھا اور برانڈے کے ستون کو پکڑے نکما کہہ رہی تھی:۔

"یہ صائب لوگوں کی طرح میرے کو نکو ڈرا۔ محنت مجوری کر کے کھائی تو پھر تجھ سے کیوں ڈروں؟---"

"تیری قسم نگی اب کبھی نئیں ماروں گا۔"

پہلے تو نکما ہنستی رہی پھر سیڑھیاں اتر کے کنوئیں کی منڈیر پر جا بیٹھی۔

"دیکھ آج پوشا نانی یہ جھاڑ کے نیچے ہیں۔ اپن دونوں ہرے جھاڑ کے نیچے کھڑے ہو کر قسم کھائیں گے۔ تو میرے کو نئیں مارنا۔ میں تیرے کو گالی نئیں دیتی۔ تو کمائی کر کے لایا تو میرے اوپر دھونس نئیں جمانا۔ میں نوکری کری تو تجھے لاڈاں (ناز نخرے) نئیں دکھائیوں۔"

"ہاؤ' ہاؤ--- دس گز کی پگڑی سمیت سندریا نے یوں سر ہلا کے اقرار کیا جیسے ماں کے ہاتھ میں لکڑی دیکھ کر بچے بغیر سوچے سمجھے توبہ کرنے لگتے ہیں۔

تین مہینے تک بکا پھرنے کے بعد سندریا نے محسوس کیا تھا نکما صرف بیوی ہی نہیں رفیق زندگی تھی۔

جب وہ دونوں ساتھ مٹی اٹھانے کو جھکے تو شہاب کے گال پر پھر پوشا کا ایک بھرپور تھپڑ پڑا۔ اس نے ثریا کا ہاتھ پکڑ کے پوچھا:۔

"اس شرائط نامے پر ہم بھی دستخط کر دیں---؟

ثریا کی آنکھیں مسرت سے پھیل گئیں--- ارے یہ کتنا آسان راستہ تھا۔ جسے سردار آپا جسے فلاسفر بھی نہ سمجھ سکیں۔

وہ ابھی بھی ہجوم میں گم تھی جب بڑی بھابی کی چیخوں نے اسے جگا دیا۔

"اوئی میرا دل بند ہو رہا ہے--- کیا سب سو گئے۔ کوئی مجھے پکڑو۔"

"اپنا دل تھامو جی بڑی بیگم۔ میں آرہاہوں---"

پھر کھڑکی سے باہر نگما کا چہرہ نظر آیا اور ثریا اپنی ساری کاہلی کو جھٹک کر اٹھ بیٹھی۔

دن نکل آیا تھا---

اچھی خاصی دوسراہٹ ہوگئی تھی۔ شام کو' جب ارشد خیریت پوچھنے کے بہانے آنگن کی سیڑھیوں پر آبیٹھتی۔ ایسے وقت کئی بار اس نے آنسو روک کر اپنے جی کا حال فاختاؤں کو سنایا تھا۔

کہتے ہیں اگلے وقتوں میں تو یہ چڑیاں انسانوں کے لیے بڑے بڑے کام کر گزرتی ہیں۔ سکھ کے موتی کا سراغ' سونے کے پہاڑوں کا راستہ اور گم شدہ شہزادی کا پتہ بھولے بھٹکے شہزادوں کو ان چڑیوں نے ہی تو بتایا تھا۔ میمونہ کو یوں لگتا جیسے ایک فاختہ پانی پیتے پیتے گردن اٹھا کر اپنے میاں سے پوچھ رہی ہے:۔

"کیا اس بیچاری کا دکھ دور کرنے کے لیے ہم کچھ نہیں کرسکتے---؟" اور اس کا میاں اپنے پر سنوارتے میں رک کر جواب دیتا--- "کر تو سکتے ہیں' مگر یہ وعدہ کرے کہ اس کا بچہ کبھی فاختہ کے بچوں کو نہ ستائے گا۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔" وہ دل کی گہرائیوں سے اقرار کرتی تھی۔ اسے مارنے کے لیے آس پاس چھڑی ڈھونڈنے لگتی۔ حالانکہ اس نے ارشد سے لڑ جھگڑ کے بہت پہلے یہ مسئلہ طے کروا لیا تھا کہ وہ اپنے بچے کو کبھی نہ ماریں گے۔ اپنے بچے کو بہت بڑا آدمی بنائیں گے اور اتنے بڑے آدمی کی یادداشت میں کسی سزا کا نشان نہ ہونا چاہیے۔

دوسرے دن وہ دوڑی ہوئی میری کی ڈسپنسری میں پہنچی' مگر ہر بار میری اسے ٹھونک بجا کر کھوٹا ثابت کر رہی تھی۔ شام کی لے اب درت پر آرہی تھی۔

سڑک پر شور بڑھنے لگا۔ کمل اب وائلن رکھ کر آئس فروٹ والے کو بلا رہا تھا۔ اتنی سردی میں آئس فروٹ نہ جانے مسز گھنیشام کیسی لاپروا ماں ہیں---؟ بندریا نے ایک بار پھر گھبرا کے چاروں طرف وہ گھر ڈھونڈا جو کہیں نہیں تھا اور جس کی اتنی سخت سردی میں بڑی ضرورت تھی۔ سب بندر دن بھر کے تھکے ہارے نیم کی شاخوں میں لٹکے مزے میں جھول رہے تھے' لیکن ایک ماں کے مسائل تو الگ ہوتے ہیں۔ ماں کے ساتھ تو ایک پیڑ کی چھاؤں اور ایک پالنے کا تصور ضروری ہے۔

ایک بار ڈاکٹر میری نے کسی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "بعض عورتیں ماں بننے کی مستحق نہیں ہوتیں۔ ان کے بچے دنیا کی اس خوبصورتی کو اجاڑ دیتے ہیں جو دوسری ماؤں کے بچوں نے بڑی محنت سے بنائی ہے۔"

اس دن میمونہ نے اپنے دل کو بڑی ڈھارس دی تھی۔ شاید اس کی کوکھ سے بھی

کوئی ایسا ہی شیطان جنم لینا والا تھا جو خدا نے میری کی دعا سن لی۔ حالانکہ وہ تو کبھی ایسی جاہل ماں نہ بنتی۔ اے لو! اتنی پڑھی لکھی اور سگھڑ ہو کر کیا وہ ایک بچے کو نہ پال سکے گی!

اور پھر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ متلی سے پریشان ہو کر نسخہ لکھوانے گئی تو میری نے اسے جھک کر بڑے غور سے دیکھا۔ یوں جیسے اس کے آر پار دیکھ رہی ہو۔ اور وہ میمونہ کا ہاتھ پکڑ کے اندر لے گئی--- اس دن سے اس کے گھر کی ہیئت بدل گئی۔ نیا فرنیچر' نئے کھلونے اور جانے کیا کیا الا بلا وہ اکٹھی کر رہی تھ۔ جیسے اس کا بچہ نہیں عیب جو ساس اس کا سگھڑاپا دیکھنے آ رہی ہے۔ سنگار میز پر رکھا ہوا پلاسٹک کا ببوا گردن ہلا ہلا کے تائید کرتا تھا کہ فضا واقعی بدل گئی ہے' مگر میمونہ کو پھر بھی یقین نہ آتا تھا۔

جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہو۔ وہی خواب جو شادی کے بعد سات برس سے وہ دیکھے جا رہی تھی۔ آنکھ کھلتی تو پہلو میں سوتا ہوا ننھا سا بچہ ارشد بن جاتا۔ اتنا کٹھور--- بے حس۔

میمونہ کا جی چاہتا اسے دھکے دے کر پلنگ سے نیچے پھینک دے۔ اس نے کبھی میمونہ سے ہمدردی نہ کی۔ اسے بچوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ البتہ جب میمونہ بچوں کی باتیں کرتے کرتے بسورنے لگتی تو وہ سگریٹ کا دھواں چھت کی طرف اگل کر فکرمند سا ہو جاتا تھا۔ کوئی دلچسپ بات اسے یاد آجاتی۔ اس اطمینان کے ساتھ جو بچوں کو اسکول بھیجنے کے بعد ماں باپ کو ملتا ہے' وہ میمونہ کو اہم خبریں سنانا شروع کر دیتا:۔

"ہاں تو سنا میمونہ--- دت بچارا گرفتار ہو گیا۔ سنا ہے اسے کسی نامعلوم اذیت گاہ میں بھیجا جائے گا۔"

"اونہہ---" میمونہ جان بوجھ کر افسوس کا اظہار نہ کرتی۔ حالانکہ ارشد کا صرف وہی واحد دوست تھا جو اسے بھی "بچارا" لگتا تھا۔ دت کی مقبولیت اور شاعری کو تو وہ کبھی نہ مانتی تھی' مگر کنوارے مرد شادی شدہ عورتوں کو یتیم بچوں کی طرح قابل رحم معلوم ہوتے ہیں۔ پھر دت نے تو اپنے لیے جانے کہاں کہاں سے مصیبتیں اکٹھی کر لی تھیں۔ صحت دیکھو تو ناک پکڑے دم نکلے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے شہر میں کون سا وبائی مرض پھیلا ہے اس کے دوست دت کی بیماری کا نام پوچھ لیتے۔ کبھی کھانے کو پیسے نہیں' کبھی سگریٹ کے لیے بیٹھا ہے' اس پر جلے پاؤں کی بلی بنا جانے کہاں کہاں سے گھومے جاتا تھا۔ تھک جاتا تو کچھ دنوں کے لیے جیل میں آرام کرنے کے لیے چلا جاتا تھا۔

کئی بار میمونہ کا جی چاہا کہ اس کا مزاج پوچھنے کے بہانے دت کو ایک خط لکھے۔ اسے بھی تو معلوم ہو کہ اس کی کاہل منحس بھابی صرف ریڈیو سیلون کے پروگرام سن سن کر ہی زندگی نہیں گزار رہی ہے' بلکہ اس نے اب دنیا کو خوبصورت بنانے کا ارادہ کرلیا ہے۔

جس دن میمونہ نے چڑیوں کو یہ خوش خبری سنائی تو انہوں نے مل کر مبارک بادی گائی تھی۔ فاختاؤں نے اپنا وعدہ یاد دلایا اور کوؤں نے بھی درخواست کی کہ ان کے ساتھ یہ 'اینٹی کوا' قسم کا برتاؤ نرم کر دیا جائے۔ وہ سب کو معاف کر چکی تھی۔ کرتی بھی کیا! اسے کچھ سوچنے سمجھنے کے حواس بھی ہوتے!

معلوم ہوتا تھا کہ آنے والا شریر بچہ پیٹ کی بجائے دماغ میں لوہار کی دکان کھولے بیٹھا تھا۔ سر میں اس بلا کے دھمو کے ہوتے تھے کہ وہ چارپائی سے نہ اٹھ سکتی۔ دوائیں پی پی کر دماغ کی خشکی اسے بچے کے عجیب عجیب روپ دکھاتی تھی۔ اس کے خوابوں سے پریشان ہو کر ارشد میری' کے ہاں دوڑا جاتا اور میری کو امن کے پروپیگنڈے کے موقع گویا اللہ میاں چھپر پھاڑ کے عطا کر دیتے۔

"امن اپیل پر دستخط کر دو مسزارشد۔ اس کے بعد تمہارا بچہ کسی خوفناک روپ میں ظاہر نہ ہو گا۔ اس کے مستقبل کی دستاویز مکمل ہو جائے گی۔"

مگر میمونہ حسب عادت اڑی رہتی۔ اسے ان فضول ڈھکوسلوں سے نفرت تھی جس کے لئے میری اور ارشد مرے جاتے تھے۔ خصوصا" جب سے ارشد بھی میری کے ساتھ گھومنے لگا تھا تو میمونہ کا جی چاہتا تھا ابھی تیسری جنگ شروع کر دے۔ دیکھیں یہ کاغذ کے پلندے کیسے ساری دنیا پر چھپر بن کر چھا جائیں گے---؟

جی بہلانے کے لیے ارشد نے اسے بہت سی کتابیں لا دی تھیں۔ ان کتابوں کو پڑھ کر کبھی اس کا جی ہوتا اپنے بیٹے کو شاعر بنائے' کبھی اسے مصور بنا دیتی۔ ذرا دیر میں دیکھو تو اسے گور کی بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ کتابوں کے ورقوں سے نکل کر سب ہی مصنفوں نے اسے مشورے دیے تھے۔

وہ سہم جاتی۔ اپنے نازک سے جسم میں وہ کتنی عظیم الشان طاقت چھپائے ہوئے تھی۔ اب دنیا کو دائیں سے بائیں گھمانے کی چابی اس کے ہاتھ آگئی تھی۔ یہ بڑی عجیب مسرت بخش تکلیف تھی۔ ایک میٹھا میٹھا سا درد جو چوبیں گھنٹے اسے گھیرے رہتا تھا۔ دنیا میں اور بھی تو عورتیں ہیں۔ سڑک پر نکلو تو ننگ دھڑنگ کالے کلوٹے بچوں کی پلٹنیں نظر

آئیں۔ کیا ان کی ماؤں کو کبھی گورکی مخاطب نہیں کرتا!

بجیا بھی تو ہیں۔ ہر سال بڑے اطمینان سے یوں ایک بچے کا اضافہ کرلیتی ہیں جیسے مرغی انڈا دیتی ہے۔ ان کے اکٹھے سات بچے تھے۔ دن بھر لڑتے جھگڑتے رہتے۔ پھر وہ اٹھتیں اور سب کو کوٹ پیٹ کر رکھ دیتیں۔

سر کا درد اب کم ہو رہا تھا۔ رات کا راگ اب عروج پر تھا۔ مسز گھنیشام کے ہاں کمل کی ہنسی کا بلب فیوز ہو چکا تھا۔ اس کی بیوہ بھو زور شور سے لڑ رہی تھی۔ غالباً" کل پہلی تاریخ ہے---! میمونہ نے اندازہ لگایا۔ مسز گھنیشام کی بھو ان تاریخوں میں بڑی تیاری کے ساتھ مقابلے پر آتی تھی۔ کمل کبھی ماں کی خوشامد کرتا' کبھی بھابھی کو مناتا اور آخر میں کھڑکی میں سے میمونہ بلائی جاتی:۔

"جلدی امن کی مہم تیز کیجئے دیدی۔ ورنہ یہ لڑائی میرے موڈ پر بمباری شروع کردے گی۔"

عورتوں کے جھگڑے تو عورتوں ہی سے نبٹتے ہیں' مگر کمل سمجھتا تھا میمونہ نے یہ فن بڑی ریاضت کے بعد سیکھا ہے۔

"اس بار امن کانفرنس میں آپ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجوں گا۔" وہ بڑی سنجیدگی سے کہتا تھا۔

میمونہ کو کمل بہت پسند تھا۔ مسز گھنیشام کے گھر سے محلے میں سب ہی بچ کر رہتے تھے۔ کبھی ادھار دی ہوئی چیز ان کے ہاں سے واپس نہ آئی۔ کسی کی خوشی دیکھ کر وہ لوگ خوش نہ ہوئے۔ صرف ایک کو دوسرے کی سنا کر اپنا الو سیدھا کرنے کی وجہ سے وہ یہاں ٹکے ہوئے تھے' ورنہ وقت بے وقت ہاتھ پھیلانے والوں کو تو آئے دن مکان بدلنا پڑتا ہے۔ میمونہ بھی کبھی ادھر کی کھڑکی نہ کھولتی تھی۔ مگر ان کی بیوہ بھو کے آنسو اور کمل کے قہقہے اسے کھینچ کر ان کے گھر لے جاتے تھے۔

نیند کی جھپکی سے چونک کر ایک بار پھر اس نے میری اور مسز گھنیشام کی ہدایتیں یاد کیں۔

"بچوں کو پالنا تو بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔" مسز گھنیشام کہتی تھیں۔ "اپنے آپ کو بھول جانا پڑتا ہے۔ مگر پھر بھی جانے کیسی بھول ہوجاتی ہے کہ ہمارا پھول آگ میں گر جاتا ہے۔"

میمونہ جانتی تھی یہ بھول خود مسز گھنیشام نے کی ہے۔ اس کا بڑا لڑکا لڑائی میں مارا گیا تھا اور اس کی چوبیس برس کی بہو کے ہاتھ میں بیس روپے مہینے کی لاٹھی تھی۔ ان روپوں کے لیے مہینے کے شروع میں دونوں ساس بہو ایک دوسرے کو گھول کے پی ڈالنا چاہتی تھیں۔ اکٹھے بیس روپے کی وہ مالک بن جاتی تو دوسرے لوگ کون سے لام پر چلے جائیں۔

بچھو کے ڈنک کی طرح دوا دماغ میں کچوکے لگا رہی تھی' مگر پھر بھی وہ نہ سو سکی۔ لوگ کہتے ہیں اسے زیادہ نہ سوچنا چاہئے۔ میری کہتی ہے جیسے اس کے خیال ہوں گے' ویسا ہی اس کا بچہ ہوگا۔

"اپنے آنے والے بچے کا تصور کرو۔ جیسا تم اسے دیکھنا چاہتی ہو۔"

وہ انتظار کے ایرو ڈروم پر جا کھڑی ہوئی جہاں اس کی خوشیوں کا ہوائی جہاز اترنے والا تھا۔ چاروں طرف لگی ہوئی تصویروں میں وہ اپنا بچہ ڈھونڈنے لگی۔ کھڑکی سے باہر ستارے اس کی محویت پر مسکرا رہے تھے---

پھر تو رات کی سیاہی طوفان کی طرح آئی۔

کیسے تارے' کہاں کے چراغ۔ اسے تو ٹوٹی لاٹھی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ دل مفتوح جھنڈے کی طرح تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتی تو پلٹ کر اسی محور پر آٹکتی۔ پھر وہ ایک سیڑھی پر چڑھنے لگی۔

پھر کمل نے اپنے والن پر ایک دھن چھیڑی اور ڈاکٹر میری نے بڑھاوا دیا۔ "آگے بڑھ"

"آہستہ آہستہ---" مسز گھنیشام پیچھے کھڑی اسے جتا رہی تھیں۔ "تم سے کوئی بھول نہ ہو جائے۔"

ایک قلعہ تھا۔ قلعے کے اندر ایک تہہ خانہ تھا۔ تہہ خانے میں ایک کھڑکی۔ کھڑکی کے اندر سونے کا پنجرا تھا' اور پنجرے میں ہر خواہش کو پوری کرنے والا پنچھی--- یہ سب راز اس فاختہ نے آشکارا کیے تھے اور اپنی ہمت پر خود ہی رشک کرتی ہوئی چلی جارہی تھی۔

اب زینے کا آخری سرا آگیا تھا۔ آسمان کی آخری حد۔ جہاں پہنچ کر کوئی راز نہ رہا تھا۔ یہ ارتقاء کی آخری منزل تھی۔ عورت ہونے کا سب سے بڑا اعزاز۔ خدا کے اسرار کا سب سے بڑا بھید۔ جب خدا عورت کو اپنا نمائندہ منتخب کرتا ہے۔ امید اور روشنی لانے والی

پیغامبر' جس کی بدولت ہمت کا تسلسل کبھی نہیں ٹوٹتا۔ وہاں آسمان کی نیلاہٹوں میں کھڑے ہوئے پیغمبر اس پر سلامتی بھیج رہے تھے' اور کبھی نہ جھکنے والے سر سجدہ ریز تھے۔ جھلملاتے پروں والے فرشتے اس کی عظمت کے گیت گا رہے تھے۔ دنیا کے سارے گزرے ہوئے مدبر میمونہ کو مبارکباد بھیج رہے تھے۔ نیچے پھیلی ہوئی سربلند طاقتوں نے ہار مان لی تھیں اور فاختائیں خوشی کا یہ سندیسہ سنانے کے لیے دنیا بھر میں اڑتی پھر رہی تھیں۔ دور کھڑی ہوئی مسز گھنیشام اسے بار بار جتا رہی تھیں:۔ "تم سے کوئی بھول نہ ہوجائے۔"

ابھی وہ جی بھر کے اس پیارے پیارے بچے کو پیار بھی نہ کرنے پائی تھی' اس کی آلائشیں صاف کرتے کرتے بیزار بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ چنگاری بنا کبھی یہاں چمکتا کبھی وہاں۔ گھر کی ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر پھینکنے لگا۔ میمونہ کی ڈانٹوں کا تو اس پر کوئی اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ بجیا کے بچوں والی ساری بدتمیزیاں اس میں موجود تھیں۔ اس نے کچی نارنگیاں توڑ ڈالیں۔ کیچڑ میں سنے ہوئے پاؤں سے صوفے میلے کرنے لگا۔ پھر اس نے فاختہ کے بچے گھونسلے سے نکال لیے اور میمونہ کا منہ چڑانے لگا۔ پھر سب پھینک پھانک کر وہ وائلن بجانے بیٹھ گیا۔ اب چاروں طرف روشنی تھی۔

پھر ایک ریل آئی جو بغیر پٹڑیوں کے چل رہی تھ اور ایک جنگل میں جا کر رک گئی۔ اندر سے ایک نوجوان نکلا۔

"ریل چلاؤ---" وہ چلانے لگا۔

"آگے پٹڑیاں ختم ہوگئی ہیں۔"

"اچھا تو میں نئی پٹڑیاں ڈالوں گا۔"

کرسی پر بیٹھی ہوئی میمونہ یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس کا کمل تو بہت بڑا آدمی بننے والا تھا۔ پھر اپنے ریل چلانے کے لیے وہ کب تک پٹڑیاں بچھائے گا۔

پھر ارشد آیا۔ اس نے ریڈیو کھولا تو کمل کی غزل گائی جارہی تھی۔ ارشد کے ہاتھ میں ایک رسالہ تھا جس میں کمل کا فوٹو تھا۔

"آج کی خبریں یہ ہیں--- آج کی خبریں---" ارشد آفس سے آکر حسب عادت اہم خبریں سنا رہا تھا۔

"آج دنیا کی سب سے چھوٹی فاختہ نے ایک بہت بڑا انڈا دیا ہے۔ آج صبح ہی بندریا کو اپنا گھر بنانا یاد آگیا۔ اور پرسوں جو اندھے بھکاری کا پیسہ نالی میں گر گیا تھا' وہ مل گیا

ہے--- اور--- > پھر اس نے دت سے اپنے کمل کو ملایا۔ "میں بھی تو شاعر ہوگئی ہوں دت۔ میں نے بھی کویتا لکھی ہے۔ لیکن میں اپنی کویتا کو سلاخوں میں بند نہیں کروں گی۔ میں اپنی کویتا کو فاختہ کی طرح آسمان پر اڑا دوں گی۔"

پھر وہ آیا--- وہ جھومتا ہوا لمبے لمبے بالوں والا روایتی سا شاعر۔ زندگی کا نباض۔ اردو شاعری کا وہ آئیڈیل جس کی انگلیاں فگار تھیں' دل چھلنی' گریباں چاک' پیروں میں آبلے پڑے ہوئے اور آنکھوں سے جوئے خوں رواں۔ اس کے زمزموں سے کبھی آگ پھڑک اٹھتی' کبھی گھٹائیں نشے کی طرح چڑھنے لگتیں۔ اس کے جسم پر یہ داغ معشوق کے دست حنائی اور غم دوراں کے ستم گرنے مل کر ڈالے تھے۔

پھر چاروں طرف کی فکریں بلاؤں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑیں۔ مگر گیت تو سب ہی لکھا کرتے تھے۔ میمونہ رو رہی تھی۔

"ہاں لیکن میرا گیت ویسا نہیں تھا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "جیسے کاغذوں کا پھول۔ جیسے باندی کا خواب۔ میرے گیت میں انسانیت کا وہ پیغام ہے جو کرشن جی نے کروکشیتر میں دیا تھا۔ زندگی کا وہ مقصد ہے جس کی تلاش میں کپل وستو کا راجکمار بیراگی بن گیا تھا۔ محبت کا وہ عظیم جذبہ جو میرا کے گیتوں میں جھلکتا ہے۔ اور کائنات کی وہ رنگینی جسے کیٹس کے وجدان نے چھوا تھا۔

"میں نے اس گیت مالا کو پورا کرنے کے لیے اس میں پیغمبروں کا نطق اور فرہاد کے تیشے کی دھار بھی پرو دی ہے۔ اب میرا گیت پھول بھی ہے اور آگ بھی۔"

پھر اس کے اوپر سیاہ بادلوں کی طرح کوے ٹوٹ پڑے۔ وہ مدد کے لیے سب کو پکارتی پھری۔

سامنے ارشد لیٹا اسے خبریں سنا رہا تھا۔ "کمل گرفتار ہوگیا۔ اسے کسی نامعلوم اذیت گاہ میں بھیجا جائے گا۔" جیل میں تو قیدیوں کو ڈالڈا کھلاتے ہوں گے---؟ وہ سراسیمہ ہو کر سوچ رہی تھی۔

اب کیا ہوگا! اس نے چاروں طرف غور سے دیکھا---

کمرے میں ٹرانس فارمر کی ہلکی سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور ارشد اس کا سرداب رہا تھا۔ وہ خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ایسی کمزوری کہ اپنے ہاتھ بھی دوسروں کے لگ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے ارشد نے پانی پلایا' اور بڑی مشکل سے وہ اپنا خواب

ارشد کو سنانا چاہتی تھی، مگر وہ سننے پر راضی نہ ہوا۔ اس کا جی بہلانے کے لیے جانے ارشد کیا کیا سنا رہا تھا۔۔۔ اس کی آواز کہیں بہت دور سے آ رہی تھی۔

کھڑکی میں کھڑا ہوا کمل اسے مبارک باد دے رہا تھا: "آپ نے میری مسکراہٹ کو بمباری سے بچا لیا ہے۔ اب میں آپ کو سات رنگوں کا آئس فروٹ کھلاؤں گا، جو آپ کی آنکھوں میں ٹھنڈک کی قوس قزح تان دے۔" چڑیوں نے آج نرسوں کے سفید یونیفارم پہنے تھے اور ہسپتال میں گھوم رہی تھیں۔ اور سردی میں کانپتی ہوئی بندریا اپنے غلافی پپوٹوں کو جھپکا کے پوچھ رہی تھی:۔ "میرا گھر کہاں ہے۔۔۔؟"

"ہشت۔۔۔" ایک چڑیا نے اشارے سے منع کیا۔ "مسز گھنیشام نے نہیں بتایا تھا کہ اب کوئی بھول مت کرنا۔" میمونہ گھبرا کے کمل کو پکڑنے بھاگی مگر وہ چھپم سے پانی میں کود گیا۔

میلوں تک سمندر پھیلا ہوا تھا اور وہ فاختہ کی طرح جگہ جگہ اڑ کے اپنے بچے کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ اپنے زیوروں کے بکس میں، ارشد کی کتابوں میں، بغداد کے بازاروں میں اور امریکہ کے ساحلوں پر۔۔۔

"کیا ایمپلائمنٹ ایکس چینج کے آفس میں بھی نہیں ہے۔۔۔؟" دت نے گھبرا کے پوچھا۔

"یہ لو بیس روپے مہینے کی لاٹھی۔۔۔" مسز گھنیشام اسے ایک لاٹھی تھما رہی تھیں۔

اس نے گھوم کے دیکھا۔ ایک بڑی سی کڑھائی کے نیچے دوزخ کی بھٹیاں سلگ رہی تھیں، اور دیو خوبصورت بچوں کو پکڑ پکڑ کے ان کی کھلیں بھون رہے تھے۔ پھر یہ آگ سمندر میں بھی لگ گئی۔ پھر سمندر کا پانی بھی پٹرول بن کر جلنے لگا۔

"یہ لو بیس روپے کی لاٹھی۔۔۔" اندھی ماؤں کی قطار میں لوگ لاٹھیاں بانٹ رہے تھے۔

"کیا تمہارا پھول بھی آگ میں گر گیا۔۔۔؟" مسز گھنیشام نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

اچھا ہوا جو یہاں گورکی نہیں ہے۔ وہ رنج کے مارے پھر اپنے گھونسلے میں جا بیٹھی۔۔۔ پھر ایک تیز نگاہ والے عقاب نے تیر کی طرح جھپٹا مارا اور کوؤں کے ہجوم میں صف ماتم چھ گئی۔۔۔ ذرا دیر میں دیکھو وہ ارشد کے ساتھ فرنیچر کی دکان میں کھڑی جھولے کا

بھاؤ چکا رہی تھی۔ سامنے بے شمار لکڑی کے کھلونے رکھے ہوئے تھے۔ وا ئلن بجانے والا چینی گڈا میز سے اتر کر بھاگا جارہا تھا۔۔۔

"خبردار جو کسی نے شور مچا کے میرا موڈ خراب کیا۔۔۔"

"ذرا اپنے کمل کے ٹھاٹ تو دیکھو۔۔۔" میری دوڑتی ہوئی آئی۔ سڑک پر انسانوں کا سیلاب تھا اور لوگ نعرے لگا رہے تھے: "تم تو بڑی سگھڑ ماں نکلیں۔۔۔" آخر مسز گھنیشام اس کے سگھڑاپے کی قائل ہو گئیں۔

"میرا بچہ۔۔۔" وہ خوشی کے مارے پاگل ہوئی جارہی تھیں۔

آٹھ گھوڑوں والے رتھ پر وہ شہنشاہوں کی طرح بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر سچائی کی چمک تھی اور لوگوں کی محبت کا اعتماد۔ وہ آسمان کی طرف اڑا چلا جارہا تھا۔۔۔

ہاتھوں کا چھجا بنا کر میمونہ نے بہت دور دیکھا۔۔۔ وہ فضا میں معلق تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں میخیں جڑی ہوئی تھیں۔ دل سے خون کی دھار پھوٹ رہی تھی' اور آنکھوں سے روشنی کے فوارے اچھل اچھل کر ساری دنیا کو روشن کررہے تھے۔ لوگ نیچے کھڑے چیخ رہے تھے۔

"وہ جھوٹا نہیں ہے۔ فاختہ نے اسے سکھ کے موتی کا پتہ بتایا ہے۔ اسے ڈھونڈ دو۔"

"غدار ہے۔" کوے اس پر جھپٹ رہے تھے۔

"میں فاختہ کا انڈا ہوں۔ مجھے ابھی سے مت کھاؤ۔"

"ہاں یہ میرا انڈا ہے۔" میمونہ پھڑ پھڑا رہی تھی۔

"صبر کرو میمونہ۔" ارشد اسے سمجھا رہا تھا۔ "گیت مالا کا نیا موتی بڑی مشکلوں سے ملتا ہے۔ اسے ڈھونڈنے کے لیے دنیا کے ہر دت کو نامعلوم اذیت گاہوں کو پار کرنا پڑتا ہے۔ دیکھو تو اس نے کتنے اچھے اچھے گیت جمع کرلیے ہیں۔ قرآن شریف' مقدس وید' گرنتھ صاحب اور انجیل مقدس۔ اور آئین اسٹائین کا نظریہ اضافیت اور گاندھی جی کا عدم تشدد' نطشے کا غم' گورکی کی رجائیت اور مارکس کا سوشلزم۔ اوفوہ! یہ گیت مالا کتنی قیمتی ہے میمونہ۔ وہ ہمارے بیٹے تھے جنھوں نے اسے پرویا۔ اب کمل ایک نیا موتی ڈھونڈنے نکلا ہے۔"

لیکن میمونہ نے اس کی بکواس نہ سنی۔ وہ سمندر کی سطح پر چل رہی تھی۔۔۔

اب اس کا گھر آگیا تھا۔ اے لو وہ گھر میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ

بغلوں میں دبے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ وہ سردی کے مارے کانپ رہا تھا۔ میمونہ نے جلدی سے الماری کھول کر کمبل نکالنا چاہا مگر الماری خالی تھی۔ کمبل کہیں نہ تھا۔ پورے گھر میں' پورے محلے میں' وہ ہر جگہ کمبل ڈھونڈ آئی۔ بازاروں کی خاک چھان ڈالی۔ پھر اسے یاد آیا' پرسوں ایک کمبل تو وہ بھکاری کو دے چکی ہے۔

"خیر جانے دو۔ تم مجھے بسکٹ کھلا دو۔"

"بسکٹ---" قندیل کی طرح ایک خیال روشن ہوا اور رات کی طرح سیاہ پڑ گیا۔

رات ہی تو امن کانفرنس سے لوٹتے وقت وہ بسکٹ لائی تھی۔ مگر نہ جانے کس نے ایک اونچے چھینکے پر لے جا کر بسکٹ رکھ دیے تھے۔ اب وہاں تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ ارشد کا بھی نہیں۔ رجو کا بانس بھی نہیں چھو سکے گا۔

"اونہہ---" وہ جلدی سے مشین کھول کر سینے بیٹھ گئی۔

ایک دم باورچی خانے سے کباب جلنے کی بو اٹھی۔ ساری دنیا کے کباب جلے جا رہے تھے' اور ہر جگہ عورتیں اپنے چولہوں سے لاپرواہ بنی کپڑے سے جا رہی تھیں۔ اگر ایک دم سب عورتوں کے شوہر مل کر ڈانٹنا شروع کر دیں تو!

"یہاں دستخط کر دو---" ارشد میری کے ساتھ امن اپیل پر دستخط کرواتا پھر رہا تھا۔

"ہشت---" اس نے کاغذ اٹھا کر سمندر میں پھینک دیے۔

کمل کے آئس فروٹس سے قطرے گر گر کر رنگوں کی موجیں بنا رہے تھے۔ پھر وہی آسمان پھیلنے لگا۔ پھر وہی خوبصورت نوجوان' جس کی آنکھیں بالکل ارشد کی طرح پرکشش تھیں' اپنے ہاتھوں کو سہارا دیئے آسمان کو روکے کھڑا تھا۔ چاند ستارے میلے میں گھومنے والے جھولے کی طرح اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ڈگڈگی اٹھا لی اور جادو کے پٹارے سے اللہ جانے کیا کیا نکال رہا تھا۔

"بھائیو--- میں جاوید ہوں۔ میں فوق البشر ہوں۔ خدا کی صنم کدے کا سب سے زیادہ لائق پرستش نقش ہوں۔ قدرت کی شاعری کا شاہکار ہوں۔ ارض و سما کا فاتح۔ میں نے ایک خوبصورت نظم لکھی جس کا ہیرو خدا تھا۔ اس کہانی کی مقبولیت کبھی کم نہیں ہوگی۔ میں وہ خود سر ہوں جس کے لیے باغ عدن میں پہرے لگوائے گئے تھے' مگر ابدیت کا پھل پھر بھی مجھ سے نہ بچ سکا۔

"میں نے بیج بویا اور حیات کا تسلسل زمین سے پہلی بار اگا۔ میں نے پہاڑوں کو

کنکروں کی طرح راستے سے اچھال دیا۔ سمندر کے سینے پر آرے چلائے اور شریر بچے کی طرح قدرت کے چہرے کی ساری نقابیں الٹ دیں--- دیکھیے--- یہ قلم ہے، جس سے میں نے تدبیروں کے احکام پر صاد کیا' یہ تلوار ہے، جس سے میں نے سامنے آنے والی ہر دشواری کو ہٹا دیا۔ یہ کلہاڑی ہے، جس نے میرے خوابوں کی تعمیر کی ہے۔"

وہ اپنے جھولے سے چیزیں نکال نکال کر پیشہ ور شعبدہ گروں کی طرح دکھا رہا تھا۔

"اب میں اپنے آرٹ کا ایک اور کمال دکھاؤں گا۔ اب میں اس ذرے کو توڑوں گا اور دنیا میرے قدموں میں جھک جائے گی۔"

پھر ایک وحشت ناک چیخ کے بعد وہ خود بھی اس آگ میں تحلیل ہونے لگا جو زمین و آسمان میں بھڑک رہی تھی۔

اب کیا ہوگا۔ میمونہ کا جی بیٹھا جا رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں اتنے خطرناک کھلونے کیوں دیے تھے!

آسمانوں پر اسے ہزاروں وہ شاعر نوحہ خوانی کرتے نظر آئے جنھوں نے دنیا کے حسن پر نظمیں لکھیں تھیں۔ وہ مدبر اس کے خلاف تحریک ملامت پیش کر رہے تھے، جنھوں نے میمونہ کو سلامتی کے پیغام بھیجے تھے۔ لاکھوں مزدور اپنے زخمی ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے۔ لوہے کی سلاخوں میں گھرا ہوا دت سر پٹک پٹک کر کہہ رہا تھا:۔ "اب میں کبھی باہر نہ آسکوں گا۔" میمونہ نے گھبرا کے کمرہ بند کرلیا۔ باہر لوگوں کا ہجوم اسے مارنے کے لیے آیا تھا۔ اپنے مردہ بچے کو چھاتی سے لگائے ہوئے بندریا اس کے کواڑ جھنجوڑ رہی تھی۔

"میں نہ کہتی تھی تم سے کوئی بھول ہوجائے گی۔ تم نے میرے کمل کا والن جلایا ہے۔ تم نے اس کے موڈ پر بمباری کی ہے۔ اب میں امن کانفرنس میں تمھیں اپنا سفیر بنا کے نہیں بھیجوں گی۔"

"ہائے مجھ سے کیسی بھول ہوگئی۔" وہ کلیجہ پھاڑ کے رو پڑی۔

"مجھ سے اب میمونہ کا علاج نہیں ہوگا۔ میمونہ نے چیخیں روک کر آنکھیں کھولنا چاہیں۔ ڈاکٹر میری غصہ میں تن پھن ٹہل رہی تھیں اور ارشد سر جھکائے مجوب سا بیٹھا انگلیاں چٹخا رہا تھا۔

"ہونہہ--- بھلا کہیں ایسی حالت میں نیند کی دوا دی جاتی ہے۔ دیکھنا آپ کی بیوی ضرور اپنے بچے کا ناس مار دیں گی۔"

اے واہ بڑی آئیں بچے کا ناس مارنے والی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولنا چاہیں مگر کمزوری کے مارے پوری طرح کھول ہی نہ سکی۔ دل پر کسی نے مرچیں مل دی تھیں۔ درد کے مارے ہاتھ پاؤں چیخ رہے تھے۔ اس خوفناک جادوگر نے پھر اس کے پیٹ میں لوہار کی دکان کھول لی تھی۔

صحن میں فاختائیں اور چڑیاں ایک دوسری کو جگاتی پھر رہی تھیں۔ دور کسی مسجد میں موذن اللہ کی بڑائی کا اعتراف کر رہا تھا--- پھر اس نے میز پر رکھے ہوئے بوے کو دیکھا جو گردن ہلا ہلا کر آنے سے انکار کرنے لگا۔

ایک دم اسے اپنے سارے بے تکے خواب یاد آئے' اور وہ بڑے عزم کے ساتھ اٹھنے کا ارادہ کرنے لگی۔ یوں جیسے آج صبح ہی گھر بنانے کا عزم کر بیٹھی ہو۔

"تم دیکھنا میری میں اپنے بچے کو کیسے پالوں گی۔" آج وہ میری ہار ماننے کو تیار ہو بیٹھی۔

"رات بھر یہی حالت رہی---" ارشد نے آہستہ سے کہا اور اسے پکڑ کے زبردستی لٹانے کی کوشش کرنے لگا۔

"اچھا اچھا اب تم سو جاؤ۔"

"میری مجھ سے کیوں خفا ہے۔ میں جانتی ہوں اس نے میرے بچے کو بھی خفا کیوں کردیا ہے۔ میں نے امن اپیل پر دستخط جو نہیں کیے تھے۔" اس نے ارشد کا ہاتھ جھٹک کر میری کو بڑی خوشامد سے دیکھا۔ میری اس کے قریب بیٹھ کر تھپکیاں دینے لگی--- "اچھا تو اب کر دینا میں من جاؤں گی۔ مگر تم اب زیادہ مت سوچو۔" وہ اس کے بکھرے ہوئے بال سنوارنے لگی۔

"اب سوچنا ہی کیا ہے---؟" وہ بڑے اطمینان سے کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

"مجھے سب معلوم ہو گیا ہے--- تم پہلے اس کے مستقبل کی دستاویز لا دو - میں لڑھکتی ہوئی دنیا کے آگے بریک لگا دوں--- پھر کام کیا رہ جائے گا---؟"

تلچھٹ

(1)

جس وقت اختر نواب راحت علی خاں ہال میں داخل ہوئی تو حسب معمول سب ہی آچکے تھے اور حسب توفیق سب ہی نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔

پہلی مایوسی تو اختر کو یہ ہوئی کہ وہ پروفیسر قناعت علی نہیں آئے تھے، جنہوں نے اللہ اللہ کرکے اس کے فن پر مضمون لکھنے کی حامی بھری تھی۔ لیکن سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ عظیم آپا اپنے ساتھ یونیورسٹی کے بہت سے ہونہار شاگردوں کو گھیر لائی تھیں۔ اختر ان لڑکوں کو ہمیشہ لاؤڈ اسپیکر کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ ایک ادائے خاص سے اس نے ہاتھ ہلا کر سب کے سلاموں کا، کورنشوں کا، اور اٹھک بیٹھک کا جواب دیا۔ اور بڑی دیر تک کھڑی لچکتی رہی کہ کدھر جا کے بیٹھے۔

اختر کی ہمیشہ یہ کوشش رہی تھی کہ ادبی جلسوں میں وہ بے حد مخلص اور بے حد ادیب دکھائی دے۔ اس کشمکش میں ایک بات تو یہ ہوتی کہ وہ دمہ کے مریض لرزاں صاحب اور اخبار بیچنے والے آہ نارسائی تک کا مزاج پوچھ بیٹھتی تھی۔ پھر ڈائس کے کسی صوفے پر اچھے سے پوز میں بیٹھنے کے بعد بڑے غور سے، بڑے اطمینان سے ان عواموں کو دیکھا کرتی تھی، جن بچاروں کے لیے وہ لکھتی ہے۔ ان کے مسائل سے وہ اتنی ہی واقف تھی جتنے عوام خود ناواقف تھے۔

دراصل یہ عوامی ادب والی ترکیب حال کی پیداوار تھی۔ جب سے لمبے لمبے بالوں والے دو چار لونڈوں نے (جو مشاعروں میں جوتیوں کے پاس بیٹھا کرتے تھے) اسٹیج پر قبضہ کرلیا تھا۔ یہ ہو حق اتنی بڑھ گئی تھی کہ اب ادب کا مستقبل بچانے کے لیے نواب تخیل یار جنگ اپنی ڈیوڑھی میں ایک ادبی اجتماع بلایا کرتے تھے۔ اس محفل میں صرف خاندانی نواب اپنے ارشادات عالیہ تقسیم کرتے۔ بے حد شاندار اور مہذب محفل ہوتی تھی۔ انتہا یہ تھی کہ یہاں اس گندے ادب کا ذکر بھی معیوب سمجھا جاتا تھا، جو حیدر آباد کی صاف شفاف سڑکوں پر گندگی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اب تو طالب علموں کے ساتھ ساتھ پروفیسر بھی سینگ کٹا کے بچھڑوں میں مل رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ وبا بھی دوسرے متعدی امراض کی طرح کچھ تو شمالی ہند سے آئی تھی۔ اور کچھ تلنگا کے غنڈوں کی طرف سے بچارا اعلیٰ طبقہ،

جس کی آبرو کا چراغ ہمیشہ مخالف ہواؤں کی زد میں لرزا کرتا ہے، اب ایک اور آندھی میں پڑا کانپ رہا تھا۔

ایسے میں اختر نواب راحت علی خاں جیسی خوبصورت، نام آور ادیبہ، جو شعر و سخن کی محفلوں میں آنے لگی تو کم سے کم دس بیس برس کے لیے تو ادب کے مستقبل کے ساتھ ساتھ یہاں بیٹھنے والوں کو اپنا مستقبل بھی جگمگاتا ہوا دکھائی دیا۔

حالانکہ یہاں بھی جب اختر غریبوں کے دکھ درد پر کوئی کہانی سناتی تھی تو اس کے بعض جملوں پر سب ایک دوسرے کو چونک چونک کر دیکھتے اور وہ ذرا ناز کے ساتھ مسکرا دیتی تھی۔ عموماً" وہ گردن ہلا ہلا کے یہی کہتی پھرتی کہ بھئی میں ترقی پسندوں کے نظریوں کو بھی جانچنا چاہتی ہوں، مگر اصل میں اسے ایک "باہر والا" ترقی پسند شاعر بہت بھا گیا تھا۔ ان دنوں غیر ترقی پسندوں کو گیٹ آؤٹ کرنے کی مہم زوروں پر تھی۔ یہاں تک کہ کوئی مشہور ادیب آجاتا تھا تو اس کے ارد گرد ترقی پسندی کی باڑھ لگا کے محفوظ کرلیا جاتا۔ لیکن وہ شاعر اختر کے خوبصورت خلوص سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اختر کی آٹوگراف بک پر دستخط کر دیئے، اس کے ہاں دعوت کھائی، اور اسے رجعت پسندی کا ہیضہ نہ ہوا۔ چلتے چلتے وہ دعائیں بھی دیتا گیا۔

"مجھے یقین ہے اختر صاحبہ کہ آپ زیادہ دنوں حقیقت کو نظر انداز نہ کرسکیں گی۔"

اس کے جانے کے بعد اختر نے پہلا کام تو یہ کیا کہ غنڈہ گردی پر لعن طعن بند کردی۔ اور دوسرا کام وہ آج یہ کرکے لائی تھی کہ اس بار کسی گلفام کی بجائے اس کی کہانی کے ہیرو بشارت چچا تھے۔ ممکن تھا کہانی کے ہیرو بننے کے لیے چچا کبھی یاد نہ آتے۔ مگر جس دن وہ تکیے کے نیچے سے پچاس روپے نکال کے لے گئے تھے اسے اٹھتے بیٹھتے غریبوں کی کمینگی پر غصہ آتا۔ اللہ جانے پچاس روپوں میں انہوں نے کیا کیا گلچھرے اڑائے ہوں گے——؟ یہ بات یاد کرتے کرتے وہ کہانی لکھنے بیٹھی تو پلاٹ سامنے دھرا تھا۔ کہانی لکھنے کے بعد اختر کو یقین ہوگیا کہ یہ پاسپورٹ ہر ممنوعہ سرحد پر کام دے سکتا ہے۔ اس کہانی میں اختر نے اپنا اسٹائل بھی بدل دیا تھا۔ بات نہ تو مئی کی گلابی دوپہر سے شروع ہوتی تھی نہ چاندنی کے غسل سیمابی سے۔ لکھنے سے پہلے اس نے عبدالحلیم شرر کے دو چار ناول دیکھے۔ "فسانہ آزاد" پڑھا اور راشد الخیری کے بہت سے جملے تو زبانی رٹ لیے۔ ایم اسلم کے ناول کوئی چرا کے لیے گیا تھا ورنہ انہیں بھی ضرور دیکھ ڈالتی۔

تخیل یار جنگ ہمیشہ اس سے کہتے رہتے تھے کہ بی بی پاشا یہ لوگ جو خومی ادب کا نعرہ پیٹتے ہیں ان سے بھی بچنے۔ کیونکہ تلگو کی یہ کہاوت بالکل سچ ہے کہ "کلم کلم او کٹی" (یعنی قوم تو ایک ہی ہے) اور وہ کورنش بجا لا کے عرض کرتی کہ چچا حضرت آپ بس دعا فرمایئے کہ میں ان بلاؤں سے محفوظ رہوں۔

"اس بار اس کی کہانی ایک ولولہ انگیز شعر سے شروع ہوتی تھی۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

"اے فلک کج رفتار! صد حیف ہے تیری بے وفائی پر۔ اور اے زمانہ ساز انسان لعنت ہے تیرے وجود پر کہ تیرے ستائے ہوئے روٹی کے ایک ٹکڑے کو ترس رہے ہیں--- یہ کیسا انصاف ہے ان داتا--- (اختر نے باری باری سب کے چہروں کا جائزہ لے کر اپنے اوپر تنقیدی نگاہ ڈالی) اگر دنیا اتنی ہی پتھر دل ہے تو میں آج ہی اسے مٹانے کا عزم کرتا ہوں۔" (تالیاں)

سردی سے کانپتے ہوئے بشارت نے سوچا اور مٹھیاں بھینچ کر عزم کیا کہ آج وہ ان فلک بوس محلوں کو ڈھا دے گا۔ (حاضرین دم سادھے ہوئے ہیں) آج میں امیروں کی تجوریوں کو آگ لگا دوں گا (بے پناہ جوش کے ساتھ نرت کا مدرا) کیونکہ میں اتنا بڑا شاعر ہو کر بھوکا سوتا ہوں جب کہ---

(2)

حالانکہ بشارت نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہ سمجھا۔ یہ فلک بوس محل تو الگ رہے' وہ بچارا تو بچوں کے ریت والے گھروندے بھی نہ توڑ سکتا تھا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ ظلم کا پتھراؤ فلک کج رفتار کی جانب سے ہو رہا تھا یا زمانہ ساز دنیا کی طرف سے!

ظاہر ہے اگر اس سوال کی جستجو ہوتی تو وہ اختر پاشا کے پاس ہی تو پوچھنے آتے۔ البتہ ایک بات سچ تھی کہ پیٹ کی پکار نے انہیں رذالت کا ہر دروازہ جھنکا دیا تھا۔

بشارت چچا کی کہانی دراصل ان کے باپ شوکت نواب کی شاعری سے شروع ہوتی ہے۔ وہ معشوقوں کی خوشامد کرنے' مشاعروں میں جھک جھک کر داد وصول کرنے' اور مداحوں

کو کھلا پلا کے تالیاں پٹوانے والی شاعری نہیں۔ حالانکہ نوابوں کو شاعری کا خفقان اٹھتا ہے تو عین من یہی حادثے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

شوکت نواب کا جسم بہت عالی شان تھا اور اس فلک بوس عمارت کو انہوں نے اکڑفوں' غصہ اور قہر و غضب کے سامان سے سجایا تھا۔ پھر انہوں نے اس عجائب خانے میں شاعری کو لا کر بند کیا تو در و دیوار کانپ گئے۔ جیسے سیکڑوں خوں خوار شیروں میں بکری کا مولا چھوڑ دیا گیا ہو۔ کچھ دن تو یہ حال رہا کہ انہیں اپنا کلام سنانے کے قابل کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ مگر کب تک ـــــ جب غزلوں پر غزلوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تو بپھرے ہوئے دریا کی طرح سب کو بہا لے گیا۔

وہ لوگ جو ابا حضرت کے ساتھ راگ رنگ کی محفلوں میں موج اڑا کے منہ اندھیرے چلے جاتے تھے' اب پکڑوا کے قالینوں پر بٹھائے جاتے اور فضا میں بارود کے دھماکوں کی طرح شوکت نواب کی آواز گونجا کرتی۔ ہر شعر ایک گرج بن کر نکلتا اور لوگوں کے کانوں سے ٹکرا کے پاش پاش ہوجاتا تھا۔ کچھ شعر ان کے چہرے پر چھائے ہوئے جلال' بند مکوں اور ابلتی ہوئی آنکھوں سے لہولہان ہو کر دم توڑ دیتے تھے۔

سنا ہے ایک دن کسی تقریب کے سلسلے میں بہت سے مہمان آئے تو شوکت نواب بھی اپنی بیاض لے کر بیٹھے۔ شعر کو کبوتر کی طرح فضا میں اڑا کے جو اچھلے تو سامنے بیٹھی ہوئی ایک دھان پان سی لڑکی چیخ مار کے گر پڑی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ چھوٹی خالہ کے کسی منشی کی لڑکی ہے۔ لیکن اس وقت تو شوکت نواب کے ہاتھوں سے اور بھی کتنے ہی پرندے چھوٹ بھاگے تھے۔ عورتوں نے جلدی جلدی اسے سنبھالا۔ دوسری لڑکیاں اور بچے اس حادثے کو غنیمت جان کے ادھر ادھر ہوگئے۔ بیاض ہاتھ سے رکھ کر شوکت نواب نے اسے دیکھا۔ وہ اتنی لچک دار سی لڑکی تھی کہ مٹھی میں سمیٹ لو۔ سہمی سہمی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی جیسے پھانسی کے تختے سے چھوٹ بھاگی ہو۔ سب کے ساتھ شوکت نواب بھی اپنا دھماکو قہقہہ ملا کے اس کی جانب بڑھے۔ اس بار وہ لڑکی ڈر کے مارے بھاگی نہیں بلکہ بے ہوش ہو گئی۔

بیاض پٹک کر انہوں نے قہر آلود نگاہوں سے اس لونڈیا کو دیکھا' جس نے ان کی شاعری کا ہی نہیں بلکہ ان کے حسن و جمال کا بھی مذاق اڑایا تھا۔ دوسرے دن وہ لڑکی اپنے گاؤں چلی گئی۔ اس کا باپ اتفاق سے کسی جاگیردار' کسی دیس مکھ کا قرض دار نہیں تھا۔

ہاتھی جب مست ہو جاتا ہے تو مرغی کی ڈربے میں گھسا دیجئے۔ شوکت نواب بھی اپنے پیٹھ پر سے خاندانی سطوت کی عماری اور شخصیت کے دوشالے جھٹک کر چوہیا کے بل میں گھس گئے۔

اب بھی آپ انہیں شاعر نہ مانیں تو یہ کیسی عظیم الشان حماقت ہوگی۔

لوگ کہتے ہیں کہ ہر انسان کی فطرت میں ماں باپ کی فطرت ہوتی ہے۔ یہ دل و دماغ تو اسے دنیا میں آنے کے بعد ملتے ہیں۔

مگر بشارت کو بنانے میں قدرت کا یہ توازن بری طرح بگڑ گیا تھا۔ اس کے جسم میں باپ کی شاعری گھولی گئی اور شاہانہ مزاج اوپر سے ماں کی خوبصورتی اور نزاکت ملائی گئی۔ اور وہ بزدلی جو کسی کی چیخ سن کر ہوش و حواس چھوڑ بیٹھتی تھی۔ احساس کی شدت بھی اسے ماں سے ہی ملی تھی' وہ حساس طبیعت جو کمزور جسم' دماغ کو دے دیتا ہے۔

بشارت کی لچک دار ماں کو مٹھی کھول کر شوکت نے دیکھا تو وہ پھر بے ہوش تھی۔ وہی پرانی عادت۔ لیکن اس بار شوکت نواب کی لاتیں بھی اسے نہ اٹھا سکیں اور وہ نواب کے ذہن سے یوں کھسک گئی جیسے دھوپ غیر محسوس طریقے پر ڈھل جاتی ہے۔ صرف ننھا سا بشارت اپنی ماں کے صدائے بازگشت بنا روئے جاتا۔

بشارت کو یہ باتیں پوری طرح یاد نہ تھیں۔ ایک موہوم سی پرچھائیں تھیں۔ یوں جیسے ایک کہانی سنائی جارہی ہو۔ اور اس کے نامکمل کردار سننے والے کے ذہن میں ڈولتے پھریں۔

"دفان کرو حرام زادے کو۔ اب آواز نکلی تو گلا گھونٹ دوں گا۔" باوا جان دھاڑ رہے تھے اور بشارت سہم کر یوں چپ ہوگیا تھا جیسے اپنی ماں کی نقل اتار رہا ہو۔ اس دن سے بشارت کی آواز کو ایک مستقل خوف نے دبا لیا تھا۔ زمین و آسمان ایک ہی بات کہتے سنائی دیتے۔

"دفان کرو۔ دفان کرو---"

یادوں کے سرورق پر باوا جان کی یہ پہلی دتکار تھی جو اس کی یادداشت کا سرا بنی۔

ایک دن اس نے اپنے مولوی صاحب کی شان میں' مصرعوں میں پروکر' ایسی گالیاں پیش کیں کہ باوا جان سن کر پھڑک اٹھے۔ انہیں سوتے جاگتے یہی فکر تھی کہ پانچ نکاحی بیویاں مل کر بھی اس راج دلارے کو جنم نہ دے سکیں جو ان کے بعد قرض اور قرقیوں کی

بلاؤں، سازشوں اور اس گھن کی ڈیوڑھی کا وارث ہوگا۔ آخر کار چھٹانک بھر کی یہ لونڈیا ایک نشانی دے مری تو وہ بھی دوغلا --- بھلا یہ منشیوں اور کسانوں کی اولاد نوابوں کی ڈیوڑھیوں میں کیا سجے گی؟ مگر آج یہ خیال ایک دم بغیر پروں کے کہیں اڑ گیا۔ انہیں بشارت نرا نواب زادہ معلوم ہوا۔

اس دن سے بشارت پر سات خون معاف کردیئے گئے۔ (جو ان کے خاندان میں ہر ولی عہد پر معاف کردیئے جاتے تھے) اور بے حد لاڈ میں آکر زندگی بھر پڑھائی کی آنچ بھی اس پر حرام ہوگئی۔ اس سے زیادہ فیاضی دکھانے کے اب دن نہ رہے تھے۔ اب تو وہ زمانہ آن لگا تھا کہ عشرتوں نے باوا جان کو پیٹنا شروع کردیا تھا۔ ان کی تازہ اور گرماگرم غزلوں کو سننے والوں کی تعداد صرف ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔ ان کی چیخوں سے دہل دہل کر ڈیوڑھی کی ایک چھت بیٹھ جاتی، کبھی ایک ستون گر جاتا۔ لیکن اس گئی گزری حالت پر بھی وہ خاصے مرے ہاتھی تھے۔ یوں بھی خالی جیب میں ذرا سے سکے اچھلنے لگتے ہیں۔ ہار نہ ماننے والے کھلاڑی کی طرح انہوں نے بھی فیض عام کا سلسلہ بڑھا دیا تھا۔

ان جھگڑوں سے الگ پانچ برس کا بشارت آپا کی گود سے اترنے پر راضی نہ ہوتا تھا۔

"باوا جان میرے کو چھوٹی سائیکل لا دو نا۔"

"باوا جان میرے کو پھولوں والی چھتری ہونا۔"

"باوا جان۔ اب اپن عورتوں کا ناچ کیوں نہیں دیکھتے؟"

"باوا جان--- باوا جان---"

بے کاری سے گھبرا کے انہوں نے بشارت کو تربیت دینے کی ٹھان لی۔ بہت سی زبان زد گالیاں اسے سبق کی طرح رٹا دیں۔ ایک چھوٹی سی بندوق تھما کر ہر چیز کو نشانہ بنانے کی آزادی دے دی۔ جھوٹ موٹ کے وعدے کرکے اسے ضد کرنا سکھایا۔ پھر جب اسے باپ کو مارنا، لاتیں مار کے برتن توڑنا، اور ذرا ذرا سی بات پر مچلنا بھی آگیا تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں چھڑی اٹھا لی۔ اگر آپا نہ ہوتی تو وہ اپنے خود سر بیٹے کو بہت پہلے ماں کے پہلو میں لٹا چکے ہوتے۔ ننھے سے بشارت کے جسم کے ساتھ ساتھ ذہن پر بھی چوٹوں کے گھاؤ ناسور بن گئے تھے۔ بیٹھے بیٹھے انہیں خیال آتا کہ یہ لاغر سا لڑکا اتنی محنت کے بعد بھی نواب نہ بن سکے گا۔ پھر باسی کڑھی کا ابال اٹھتا اور وہ بشارت کو نواب بنانے کے لیے چھڑی لے کر اٹھ بیٹھتے۔

زخمی فاختہ کی طرح تھر تھر کانپتا ہوا بشارت ساری ڈیوڑھی میں چھپتا پھرتا۔ اسے اپنے آس پاس خلاء کا سمندر نظر آتا تھا۔ جب شدت کی بھوک لگی ہو تو وہ بھوک نہیں کمزوری بن جاتی ہے۔ بشارت کو کسی ماں نے چھاتی سے لگا کے دودھ نہ پلایا تھا۔ وہ ہمیشہ تکیے سے لپٹ کر سویا۔ لوریوں کی بجائے گالیاں سن کر چپ ہوا۔ اب وہ ہر جگہ ایک شفقت بھری گود ڈھونڈتا پھرتا تو یہ ماں کی طلب نہ تھی۔ اس کی طلب کیا تھی---! وہ خود بھی نہ جانتا تھا۔ جب وہ ہاتھ پسارے دوڑ کر دیوار سے چمٹتا تھا تو اس کا ننھا سا سایہ بھی باہوں میں جذب ہو جاتا تھا۔ یہ کھیل اسے بہت پسند آیا۔

آیا کی نظر بچا کر جب وہ دیوار کا چونا چاٹنے لگا۔ چونے کا پھیکا پھیکا ذائقہ اور مٹی کی سوندھی خوشبو روح کو سرشار کردیتی تھی۔ سب کھلونے پھینک پھانک کر وہ دن بھر خالی کمرے کی دیواروں سے سرگوشیاں کیے جاتا۔

پھر ایک دن وہ گیند میں الجھ کر دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس دن دیوار نے بالکل باوا جان کی طرح اس کے چانٹا مارا تھا۔ دوسرے دن سے وہ اتنی احتیاط کے ساتھ چلنے لگا کہ کہیں دیوار سے نہ چھو جائے۔ ایک دن آنگن میں بیٹھے بیٹھے اس کی نظر آسمان پر گئی جہاں بے شمار طوطے گاتے پھر رہے تھے۔ سب مل کر ایک دائرے میں گھومتے اور پھر ایک شریر طوطا دائرہ توڑ کے نکل جاتا تھا۔ پھر سب اس کے پیچھے جا کے ایک اور دائرہ بنا لیتے "___ ٹیہوں ___ ٹیہوں---" وہ بشارت کو بھی کھیلنے کی دعوت دے رہے تھے۔

"ٹیہوں--- ٹیہوں---" اس نے بھی تالیاں بجا کر نیچے سے جواب دیا۔

دوسرے دن باوا جان نے ایک پنجرے میں بند رنگین پروں والا طوطا اسے لا دیا۔ سنہرے پنجرے سے اس کی لمبی دم باہر نکل جاتی تھی۔ وہ گھوم گھوم کر بشارت کو ڈھونڈ رہا تھا۔

"ٹیہوں--- ٹیہوں---" یہ وہی دائرے توڑنے والا شریر طوطا تھا۔ بشارت نے تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا اور بچھڑے ہوئے دوست کی طرح سینے سے لگا لیا۔ طوطے نے بھی محبت کے جوش میں اس کا گال چوم لیا۔ شور سن کر سب جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر نے ٹانکے لگا کے زخم بھر دیا تب چین پڑا۔

اس دن بشارت نے بہت سے ٹوٹے پھوٹے خواب دیکھے۔ جیسے باوا جان بھی دیوار بن گئے ہیں۔ اور اسے دھکے دے کر گرا رہے ہیں۔ پھر ایک بڑا سا پتھر آیا اور اس کے

سارے کھلونے چکنا چور ہوگئے۔ وہ ہوا میں اڑتا ہوا پھر رہا ہے۔ دائروں کو توڑ توڑ کر بھاگ رہا ہے۔ پھر ایک بوڑھے طوطے نے اسے دیکھ لیا ___ دفان کرو ___ دفان کرو ___ طوطا چیخ رہا تھا۔

پھر وہ طوطا آیا کہ پیچھے پڑ گیا--- ساری ڈیوڑھی میں وہ بھاگتی پھر رہی تھی۔ اور باوا جان ہانپتے کانپتے اس کا تعاقب کررہے تھے۔ اس نے گردن اٹھا کے دیکھا۔ آیا باوا جان کو مار رہی تھی۔ دیوانوں کی طرح۔ چڑیلوں کی صورت۔ یہ آیا تو بالکل چڑیل ہے۔ اس نے کروٹ بدلی۔

صبح وہ بڑی دیر تک روتا رہا مگر آیا نہ آئی۔ دوسرے نوکر اس کا منہ دہلانے آئے۔ ماما دودھ لے کر آئی۔ مگر وہ سب کو لاتیں مار کے بھگاتا رہا۔

باوا جان اور ان کی کئی بیویوں میں زور دار لڑائی ہوتی رہی۔ غصہ کے مارے باوا جان نے ڈیوڑھی کے ہر قالین کے چار چار ٹکڑے کرکے بانٹ دیئے۔ ہر چینی کا برتن توڑ کے تقسیم کرڈالا۔ اس ہائے واویلا میں باوا جان خود بھی دھجیوں میں بکھر رہے تھے۔

دوپہر ہونے کے بعد جب رونے کی تھکن نے بالکل نڈھال کر دیا تو وہ مسہری سے اتر کے زمین پر اوندھا لیٹ گیا۔ اس کے ہاتھ فرش پر پھیلے ہوئے تھے۔ اور چہرے پر بڑی تابناک مسکراہٹ تھی اب ہر طرف سکون تھا۔ کبھی کبھی باوا جان کی دھواں دھار کھانسی سے گھر کے در و دیوار کانپ کانپ جاتے۔ یا پھر دور کسی کوٹھری میں لمبی لمبی آہوں میں گھٹی ہوئی کراہوں میں کسی بچے کی چیخیں اور کسی عورت کے سہاگ بھرے ہاتھوں کے دھموکے گونج جاتے تھے۔

پھر باوا جان کی ایک پرانی خواص نے از سر نو لڑنا شروع کیا تو کوئی مثل نہ چھوڑی۔

اردو اسٹاک ختم ہونے پر جب تلگو کہاوتوں کی باری آئی تو بشارت پھر غفلت سے چونکا۔

وہ اندھے کنویں میں پڑا تھا۔ چاروں طرف پٹا پٹ اندھیرا۔ شاید اسے کوئی بھولے سے قبر میں رکھ گیا۔

(3)

سارے جہاں سے دھتکارے ہوئے بشارت چچا کی دوستی اختر پاشا سے کب ہوئی۔

کچھ ٹھیک سے یاد نہیں۔ اختر کو صرف اتنا یاد تھا کہ دوسرے چچاؤں کے برخلاف انہیں
درانڈے کی سیڑھیوں سے آگے کبھی نہ بڑھنے دیا۔ آتے جاتے نوکروں کی خوشامد کرنے پر
ایک آدھ پیالی چائے مل ہی جاتی۔ سیڑھیوں پر شہنشاہی کرنے کا حق بھی بڑی تگ و دو کے
بعد ملا تھا۔ نہ جانے کیسے اپنی خوف ناک صورت کا خوف دور کرکے انہوں نے اپنے آس
پاس کھیلتے ہوئے بچوں سے دوستی کرلی اور کہانیاں سنانے لگے۔ بڑے مزے دار، نئی نئی
کہانیاں، جو اختر کے ننھے سے دماغ میں جم کر رہ گئی تھیں۔ چچا کی کہانیوں میں اچانک ٹوٹ
پڑنے والی آفتوں کی وہ بھرمار ہوتی تھی کہ بچے دم سادھے بیٹھے رہتے تھے۔ لیکن جب کہانی
عروج پر پہنچ جاتی تو وہ اچانک اپنے گردے کے درد یا بیڑی کی طلب کا دکھ لے بیٹھتے۔ اختر
نے اپنی ذرا سی عقل کسوٹی پر پرکھ بشارت چچا کو اتنے بڑے فنکار کا درجہ دیا تھا جو وہ اب
شعوری طور پر اپنے آپ کو بھی نہ دے سکی تھی۔ یہ نیا بھید بھی اختر پر چچا نے آشکارا کیا
تھا کہ اس کے کانوں کے بے کار سوراخوں میں کوئی دکان لگائے بیٹھا ہے۔ یہ دکان دار
صرف چچا سے سودا چکاتا تھا۔ "چچا آج برفی لے دیجئے دکان دار سے۔" وہ خوشامد کرتی
تھی۔ مگر ایسی پھٹیچر دکان تھی کہ جب دیکھو گڑ کے مرمرے یا مونگ پھلی کے گھنے دانے
چلے آرہے ہیں۔ بعض وقت تو وہ خوب ضد کرتی تھی۔ بار بار چچا دکان میں جھانک کر دیکھتے
تھے۔ "آج دکان بند ہے۔" اسے یقین نہ آتا تھا۔ بار بار آئینے میں کان کو دیکھتی۔ چپکے چپکے
دماغ میں ہونے والی آہٹوں کو سنتی۔

یہی وجہ تھی کہ آج جب اپنی دانست میں اختر افسانہ نگاری کے سمندر کی لہروں میں
بہتی دور دور تک پہنچ رہی تھی، اس کی دوستی چچا سے اور بڑھ گئی تھی۔ بشارت چچا اپنی
روح اور جسم کی ساری گندگیوں سمیت بکواسی شعر کہتے تھے تو وہ بڑے صبر کے ساتھ ان
کے پاس سیڑھیوں پر بیٹھی سنا کرتی۔ اردو غزل کو گوندھنے کے بعد عاشق کا جو سراپا بنتا ہے
چچا وہی تشنہ دہن، سوختہ تن، نیم بسمل، گردش دوراں کے گھائل نامراد تھے۔ ان کے چہرے
پر وہ شب دیجور چھائی ہوئی تھی جس کی سحر عاشق کا وہم ہوتی ہے۔ ان کے جسم کا خون
رنگ ہو کر کبھی کا اڑ چکا تھا۔ ہر شعر میں وہی چچوڑی ہوئی ہڈیوں جیسی گھناؤنی بات، جو اس
سے پہلے شعر میں ہوتی۔ شب ہجر کی ظلمتیں ہیں تو معلوم ہورہا ہے کہ ریل کسی غار میں چل
رہی ہے جس کا کنارہ ہی نہیں آچکتا۔ اور جفا پرور محبوب ہے کہ کھیرے ککڑیوں کی بجائے

ان قلقوں پر نمک چھڑک رہا ہے مگر وہ ایسے سخت جان کہ قبر میں سے بھی بک بک کیے جارہے ہیں۔ پھر رقیبوں کی لگائی بجھائی تھی کہ ممانی بیگم کو مات کیے دیتی تھی۔ در در کی ٹھوکروں نے انہیں اتنی مہلت بھی نہ دی تھی کہ سڑک پر خوبصورتی کے مفت بٹنے والے جلوے ہی دیکھ لیتے۔ زندگی میں محبوبہ چھوڑ ساری روئی بھی نہ ملی جس کا سراپا لکھتے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں کوئی صاف تصویر نظر نہ آتی تھی۔ بس ایک ستم پیشہ طوائف تھی جو رقیبوں کے حلقے میں بیٹھی ان کے لیے دار و رسن کے تحفے بھجوایا کرتی۔ اگر بشارت چچا کو ذرا بھی حواس ملتے تو شاید انہیں معلوم ہوجاتا کہ یہ دل کی پکار نہیں پیٹ کی سسکیاں تھیں۔ اختر پاشا کو وہ بڑی آسانی سے سمجھا دیتے کہ وہ کون سی محبوبہ ہے جو ان کی ازلی پیاس کو نظر انداز کرکے بھر بھر جام رقیبوں کو دیے جاتی ہے۔ وہ کون سا جلوہ تھا جسے لب بام دیکھنے کے لیے ان کی بنئیں چھوٹی جارہی تھیں۔

شاعری کرنے کی بجائے نوکری ڈھونڈو میاں۔" لوگ مشورہ دیتے تھے مگر صرف اردو پڑھے لکھوں کے لیے تعلق داری کہاں سے آجاتی! ایک بار سنا کہ چپراسی کے لیے درخواست دے آئے ہیں تو تایا صاحب نے مارتے مارتے چھوڑا۔ اپنا ناس تو مارا ہی تھا اب خاندان کی لٹیا ڈبونے چلے۔

آپا کی گود سے اترتے ہی انہیں تپتا ہوا صحرا ملا۔ دم توڑنے والے پیاسے کی طرح وہ کبھی ادھر دوڑتے کبھی ادھر۔ ہر طرف پانی کی گنگناہٹ سنائی دیتی اور وہ ناخنوں سے ریت کریدتے جاتے تھے۔

اختر کو بشارت چچا ان لوگوں سے نظر آتے تھے جو صحبت شب کی جلی ہوئی شمعوں کی دلیل بنے ہوئے ہیں۔ خالی جام کا تلچھٹ۔ دائمی فاقوں اور ذلت کے احساس نے ایسا روندا تھا کہ اب ان کے ویران چہرے پر مسکراہٹ کی ہریاول بالکل نہ اگتی تھی۔ انسان کی قوت برداشت بھی عورت کے دل کی طرح گہری ہوتی ہے۔ جس کی اور چھور کہیں نہیں ملتی۔

جس دن آنکھوں میں چلنے والے بھوک کے جھکڑ تھم جاتے اور چاپلوسی سے کمائے ہوئے دانے گھیائیوں کی طرح اترا اترا کے مٹکنے لگتے تھے تو ان کے دماغ میں بڑی خوبصورت باتیں گھس آتی تھیں۔ بڑے بڑے اذیت ناک دکھ وہ ان لمحوں میں "اونہہ" کرکے ٹال جاتے تھے۔

پندرہ برس ہوگئے جب شوکت نواب کی موت کے بعد انہیں نوٹے نھکیرے کی طرح

ڈیوڑھی سے پھینک دیا گیا تھا۔ دونوں وہ ماموں چچاؤں کے ہاں رلتے پھرے۔ لڑکی ہوتے تو ایسا بے مروت کوئی نہ تھا۔ کہ اتنے بڑے بڑے بنگلوں میں ذرا سی پناہ دینے پر تیار نہ ہوتے۔ پالکڑوں اور نوکروں کی فوجیں آخر پلا ہی کرتی ہیں۔ مگر ان کا نام نواب بشارت علی خاں تھا۔ وہ کسی بڑے عہدے دار کو چچا کہتے' کسی کو بڑے بھائی پکارتے۔ ہر طرف سے فٹ بال کی طرح لوگوں نے انہیں لاتیں دکھائیں۔ لوگ خود کون سے اب نواب بنے بیٹھے تھے۔ یہ تو محض بھرم رکھنے کے لیے انہوں نے خوبصورت باتوں کے دوشالے اپنے پیوندوں پر ڈال لیے تھے۔ بس یوں کہو کہ بشارت چچا کی طرح ہائے روٹی سالن کی ہتیا نہ ڈالتے پھرتے۔ نوابی کی شراب پی جا چکی تھی اور اب خالی شیشے' بھرے دل لیے' سب بیٹھے رہ گئے تھے۔

دن بھر خالائیں اور ممانیاں کوڑی پھیرا کروا کے شام کو جھوٹن تھما دیتی تھیں۔ ایک پیالی چائے کے لیے لوگوں کی دہلیز پر بیٹھ کر گھنٹوں مزاحیہ قصائد' دشمنوں کی ہجو اور رقیبوں کی گالیاں تصنیف کرکے سنانا پڑتیں۔ مسافر خانوں کے شلنز میں' موٹر گراجوں اور ویران مسجدوں میں راتیں کاٹنا پڑیں تو شاعری نے بھی دوستوں کی طرح ہاتھ دکھا دیا۔ یاد بھی نہ رہا کہ دل میں پھیلے ہوئے یہ اونچے نیچے ٹیلے کسی شاعر کے کھنڈر ہیں۔

شراب رکھے رکھے سرکہ بن جاتی ہے۔ شاعر شاعر نہ بن سکے تو مرثیہ گو بن جاتا ہے۔ مگر بشارت چچا کے خمیر میں اور چیزیں بھی ملتی رہیں۔ در در کی دھتکار' ازلی بھوک اور نوابی دماغ کی نزاکت نے اس سرکے کو زہر ہلاہل بنا دیا۔ ایسا تیز کہ دور سونگھنے والا چکرا جائے۔ ان کا دل ابھی تک شاعر تھا' دماغ اپنی ناک اونچی رکھنے والا نواب اور پیٹ ایک رذیل بھکاری۔ جب تینوں مل کر رونے بیٹھتے تھے تو چچا اس زمین کی طرح تھرا جاتے تھے جہاں ہائیڈروجن بم گرا ہو۔ پھر وہ شاعر کی زبان' (جو زندگی بھر کسی معشوق کے دیدار کے بغیر اس کے عشق میں چلا کرتی ہے) انہیں بھیک کے دل نشیں پیرائے سکھا دیتی۔ بھکاری جسم اپنی کھسیاہٹ کے لیے کسی کے دروازے پر جاتا تھا تو ان کے دماغ کا نواب کونے میں دبکا آٹھ آٹھ آنسو روتا۔ چچی ماں ان کی بدنیتی پر لعنت ملامت کرتیں اور وہ بھول جاتے۔ تایا صاحب سب کے سامنے تایا کہنے سے منع کرتے اور وہ مان گئے۔ ان کا چچا زاد بھائی قادر ماما کی آواز بنا کر اندر سے کہہ دیتا تھا کہ وہ گھر پر نہیں ہے' لیکن دوسرے دن وہ پھر ان سب کو دیکھنے کے لیے بے قراری سے دوڑے جاتے۔ پندرہ برس کے تجربوں نے انہیں سکھا دیا

تھا کہ کس گھر میں کون مہربان ہستی ہے اور کسے دیکھ کر دم دبا کے بھاگنا چاہئے۔ عزیزوں رشتہ داروں سے بھی کیا شکوہ۔ دراصل خدا کے ہاں بھی ان کی زندگی کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ جب کبھی جعفر پاشا انہیں گالیاں دے کر نکال دیتے یا بڑی ممانی ماں ان پر جھنجھنا چرانے کا الزام لگاتیں تو وہ ایک دیا سلائی ڈھونڈتے پھرتے۔ اتنی بڑی دیا سلائی جس سے ساری دنیا میں آگ لگائی جاسکے۔ ان کے اندر دم توڑنے والا شاعر جاگ پڑتا۔ جھنجلا کے وہ خاندان کے ڈھکے چھپے رازوں کی مثنویاں نوکروں کو سنانے بیٹھتے تو ہر جگہ سے دیس نکالا مل جاتا۔

ایسے وقت وہ پچاسوں بار حسین ساگر کے کنارے دوڑے۔

بس اب حد ہوگئی۔ آج چھپکلی تو کوئی گرم زمین پر پاؤں جلانے والا لے جائے گا اور پھٹی ہوئی شیروانی کوئی بھکارن اپنے بچے کو اوڑھا کے جاڑے کاٹ دے گی۔ خود کشی سے پہلے وہ ہمیشہ اپنے کپڑے اتارنے کا ارادہ کرلیتے تھے۔ ہمیشہ یہی خیال آتا کہ ان کپڑوں کی ضرورت تو ابھی دنیا کو ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے وہ اسی لیے مر رہے ہوں کہ یہ کپڑے اب کسی اور کی قسمت جگانے والے ہیں۔ کنارے کی ریلنگ پر جھکے وہ اس لمحے کا انتظار کرتے تھے جو ان کا آخری لمحہ ہوگا' تو عجیب عجیب سی باتیں یاد آتیں۔ کبھی سوچتے پارک کا ایک چکر لگا آئیں۔ یہاں تو آئے دن خود کشیاں ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کوئی پاکٹ یا جوتے چھوڑ مرا ہو۔ لیکن ہر بار مایوسی ہوتی۔ مرنے والوں کو یہاں اپنی وراثت چھوڑنے کا خیال ہی نہ آتا تھا۔ ساگر کے پانی میں ڈوبنے والا سورج دلوں کی امنگیں جگا دیتا تھا۔ پارک میں چہل پہل بڑھ جاتی۔

کوئی تنہا کھڑی ہوئی خوبصورت لڑکی اپنی سہیلی کا ہاتھ تھام کر کہتی۔

"ہائے لکشمی کتنا پیارا منظر ہے۔ اسے تو کرشنا بھی دیکھ اطمینان دلا دیتی۔

تو کیا کل بھی سورج نکلے گا۔ کل بھی دنیا مسکرا سکے گی۔ ہٹاؤ اب کون مرے۔ بشارت کا شاعر مارے کاہلی کے ٹال جاتا۔ اس وقت تو کچھ شعر پیچھے پڑ گئے ہیں۔ چل کر اختر پاشا کو سنا آئیں۔

(4)

اس دن اختر بہت خوش تھی۔ ایک مقامی رسالے نے اس کے مضمون کا معاوضہ

پچاس روپے دیا تھا۔ اتنے پیسوں کی کسے پروا تھی۔ مگر مضمون کی یہ قدر اسے اڑائے اڑائے پھر رہی تھی۔ صبح سے فون پر سب کو یہ خبر سناتے سناتے ہاتھ دکھنے لگے تھے۔

اب ذرا حواسوں میں آئی تو کھانے کی میز پر سب کو اپنے ادبی منصوبوں سے آگاہ کرنے بیٹھی تھی کہ بشارت چچا کا بلاوا آگیا۔ اس صبر کے ساتھ جو غصہ اور بے پناہ جوش میں کام آتا ہے' اس نے احسنی کی طرف دیکھا مگر صرف احسنی ہی کیا' سب کی طنز بھری نظریں اس کی ادبی شخصیت کا مذاق اڑا رہی تھیں۔

"جایئے اختر صاحبہ۔ غالباً" آپ نے سن لیا ہوگا کہ گیٹ پر ہندوستان کا ایک مایہ ناز شاعر آپ کو یاد کررہا ہے۔"

قادر بھائی نے چائے کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیل کر اسے سنایا۔

"کھاتے پیتے وقت ان کا نام نکو لو جی۔ میری طبیعت مالش کرنے لگی۔" قادر کی بیوی نے التجا کی۔ اس میں شکایت کرنے سے زیادہ یہ جتاتا تھا کہ آج کل اس کا جی متلایا کرتا ہے۔

"ہاں بھئی کھانے کی میز پر ایسی گندی باتیں مت کرو" چھوٹی بھابی نے بھی ناک سکوڑی۔

اختر پاشا اس ماں کی طرح محجوب سی بیٹھی تھی جس کی اولاد ناخلف نکل جائے۔ اس بات پر سب اس کی ہنسی اڑاتے تھے کہ اختر بشارت کو سچ مچ اپنا چچا سمجھتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو اپنے ساتھ انہیں کھانا کھلائے' اپنی جیب سے ان کی تنخواہ مقرر کردے۔ ان کی شاعری پر ایک آدھ مقالہ لکھ ڈالے۔ بلکہ قادر بھائی تو یوں بشارت کی خاطر مدارت کرتے دیکھ کر پیش گوئی کرچکے تھے کہ اختر ضرور کمیونسٹ ہوجائے گی۔

ایک گھنٹے کے بعد جب اماں غریبوں اور کتوں کے ناشتے سے بھی نبٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں تو اختر نے ایڑیوں کے بل اچک کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بشارت چچا تیز دھوپ میں سیڑھیوں پر بیٹھے اس کا انتظار کررہے تھے۔ یوں چچا کو دھوپ میں سکھانا اچھا نہ لگتا تھا اور وہ خود بھی ان کے پاس جا بیٹھتی۔ پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی سنائے جاتے۔

"میرے بال جانے کیوں جھڑنے لگے ہیں۔ بعض اوقات تو آنکھوں میں کچھ سوجھائی نہیں دیتا--- کل میں حسین ساگر کے کنٹے پر گیا تھا۔ وہاں دو شعر ہوگئے مگر کوئلہ ہی نہ ملا

کہ دیوار پر لکھ لیتا۔ ہاں پاشا بیگم' آپ نے کاغذ اور پنسل دینے کا وعدہ کیا تھا نا! تو رات کو آپ کے ہاں پھر بگھارے بینگن پکے تھے۔ قسم سے مجھے رات بھر نیند نہیں آئی کہ جانے آج آپ نے کیا کھایا ہوگا۔"

وہ کوئی جواب نہ دیتی۔ ان کے منہ سے نکلتی ہوئی بدبو کی لپٹیں' پسینے اور میل میں اٹے ہوئے کپڑے اور سڑے سیتا پھلوں کی طرح جھاگوں میں ڈوبے ہوئے دانت دیکھ کر اختر کو بھی بھابی کی طرح ابکائیاں آنے لگتی تھیں۔ اسی لیے وہ ذرا دور نئی فلمی دھن گنگنائے جاتی۔ بشارت چچا کو یہ اطمینان بہت کافی ہوتا کہ ان کے جی کی بھڑاس کوئی سن سکتا ہے اور دل میں سینت سینت کر رکھی ہوئی ساری پونجی وہ لٹا دیتے تھے۔

لیکن آج اختر سخاوت پر جو اتری تو چچا کو اپنے کمرے میں بلا لائی۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ احسنی اور بگڑ لیں گی۔ پھر ایک پیالی چائے پلا کر بھی وہ مطمئن نہ ہوئی تو چچا کو معاوضے والی خوشخبری بھی سنا ڈالی۔ مزید یقین دلانے کے لیے پانچ نوٹ لا کر چچا کے سامنے رکھ دیئے۔

آج یوں اچانک بشارت چچا کو اپنی اس قدر دانی کا رتی بھر یقین نہیں آرہا تھا' اس سقے کی طرح کھسیائے جا رہے تھے جسے ہمایوں نے اپنے تخت پر لا کر بٹھایا تھا۔ خوشی کے مارے لرزنے لگے۔ کئی بار آنکھیں بھنچائیں اور ہونٹوں کی تھرتھراہٹ کسی طرح نہ رکی۔ جب سے ہنسی نے ان کا ساتھ چھوڑا تھا ان کی خوشی کا یہی عالم ہوتا۔

"بتایئے چچا آپ کو کتنے روپوں کی ضرورت ہے---؟" اختر کو یوں لگ رہا تھا جیسے آج سے پہلے وہ پیسے پیسے کو محتاج رہتی تھی۔

"آج تو ہم آپ کو انعام دیتے بٹیا۔" انہوں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "ان روپوں پر آپ کے چچا کا کوئی حق نہیں ہے۔"

شاید یہ زندگی کا پہلا اتفاق تھا جب انہوں نے کوئی چیز لینے سے انکار کیا۔ اسے چچا پر مزید لاڈ آنے لگا۔ جلدی سے روپے تکیے کے نیچے پھینک کر وہ باورچی خانے میں بھاگی کہ آج کوئی مزے دار چیز چرا کر انہیں کھلائے۔ مگر واپس آئی تو چچا اور روپوں میں سے کوئی نہ تھا۔ صرف وہی تو ایک رہ گئی تھی جو چچا کو چور نہ مانتی تھی۔ اپنی حماقت پر وہ پچھتانے لگی۔ چچا کے متعلق اپنے وہ سب دعوے جوتوں کی طرح منہ پر آن لگے' جو وہ دوسروں سے کیے جاتی تھی۔ خیر اس نے لمبے چوڑے جھوٹ گھڑ کے ایسی پیش بندی کردی کہ اس بات کی خبر

کسی کو نہ ہو سکی۔ ورنہ سب طعنے دے دے کر اسے مار ڈالتے۔

کئی دن گزر گئے۔ اختر کو یقین ہوگیا کہ چچا کا پنڈ اب ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔

جب شدت کی بھوک انہیں مارنے مرنے پر آمادہ کردیتی تھی تو وہ چھانٹ کر ایسے وقت ڈرائنگ روم میں گھس پڑتے جب ابا ملاقاتیوں کو وقت دیا کرتے ہیں۔ ان کی خاکسارانہ قدم بوسی کا جواب ابا بڑی سرد مہری سے دیتے۔

"اند جاؤ میاں، میں ذرا مصروف ہوں۔"

"مجھے ایک روپے کی ضرورت ہے بڑے بھائی۔ کل سے کھانا نہیں کھایا ہے۔"

اس وقت بشارت کو ایک روپیہ تو مل ہی جاتا اور ساتھ ہی ابا انہیں ٹھکانے لگانے کی ترکیبوں پر غور کرتے۔ اپنے دوستوں کو بار بار یقین دلاتے تھے کہ بشارت ان کا بھائی نہیں صرف ایک ملاقاتی ہے۔ اس کے بعد وہ مہینوں منہ چھپائے پھرتے۔ پھر ایک دن خبر آتی کہ کسی چوراہے پر وہ بے ہوش پڑے ہیں۔ فلاں تھانے پر ان کا چالان ہوا ہے۔ یا کسی مسجد میں پڑے بخار میں بھن رہے ہیں۔ مجبوراً کسی نوکر کو ان کی پرسش کے لیے بھیجا جاتا۔ تھوڑی دیر کے لیے سب ان کی نالائقیاں معاف کرکے اظہار ہمدردی کرنے لگتے۔ کئی دن تک ان کی یوں خاطر تواضع ہوتی جیسے اللہ میاں نے ان کی دیکھ بھال فرض کر دی ہو۔ زبردستی کھانا کھلایا جارہا ہے اور وہ شرما شرما کے بڑے تکلف سے انکار کررہے ہیں۔ انکی لاوارثی پر سب ایک دوسرے کو الزام دینے لگتے۔ کھانا تیار ہوتے ہی ممانی بیگم اصرار کرتیں کہ بشارت میاں پہلے کھالیں اور وہ اڑے رہتے کہ سب کے ساتھ کھاؤں گا۔ یہ ایک چھپی ہوئی بات تھی جو دونوں سمجھتے تھے اور دل میں رکھتے۔ ممانی بیگم بھی ایک کائیاں تھی۔ نوکروں کے ساتھ ان کی اوتھلی رکابی میں بھی دو چمچے خشکہ نکال کے ذرا سا سالن یوں ڈال دیتی تھیں جیسے پہاڑ کی چوٹی پر برف جمی ہو۔ اور سب کے ساتھ میز پر آبیٹھتے تو ان کے لمبے لمبے ہاتھوں کو کوئی نہ روک سکتا تھا۔ ممانی بیگم لاکھ چاہتیں کہ دسترخوان پر کوئی لمبی بات چھڑ جائے کہ بشارت کے تیز رفتاری سے دوڑنے والے انجن کو کچھ اسٹیشن بھی ملیں، مگر وہ ہر بات کا جواب اشاروں میں دیتے تھے یا سعادت مندی سے گردن جھکا دیتے۔ سب کے اٹھنے کے بعد وہ اکیلے بیٹھے انگلیوں کو چاٹ چاٹ کر دھوتے رہتے۔ خود ہی جھوٹے برتن اٹھانے کا ٹھیکہ لیا جاتا اور پلیٹوں میں لگے ہوئے چاول بڑی احتیاط سے دسترخوان کے کونے پر جمع کرتے جاتے۔ پھر دسترخوان کو سمیٹ وہ کسی کو مخاطب کیے بغیر سنا دیا کرتے۔

"دروازے پر مرغیاں چگتی ہیں، انہیں ڈال آؤں۔" سب ہی جانتے تھے کہ یہ دانے ون سا مرغ چگتا ہے؟

(5)

اختر کی کہانی کی وہ تعریف ہوئی کہ تخیل یار جنگ کی پرانی ڈیوڑھی میں چھپے ہوئے کبوتر اور چمگادڑیں گھبرا کے باہر نکل آئے۔ سلیقے سے ہنسنے اور احتیاط سے داد دینے کے اصول جانے کہاں بہ گئے۔ لوگوں نے اختر کو اپنے حلقے میں گھیر لیا۔ اتنے ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھے کہ وہ گھبرا گئی۔ کسے پکڑے کسے چھوڑے۔۔۔!

گھر آتے آتے یقین ہو گیا کہ وہ ان غیر فانی ادیبوں میں شامل ہو چکی ہے جو کبھی نہیں مرتے۔ کار سے اتری تو سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے بشارت چچا اس کی راہ تک رہے تھے۔ آج ایک دم اپنے آسمان کو لگ جانے والے قد کو جھکا کر اختر نے دیکھا تو چچا انتہائی کمینے نظر آئے۔ دھوکے باز، جی میں آئے کہ آج ذرا ان کی بے حسی پر لیکچر ہی پلا ڈالے۔ بھلا ان سے ملنے کے لیے اب وقت کہاں ملا کرے گا!

انتہائی بے زاری کے ساتھ کپڑے بدلے بغیر وہ سیڑھیوں پر جا بیٹھی۔ بشارت چچا رعشہ میں کانپ رہے تھے۔ الجھی الجھی سانسیں بتا رہیں تھیں کہ کئی دن کے بھوکے ہیں۔ کئی بار جی کی بات ان کے ہونٹوں پر تھرتھرائی مگر باہر نہ آ سکی۔

"پچاس روپے اتنی جلدی ختم ہو گئے چچا!" ان کی صورت پر برستے ہوئے سوال کو دیکھ کر اختر سے نہ رہا گیا۔

کانپتے ہاتھوں انہوں نے کپڑے کی ایک میلی سی گانٹھ جیب سے نکالی، کئی تہوں میں اندر مڑی تڑی ایک کاغذ کی پڑیا رکھی تھی۔ پھر ایک کے بعد ایک، پڑیاں کھلنے لگیں۔ بڑی احتیاط کے ساتھ وہ یوں کاغذ چھو رہے تھے جیسے اندر جگنو بند کر کے لائے ہوں، ذرا سی بد احتیاطی سے نکل بھاگیں گے۔ اندر سے کئی تہوں میں مڑے ہوئے پانچ نوٹ نکلے۔

"آپ کے روپے میں کھانے کے لیے تھوڑی لے گیا تھا۔" انہوں نے بڑی شرمندگی سے کہا۔ آواز ہزار ٹکڑوں میں کٹ کٹ جاتی تھی۔

"اس دن تو میں نے ایسے ہی سوچا تھا کہ پچاس روپے کوئی ہماری غزل کا معاوضہ

بھی دیتا۔ اور پھر میں نے--- یہ روپے اپنی جیب میں ڈال لیے۔ جیسے وہ میرے ہی تھے۔"

اختر بڑے صبر کے ساتھ چچا کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی' جس پر سوائے پاگل پن کے اور کچھ نہ تھا۔

"مگر اختر پاشا' آپ جانے کیسے اتنے روپوں کا بوجھ اٹھا لیتی ہیں۔ میں تو ادھ موا ہو گیا ان پانچ دنوں میں۔"

جب کچھ ملنے کی امید ٹوٹ گئی تو وہ دیوار کا سہارا لے کر اٹھے اور اختر کے سلام کا انتظار کیے بغیر اسے دونوں ہاتھوں سے زندگی بھر کھانے کی دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔

پہلے تو اختر کو ان کی بے وقوفی پر ترس آیا۔ پھر اس نے سوچا۔ اونہہ! اتنے احمقوں کی کہیں کہانیاں لکھی جاتی ہیں---؟

○

موم کی مریم

آج بھی اندھیرے کمرے میں لیٹا میں خیالی ہیولوں سے کھیل رہا تھا۔
اور جب بھی اندھیرا چھا جاتا ہے تم نہ جانے کہاں سے نکل آتی ہو جیسے تم نے تاریکی کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہو' اور مجبوراً مجھے جلتے ہوئے سگریٹ کی راکھ کی طرح تمہیں بھی زمین پر جھٹک دینا پڑتا ہے۔
میں نے کبھی تمہارے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ کبھی تمہارے اور نظمیں نہیں لکھیں۔ کبھی تمہاری یاد میں تارے نہیں گنے۔ پھر کیوں میں تمہیں یاد کئے جاؤں ــــــ؟
زندگی میں تم سے اتنی دور رہا کہ کبھی اس رنگ و بو کے سیلاب میں غرق نہ ہو سکا جو تمہارے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہمارے بیچ میں جھوٹی عقیدت اور مضحکہ خیز احترام کی خلیج حائل رہی۔ پھر آج تم اپنی آہوں اور سسکیوں سے کون سے مرے ہوئے جذبے جگانا چاہتی ہو ــ؟

آج صبح عائشہ کے خط سے مجھے تمہاری موت کی خبر مل چکی ہے۔ مگر میں اس موت پر اظہار افسوس نہ کر سکا۔ روز نہ جانے بنا برسے کتنے بادل گزر جاتے ہیں۔ کتنے نغمے ساز کے اندر ہی دم توڑ دیتے ہیں' کتنے انسان ایک لحہ کی خوشی ڈھونڈتے ڈھونڈتے مرجاتے ہیں۔ پھر تمہاری موت تو میرے سامنے کتنی ہی بار ہو چکی ہے' اگرچہ مادی طور پر تم چلتی پھرتی نظر آتی تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے آج میرے کمرے میں آ بیٹھی ہو۔
جب سے میں نے عائشہ کا خط پڑھا ہے میرے خیالات کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولتے پھرتے ہیں اور نہ جانے کیوں بہت سی دھندلی یادیں جھلملانے لگی ہیں اور اس اندھیرے اجالے میں بہت سے چہرے خلط ملط ہو گئے ہیں۔

مگر میں اس وقت تمہارے خیالی وجود سے باتیں نہیں کر رہا ہوں۔ کیونکہ تمہاری جانی پہچانی سسکیاں مجھے تمہاری موجودگی کا یقین دلا رہی ہیں' تو میں اسے واہمہ کیسے تصور کر سکتا ہوں ـــــ؟
تمہارا اور اندھیرے کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔ تم زندگی بھر جہاں جہاں بھی گئیں چراغ گل

ہوتے گئے۔ تاریکی کے حلقے تمہیں اپنے گھیرے میں اسیر کئے رہے۔ جس طرح مریم کی تصویر کے گرد مصور نے نور کا ہالہ کھینچ دیا ہے۔ عصمت، تقدس اور معصومیت کی لکیریں، جن کے اندر پاک مریم کی روح کو محصور کر دیا گیا ہے۔

اس وقت بھی جب تمہارے مستقبل کی طرح کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ تمہارے آنسو یوں چمک رہے ہیں، جیسے پرامید بحرین نے دریا کی سطح پر چراغوں کی قطار چھوڑ دی ہو۔ میرے کمرے میں تمہارے آنسوؤں نے اجالے کی امید قائم رکھی ہے---- ہم مشرق کے مرد صدیوں سے اپنی عیش گاہوں میں تمہارے اشکوں سے جشن چراغاں مناتے آئے ہیں----

تمہارے متعلق لوگوں نے کہانیاں مشہور کر رکھی ہیں وہ بالکل سطحی تھیں اور اسی لئے میں نے حقیقت کی سطح پر اتر کر تمہیں سمجھنا چاہا تھا۔ تم کیا تھیں! اماوس کی رات کو ٹوٹنے والا ایک ستارہ جو اپنی آخری جھلک سے بہت سے دلوں میں امید کی کرن چمکا کر غائب ہو جائے---- ایک تند لہر جو اپنے زعم میں ساحل کے پرخچے اڑا دینے کے ساتھ خود بھی مٹ گئی ہو۔

آج جب تم اپنے گواہوں کی لمبی فہرست سمیت خود ہی میرے کمرے میں آگئی ہو تو مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ تم ایک عام سی لڑکی ہونے کے باوجود دوسروں سے اس قدر مختلف تھیں۔ تم ایک مسحور کرنے والا جادو بن گئی تھیں جو کتنے ہی خریداروں کو کھینچ لایا۔ مگر سونگھا ہوا پھول سمجھ کر سب واپس چلے گئے۔

دوکاندار کے نزدیک وہ چیز کتنی حقیر ہو جاتی ہے جسے گاہک الٹ پلٹ کر پھر دکان پر رکھ جائے---- شیشے کے کیس میں بند رہنے والی گڑیا---- آج تم اتنی صاف صاف باتیں سن کر حیران ہو رہی ہو۔ جبکہ تم نے اپنے آس پاس کے شیش محل چکنا چور کر ڈالے تھے اور سماج کی کھینچی ہوئی لکیروں پر چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک بار تم سب لڑکیوں کو آنگن میں دھماچوکڑی مچاتے دیکھ کر امی نے کہا تھا۔

"او نہ مت روکو نگوڑی ماریوں کو---- کنواری لڑکیاں برساتی چڑیاں ہوتی ہیں۔ کون جانے کل کس کا ڈولا دروازے پر کھڑا ہو گا۔" اس وقت اخبار پڑھتے پڑھتے میں نے تمہاری زندگی کا پورا فلم دیکھ ڈالا تھا۔

جب تم کسی ناصر یا شاہد کلرک سے بیاہی جاؤ گی اور آنسو پونچھتے ڈولے میں سوار کرائی جاؤ گی۔ پھر ہر سال ایک ننھے منے کی پیدائش میں اضافہ ہوتا رہے گا اور ساتویں یا آٹھویں ننھے کی پیدائش پر تپ دق کا شکار ہو کر مر جاؤ گی۔ ہر لڑکی انہی لکیروں پر دوڑتی آئی ہے۔ مگر تم نے اپنی

انفرادیت سے ایک دوسرا راستہ ڈھونڈنا چاہا جس کی سزا میں موت و زندگی تم پر حرام ہو گئی۔

تم منجھلے چچا کی دسویں یا گیارھویں اولاد تھیں---- پھر نامراد لڑکی---- "اونہہ لڑکی ہے تو کیا ہوا-- نصیب اچھے ہوں--- لڑکے کون سا فیض پہنچاتے ہیں---- ماں باپ کی موت پر آنسو بہانے والی تو بیٹی ہوتی ہے۔"

اور اپنی موت کی نوحہ گر کے پیدا ہوتے ہی کسی نے تمہیں خوش آمدید نہ کہا۔

اپنے اردگرد کے ماحول نے تمہیں زیادہ حساس بنا دیا۔ حقارت کی نظروں نے خودی کا احساس بیدار کیا اور تم نے کچھ کرنے اور کچھ پانے کی قسم کھالی۔ تمہارے متعلق بدنامیاں اور سرگوشیاں بڑھتی گئیں۔ جاہل' بددماغ' بدصورت اور مغرور---- دن بھر تمہیں ان ہی خطابوں سے یاد کیا جاتا۔ مگر تم ایک ننھی سی چڑیا کی طرح اترا اترا کر کہتی رہیں---- جو میرے پاس ہے وہ رانی کے محل میں بھی نہیں۔

اسی انانیت پسندی سے تم ایک ایسا شعر بن گئی جس کے غالب کے شارحین کی طرح ہر ایک نے الگ معنی نکالنا چاہے' مگر پھر بھی بہت کم حقیقت کی تہہ تک پہنچ سکے۔

اور میں نے بہت دور ہو کر بھی تمہیں سمجھنا چاہا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے دوسرے مردوں کی طرح تمہاری دوشیزگی کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا۔ کبھی اس قدر نزدیک نہیں آیا کہ تمہارے تنفس کی رفتار سے کوئی راز پا سکوں۔ پھر بھی میں نے اس شعر پر کافی ریسرچ کی' دماغ کی لیبارٹری میں دو سال تک تجربے کئے مگر کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

ایک بار مجھے اپنی جانب جھکتے دیکھ کر تم نے کہا تھا:

"احمد بھائی! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں' اور یہ نہیں چاہتی کہ کوئلوں کی دلالی میں آپ بھی اپنے ہاتھ کالے کر بیٹھیں----" مگر یہ کتنا بڑا حزنیہ ہے کہ تم نے بہت سوں کو کوئلوں کی دلالی سے بچانے کی خاطر اپنے منہ پر کالک مل لی تھی تاکہ ان کے سفید دامن سیاہی سے ملوث نہ ہوں---- تم میری بہت عزت کرتی تھیں---- ایک نوجوان مرد کی---- جو تمہارے ذرا سے سہارے پر آگے بڑھنا چاہتا تھا--- جس نے تمہاری اٹھارہ سال کی زندگی میں مسلسل فریب دیئے تھے' جس نے تمہیں منزل کے قریب لا کر بھٹکا دیا تھا۔ بدنامی کی کوٹھڑی میں دھکیل کر ہر دروازہ بند کر دیا تھا۔ پھر تم نے اپنی رہی سہی عزت کی دھجیاں بکھیر ڈالیں اور بیچ چوراہے اپنے سب ظاہری لباس اتار ڈالے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ تم میری عزت کرتی رہیں اور میں تمہیں سمجھنے میں اتنا منہمک ہو گیا کہ جذبات کے انجکشن قطعی بے اثر ہو گئے ورنہ ممکن تھا کہ

ایک دن میری خودداری اور عزت تمہارے قدموں میں پڑی بخشش کی طلبگار ہوتی اور تم اطہر کی طرح مجھے ایک چٹان پر چھوڑ کر کہتیں:

"میں نے تمہیں پانے کے لئے بہت سی ٹھوکریں کھائیں مگر تمہارے چھونے سے پہلے اتنی بلندی پر پہنچ گئی کہ جب تم وہاں پہنچے میں سراب بن چکی تھی۔"

گھبراؤ نہیں۔ تم نے یہ الفاظ اطہریا ریاض سے خود نہیں کہے مگر آج تک تم نے کون کون سی باتیں زبان سے کی ہیں تم تو اس گونگی کی طرح ہو جسے اپنا مفہوم ہمیشہ عملی طور پر سمجھانا پڑتا ہے۔

صرف اٹھارہ سال کی زندگی میں تم نے اتنی ساری باتیں کیسے کہہ لیں۔

بظاہر تم کتنی معمولی تھیں------ چھوٹے چھوٹے کاندھوں تک لہرائے ہوئے بال جن کی باریک باریک آوارہ لٹیں چہرے کے گرد ہالہ سا بنائے کانپتی رہتیں۔ معمولی سا قد------ دبلا پتلا دھان پان جسم جیسے تیز ہوا کے جھونکے بھی تمہیں اڑا کر لئے جائیں گے، جیسے تمہاری جانب ہاتھ بھی بڑھایا تو چھوئی موئی کی طرح کملا جاؤ گی------ ایک واہمہ سی------ ایک ادھورا خاکہ------ کتنے ہلکے ہلکے تھے تمہارے خدوخال پتلے خمیدہ لب جو ہمیشہ سردمہری سے بند رہتے، ہر چیز کو تجسس سے دیکھنے والی ہمدرد آنکھیں جو اپنے سارے گناہ آشکار کرنے کو تیار نہیں اور اسی خیال سے بات کرتے وقت بار بار بند ہو جاتیں، تاکہ ان کی گہرائیوں کا پتہ نہ لگا سکے۔ اور ہر لحہ بدلنے والا رنگ، جو کبھی شعلے کی طرح دہکنے لگتا، کبھی راکھ کی طرح میلا پڑ جاتا۔

اور جب باتیں کرتیں تو تمہارے خدوخال میں کوئی تبدیلی نہ آتی۔ کتنی مشکل بات تھی۔ تمہارے چہرے سے کسی بات کا اندازہ لگانا۔

اس معمولی سی شکل و صورت ہی نے تمہیں گھر میں ایک ناقابل التفات چیز بنا دیا تھا۔ اپنی خوبصورت سعادت مند بہنوں کے مقابلے میں تمہاری کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ خرید و فروخت کے اس بازار میں صرف اچھی صورت والی لڑکی ہی فائدہ اٹھاتی ہے------ اور یہ خیال چچا اور چچی کے لئے سوہان روح تھا۔

مجھے آج سے تین سال پہلے والی جاڑوں کی ایک صبح یاد آ رہی ہے۔

تم اس وقت نما کر آئی تھیں۔ نسرین اور عائشہ کے ساتھ صحن میں بیٹھی، سوئیٹر کا ایک نمونہ بنا بنا کر ادھیڑ رہی تھیں۔ نومبر کی لطیف دھوپ آنگن میں بکھری ہوئی تھی۔ چچی نیچے بیٹھی

نئے لحافوں میں دھاگے پرو رہی تھی۔ اس وقت تمہارے گلابی دوپٹے' بھیگے بال اور نکھرے ہوئے رنگ کو دیکھ کر بھی مجھے کوئی شعر یاد نہیں آیا۔ کوئی شے۔ دماغ میں نہیں ابھری۔ عائشہ' نسرین اور فرزانہ کے فروزاں حسن نے وہاں تمہارے چراغ کو ٹمٹمانے نہیں دیا----- کتنی کمتر تھیں تم اپنی مغرور اور اپنے حسن پر خود ہی مرمٹنے والی بہنوں کے حلقے میں---- اس وقت میں نے سوچا تھا کہ حسن کے اس ہنگمٹ میں تمہاری کہانی کتنی مختصر اور پھیکی ہو گی۔

ان ہی دنوں مسلسل بیکاری نے مجھے نئی نئی راہوں سے واقف کر دیا تھا اور گھر سے بہت دور ایک ہڑتال کے سلسلے میں گرفتار ہوا تھا تو عائشہ کا خط پڑھ کر پہلی بار تمہاری جانب متوجہ ہوا تھا---- تم لڑکیوں کو خط لکھنے کو بھی تو کوئی بات نہیں ملتی۔ عائشہ کے خط بھی اسی کی طرح خوبصورت اور معصوم ہوتے' جن میں وہ ابا کی ناراضگی سے لے کر خاندان کی اہم تقریبوں میں آنے والی عورتوں کے کپڑے' زیوروں کے ڈیزائن اور اسکول کی سہیلیوں کے رومان تک------ سب کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتی۔ ساتھ ہی وہ مجھے بھی ایسا ہی مزے دار لمبا خط لکھنے کی ہدایت کرتی------ میری بے وقوف بہن نہیں جانتی تھی کہ میں رومانوں' سرگوشیوں اور رنگینیوں کی دنیا سے کتنی دور تھا مگر وہ میری مسلسل خاموشی کے باوجود ایک ہنگامہ پرور گھر کے کمرے میں بیٹھی بار بار منہ پر جھک آنے والی لٹوں کو پیچھے جھٹک کر لکھتی رہی-----

"آپ نے ایک اور خبر سنی بھائی جان؟ قدسیہ کے یہاں چھوٹی خالہ امجد بھائی کا پیغام لے کر گئیں تو قدسیہ نے خود آ کر ان سے کہہ دیا کہ وہ امجد سے شادی نہیں کرے گی۔

سنا ہے چچا ابا زہر کھانے والے ہیں اور سارے خاندان میں تھو تھو ہو رہی ہے۔"

اس دن بہت دنوں کے بعد میں جیل کی تنہا کوٹھڑی میں مسکرا سکا۔ اس دلیرانہ جرات پر میں نے غائبانہ طور پر تمہاری پیٹھ ٹھونکی تھی اور محسوس کیا تھا کہ جس خول میں ہم اپنے آپ کو لپیٹے ہوئے ہیں وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ رہا ہے۔ جی چاہا کہ فوراً چچا ابا کو زہر کی ایک شیشی بھیج دوں تاکہ وہ صرف ارادہ کر کے ہی نہ رہ جائیں۔ تم پھر ایک بار میرے سامنے آئی تھیں۔ جھنجھلا کر سوئیٹر ادھیڑتی ہوئی۔

پھر میں اس واقعے کو بھول گیا۔ عائشہ اپنے خطوں میں لکھتی رہی کہ تمہارا اور ریاض کا رومان چل رہا ہے------ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے محبت کو کامیاب بنانے کی کتنی کوشش کی۔ لیکن ریاض تمہارے ہاں کا لے پالک تھا۔ تمہارے دسترخوان کے جھوٹے ٹکڑوں پر پلا تھا۔ پھر چچا ابا کو اس کی سن گن ملی تو ریاض گھر ہی

سے نہیں شہر ہی سے نکال دیا گیا اور تم نے بڑے تحمل سے محبت کی اس لاش کو دل کے قبرستان میں دفن کر دینا چاہا۔۔۔۔۔ لیکن شاید ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ مردار کھانے والے گدھ جو ایسے موقعوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں' اس لاش کو باہر کھینچ لائے' جی بھر کے اس سے لطف اٹھایا اور پھر اسے چیر پھاڑ کے پھینک دیا۔ تمہاری بیماری کو بڑے خوفناک معنی پہنائے گئے۔ یعنی یہ سب ریاض کی امانت کو ٹھکانے لگانے کے بہانے ہیں اور تم اپنے کمرے ہی میں نہیں پڑی رہتیں بلکہ ریاض کے ساتھ فرار ہو چکی ہو۔

یہ باتیں میں نے بہت دور بیٹھ کر سنیں اور ہر بات کو یقین کے خانے میں ڈالتا گیا۔ یہ کوئی ناقابل یقین بات بھی تو نہ تھی۔ بقول عائشہ کے تم اپنی اہمیت کا احساس دلانے کا فیصلہ کر چکی تھیں اور تم نے ساری دنیا کو ٹھکرا کے اپنی من مانی کرنے کا عزم کر لیا تھا۔۔۔ پھر تم جیسی محبت کی ماری لڑکیاں اس سے زیادہ اپنی اہمیت کا کیا ثبوت دے سکتی ہیں۔۔۔۔۔؟

اس کے بعد جب میں رہا ہو کر گھر آیا تو تم وقت کا ایک اہم موضوع بن چکی تھیں یا عائشہ کے الفاظ میں کچھ کر دکھانے کی دھن میں اپنا رہا سہا وقار بھی کھو بیٹھی تھیں۔

اس دوران میں تم اپنے ماسٹر سے بھی محبت کر چکی تھیں جو تمہیں پڑھانے آتا تھا۔ ایک سیدھا سادھا' خطرناک حد تک شریف انسان' جو اپنی مظلومی اور بے چارگی ظاہر کر کے دوسروں سے رحم کی بھیک مانگتا تھا۔

پہلے اس نے تمہیں شرافت اور عزت کے سبق پڑھائے۔ اپنی بے چارگی اور دکھ کے افسانے سنائے' اس کی محبوبہ نے اسے دھوکا دیا تھا۔ محض غربت کی وجہ سے ٹھکرا دیا تھا (یہ محبوباؤں کے دھوکا دینے کا دکھڑا بھی کتنا فرسودہ ہو چکا ہے؟) پھر اس کی پیاسی دنیا میں تم نے اپنی ہمدردی کے چند قطرے برسانا چاہے۔ اپنے طرز عمل سے اس کا دکھ کم کرنا چاہا' اپنے غم کی کہانی بھی اسے سنا ڈالی۔۔۔۔ پھر کورس کی کتابوں کو ایک جانب سمیٹ کر تسلی اور تسکین کے سبق پڑھائے جانے لگے۔

پھر تمہارا ماسٹر بیمار ہو گیا اور چچا ابا نے دوسرا ماسٹر رکھنا چاہا تو تم نے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ تم اسی ماسٹر سے پڑھنا چاہتی تھیں اور اس کی مزاج پرسی کے لئے اس کے گھر جانے پر مصر تھیں۔

یہ ساری باتیں گھر کے چھوٹے بچوں تک نے مجھے سنائیں۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ تمہیں اس ماسٹر سے محبت نہیں تھی' صرف ہمدردی تھی۔ یہ انسانیت' جذبہ ہی تھا جو تمہیں

ایک رات چپکے سے اٹھا کر ماسٹر کے گھر لے گیا اور جب تم ابھی دروازہ ہی کھٹکھٹا رہی تھیں کہ چچا ابا کے ڈنڈے کی ضرب سے بے ہوش ہو گئیں۔

پھر مہینوں گھر والے تمہارے سائے سے اچھوتوں کی طرح بچتے پھرے۔ گھر کی لمبی لمبی ناک والی عورتوں نے خاندان میں نکلنا چھوڑ دیا۔ چچا ابا نے وقت سے پہلے پنشن لے لی اور سارے خاندان کے ماتھے پر تم کلنک کا جھومر بن کر لہرانے لگیں اور بیچ آنگن میں کھڑی ہو کر تم نے اپنی اماں سے کہا کہ امی جو میرا جی چاہے گا کروں گی یا پھر آپ لوگ مجھے مار ڈالئے۔ پھر سب نے دوسری بات سے اتفاق کر لیا۔ یعنی تم مار ڈالی گئیں۔ سب نے تم پر فاتحہ پڑھا۔ لیکن شمیم ماموں اس فاتحہ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ دوسرا زخم بھی بھرنے لگا تھا پھر شمیم ماموں کی نازبرداریوں نے اسے منا ڈالا تھا----- وہ تم پر بہت مہربان تھے۔ عائشہ کہتی تھی:

"شمیم ماموں کی عذرا تو قدسیہ کی کلاس فیلو ہے۔ جیسی ان کی لڑکی ویسی قدسیہ، پھر کیسے ایک لڑکی کو گھل گھل کر مرجانے دیں۔" شمیم ماموں، مدتوں سے اپنی بیوی بچوں سے قطع تعلق کر کے اکیلی زندگی گزار رہے تھے۔ صرف اتنی سی بات پر کہ ان کی بیوی کبھی اچھی ساڑھی نہ باندھ سکیں۔ ایک بار مجھے عائشہ نے لکھا تھا کہ تم بہترین ساڑھی باندھنے پر اسکول سے انعام لے چکی ہو۔ وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر تمہیں سیر کرانے لے جاتے۔ تمہارے صدقے میں سارا گھر سینما دیکھتا، پکنک پر جاتا۔ تم کوئی اعلیٰ ڈگری لینا چاہتی تھیں اور چچا ابا تمہیں تنہا ہوسٹل میں چھوڑنے پر تیار نہ تھے اس لئے بیچارے شمیم ماموں، اپنی وکالت کے بے شمار اہم کام چھوڑ کے، بارہ بارہ بجے رات تک فارسی اور اردو شاعروں کا کلام پڑھاتے اور عشق و تصوف میں ڈوبے ہوئے اشعار کا مطلب تم سے پوچھتے۔

سب کے ٹھکرائے جانے سے پہلے تم خود ہی کسی سے بات کرنا پسند نہ کرتی تھیں۔ دن بھر پلنگ پر اوندھی پڑی نہ جانے کیا سوچا کرتیں۔ کوئی بات نہ کرتا تو شکایت نہ کرتیں۔ شمیم ماموں سر پر ہاتھ پھیرتے تو منع نہ کرتیں۔ ہاتھ پکڑ کے موٹر میں بٹھا دیتے تو بیٹھ جاتیں۔ ممکن ہے تم سے ان کی ویران زندگی دیکھی نہ گئی ہو اور انسانیت کے تقاضے نے مجبور کر دیا ہو۔ مگر تمہاری روش کتنی تعجب خیز تھی۔ ممانی کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا اور سب کی سوالیہ نگاہیں پھر تمہارے چہرے پر گڑ گئیں----- ایک رات جب شمیم ماموں تمہیں پڑھا رہے تھے۔ کمرے میں کچھ شور سا ہوا۔ پھر تم بغیر دوپٹے کے بھاگتی ہوئی کمرے میں آئیں اور پلنگ پر گر کے رونے لگیں۔

پیچھے پیچھے گھر کے سب لوگوں کی لمبی قطار تھی- میں بڑی دلچسپی سے یہ تماشہ دیکھنے لگا-
چچی نے تمہارے کمزور جسم پر اپنی دانست میں بڑے زوردار دھماکے رسید کئے اور بہت سی مرغیاں کڑکڑانے لگیں- جواب میں سسکیاں روک کے تم نے بڑی مشکل سے کہا:
"میں جدھر بھی جاؤں سب مجھی کو برا کہتے ہیں- مجھے کیا معلوم تھا وہ اتنا کمینہ-"
اور مجھے ہنسی آ گئی---- کوئی مرد ماموں نہیں ہوتا' ماسٹر نہیں ہوتا' شریف نہیں ہوتا' صرف کمینہ ہوتا ہے جو عورت سے سب کچھ لینے کے بعد بھی اسے جھلملاتے آنسوؤں کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتا-

شمیم ماموں نے سوچا ہو گا کہ اگر ریاض یا ماسٹر تمہیں کوئی امانت نہ دے سکا تو وہ کیوں نہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیں- جبکہ وہ کسی ناطے رشتے سے تمہارے فرضی ماموں بھی بنے ہوئے تھے-

پھر تو ان کی بیوی نے شہر بھر میں یہ خبر عام کر دی کہ تم چاہو تو بیوی بچوں والے بوڑھے مردوں کو بھی بھٹکا سکتی ہو- پھر کسی میوزیم میں رکھی ہوئی لاکھوں سال پرانی مٹی کی طرح تم ایک نمائش کی چیز بن گئیں- لمبی لمبی چھتوں کو پھلانگتی ہوئی یہ بات سارے شہر کا گشت لگا کر تمہارے ماتھے پر چپک گئی- عورتیں اور لڑکیاں دور دور سے بچے کولھوں پر ٹکائے' ناک پر انگلیاں رکھے تمہیں دیکھنے کو آتیں' مردوں کی محفلوں میں بلند قہقہوں اور فحش گالیوں کے درمیان تمہارا نام آ جاتا تو خود بھی اس لٹنے والے باغ میں جانے کو طبیعت مچل اٹھتی-
اطہر اسی مال غنیمت کی امید میں آیا تھا-
میرا چھوٹا بھائی جو اپنی آوارگی کے سبب حوالات تک ہو آیا تھا' کالج سے نکال دیا گیا تھا اور متفقہ طور پر یہ طے ہو گیا تھا کہ اسے کوئی اپنی بیٹی نہ دے گا- متوسط طبقے کا ایک بیکار نوجوان جس سے سب لوگ مایوس ہو گئے تھے-
باہر کی تفریحوں کے علاوہ اور بھی کئی لڑکیوں کو جھانسا دے چکا تھا بلکہ راحت کے متعلق تو مشہور ہے کہ صرف اطہر کی وجہ سے اس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا ہے اور وہ میکے میں دن گزار رہی ہے-
مگر اتنے سیاہ کارناموں کے باوجود وہ تمہاری جانب سے مایوس نہ لوٹا-
ساری دنیا سے دھتکارا ہوا بے رحم' منہ پھٹ' چیخ چیخ کر باتیں کرنے والا اطہر' جسے ابا روز گھر سے نکال دیتے' امی کوسنے دیتیں اور عائشہ اپنی قسمت پر صبر کر کے بیٹھ جاتی---- اگر

بہنوں کے بھائی قابل فخر نہ ہوں تو وہ کتنی بدنصیب نظر آتی ہیں۔ خوبصورت کماؤ بھائیوں کے بھروسے پر ہی تو وہ کتنی ہی ناکوں کو اپنے سامنے رگڑوا سکتی ہیں اور عائشہ کی ساری توجہ مجھ پر مرکوز ہو گئی تھی۔ لڑکیوں کے لئے میری خشک اور بے ربط زندگی میں بھی کوئی کشش نہ تھی۔ مگر پھر بھی میری شخصیت کو گھر میں کافی اہمیت دی جاتی تھی۔

تمہاری بارگاہ میں اطہر کو کیسے شرف نیاز بخشا گیا۔ یہ بات سب کے لئے حیران کن تھی۔ وہ تو صرف اپنے خوبصورت جسم اور بے باک لہجے سے معرکے سر کرتا تھا اور تم نے ہمیشہ بجھے ہوئے دل اور بیمار ذہن تلاش کئے تھے۔

یہاں پر مجھے اپنی پچھلی ریسرچ بیکار معلوم ہوئی اور اسے اٹھا کر پھینکنے سے پہلے میں نے تم سے راہ و رسم بڑھانا چاہی۔ مجھے گھر میں رہنے کا اتفاق بہت کم ہوتا۔ خصوصاً تم سے تو کبھی بے تکلفی سے بات بھی نہ کر سکا تھا۔ اس لئے ایک گھر میں رہنے کے باوجود ہم بہت دور رہتے۔ تم ہمیشہ مجھ سے چھپنا چاہتیں۔ کیونکہ پہلے دن ہماری ملاقات نے بڑی تلخ فضا پیدا کر دی تھی۔ اس دن ہماری ملاقات ناشتے کی میز پر ہوئی تھی۔ تم شاید میری سنجیدگی کی بابت عائشہ سے پہلے ہی سن چکی تھیں اور مجھ تک اپنے کارنامے پہنچانے سے گریز کر رہی تھیں۔ احتیاط سے سر پر پلو ڈالے نظریں جھکائے یوں بیٹھی تھیں جیسے کسی پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے آئی ہو۔ عائشہ نے میری جانب بڑی بامعنی نظروں سے دیکھ کر کہا تھا:

"بھائی جان! دیکھئے یہ ہیں قدسیہ"----- عائشہ کی طنزیہ نظروں کو تم نے بیچ میں سے ہی پکڑ لیا اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر شکستہ لہجے میں کہا---- "تو احمد بھائی بھی مجھے پہلے سے جانتے ہیں؟"

اور تم چائے کی پیالی رکھ کر اٹھ گئی تھیں۔

پھر برسات کی ایک شام کو ہلکی ہلکی رم جھم نے موسم بڑا پرکیف بنا دیا تھا۔ بہت دیر تک فیض کی "نقش فریادی" پڑھنے کے بعد میں حسب عادت سگریٹ کے دھوئیں سے خیالی ہیولے بنا رہا تھا۔

عائشہ، پروین، چھوٹی بھابی، اور فرزانہ قریب بیٹھی کیرم کھیل رہی تھیں اور کسی فلم پر زوردار بحث کر رہی تھیں جس میں ایک ہیرو دو لڑکیوں سے محبت کرتا ہے اور ڈائریکٹر ہر بار اس محبت کو سچی محبت بنانے پر مصر ہے۔ عائشہ کے خیال میں یہ محبت کی توہین تھی یا ہیرو کی بوالہوسی۔

تم ان کے قریب والی کرسی پر بیٹھی سیاہ ساٹن کے ایک ٹکڑے پر ننھے ننھے آئینے ٹانک رہی تھیں جن کی بہت سی شعاؤں نے مل کر تمہارے چہرے پر مشعلیں سی جلا دی تھیں۔

اپنی رائے کو زیادہ وزنی بنانے کے لئے عائشہ نے مجھ سے پوچھا:

"آپ بتایئے بھائی جان! کیا محبت ایک بار سے زیادہ کی جا سکتی ہے؟"

اور میں نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا۔ "قدسیہ سے پوچھو۔"

تمہارے ہاتھ کام کرتے کرتے رک گئے۔ چہرے پر جلتی ہوئی مشعلیں بجھ گئیں اور تم گہری شکایت آمیز نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ بھابھی اور پروین آہستہ آہستہ ہنسنے لگیں' فرزانہ بات ٹالنے کو گنگنانے لگی اور عائشہ نے داد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر میں نے اس خوبصورت شام کا زرتار لباس نوچ کر پھینک دیا۔ رم جھم کا شور مچانے والی بوندیں آنسوؤں کے دھارے بن گئیں۔ فیض کے دلنشیں شعر ہاتھ ملا کر مجھ سے رخصت ہو گئے اور کمرے میں اندھیرا بڑھنے لگا۔

"آج موسم کتنا خوشگوار ہو رہا ہے!"

"ہونہہ!"

"جی چاہ رہا ہے کہیں باہر گھومنے جاؤں۔"

"تو جایئے۔" تم حسب عادت مختصر جواب دے رہی تھیں۔

"مگر کوئی ساتھ چلنے والا ہو نہیں۔ اطہر نے وعدہ کیا تھا مگر نہیں آیا۔ کتنا غیر ذمہ دار اور جھوٹا ہو گیا ہے یہ لڑکا۔۔۔۔"

جان بوجھ کر اطہر کی برائی کر کے میں نے تمہارے چہرے پر کچھ ڈھونڈا۔ تمہاری آنکھیں سامنے کھلی ہوئی کتاب پر تھیں اور ہاتھ ٹیبل کلاتھ کی شکنیں درست کرنے میں مصروف۔ پھر بڑے طنز سے تم نے کہا:

"اتنے سہانے موسم میں تو وہ کسی بار میں بے ہوش پڑے ہوں گے۔ آپ لوگ تو انہیں اچھی طرح جانتے ہیں نا۔"

یہ تم کہہ رہی تھیں۔ تم' جس کے متعلق مشہور تھا کہ سارے خاندان کی عزت جوتے کی نوک پر اچھال کر تم اطہر سے شادی کرو گی۔ سب سے چھپا کر اسے روپے دیتی ہو۔ وہ شراب پی کر آتا ہے تو اس کی پردہ پوشی کرتی ہو۔ اتنے برے انسان پر تمہاری یہ عنایتیں کیوں تھیں جبکہ پچھلی زندگی میں ہی قابل اعتبار مرد تمہیں دھوکا دے چکے تھے۔

تمہارے متعلق پھیلی ہوئی بدنامیوں کے درمیان مجھے اپنی اچھی رائے بڑی مضحکہ خیز لگی۔ اسے میں نے اپنے دماغ سے کھرچ دیا۔ تم سب کے لئے ناقابل فہم بن گئی تھیں۔ بھول بھلیوں کے پیچیدہ راستوں کی طرح تم نے اپنے مکرو فریب کے جو جال بچھا رکھے تھے انہیں دیکھ کر مجھے تم سے نفرت ہو گئی۔ پھر ایک دن بڑی سوچ بچار کے بعد میں کچھ حواس باختہ سا تمہارے کمرے میں آیا۔

"میں تمہارے متعلق کچھ جاننا چاہتا ہوں قدسیہ' اگر تم مجھے اجازت دو تو ------ تو"

------ اپنی گھبراہٹ پر میں خود متعجب تھا۔ اس دن تمہارے چہرے پر میں نے پہلی بار ڈر کی پرچھائیاں دیکھیں جن پر حیرانی غالب تھی۔ تم یوں کھڑی ہو گئیں جیسے شمیم ماموں تم پر جھپٹنا چاہتے ہیں۔ تم نے دوپٹے کو سینے پر سنبھال کے کہا:

" آپ بھی مجھے جاننا چاہتے ہیں احمد بھائی! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ پھر آپ کیوں کوئلوں کی دلالی میں اپنے ہاتھ کالے کرنا چاہتے ہیں۔" اور تم پیچھے دیکھے بغیر باہر بھاگ گئی تھیں۔

ان ہی دنوں اتفاق سے مجھے تمہارا ایک خط ہاتھ لگا جو تم نے ریاض کو لکھا تھا مگر اسے بھیج نہ سکی تھیں' یا شاید اسے بھیجنے کو لکھا ہی نہ ہو۔ کیونکہ یہ صرف تمہاری روح کی پکار تھی جس کو ریاض جیسا بے وقوف انسان کبھی نہ سمجھ سکتا۔ اس کی محبت میں تمہاری برتری اور پرستش کا جذبہ غالب تھا اور وہ اسے روح کی بلندی کبھی نہ دے سکتی تھیں۔ بارش بہت زور کی ہو رہی تھی اور دریچوں سے نیچے گرنے والے قطروں کو بچے ہاتھوں میں روک کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ اتنے میں بھابی کا چھوٹا بچہ راشد ناؤ بنوانے کو ایک کاغذ لے کر آیا۔ یہ نیلے کاغذ پر لکھا ہوا ایک لمبا چوڑا خط تھا۔ نیچے تمہارے بہت ہی بگڑے ہوئے دستخط۔ وہ خط راشد تمہاری اٹیچی سے نکال کر لایا تھا۔ اپنی شرافت کا ثبوت دینے کے لئے میں نے اسے واپس رکھوانا چاہا۔ مگر ایک بار پڑھنے سے باز نہ رہ سکا۔

میری جانب ملامت آمیز نظروں سے نہ دیکھو۔ ان دنوں میں تم پر ریسرچ کر رہا تھا۔ بیسویں صدی کا ایک نکما اشتیاق کیل------ تمہارا یہ خط بہت سی ڈھکی چھپی باتوں کو سامنے لے آیا اور میری رائے پھر ڈگمگانے لگی۔

اس خط میں ریاض کو لکھا تھا کہ بچپن سے تم نے ہر دل میں اپنے لئے حقارت اور نفرت پائی اور صرف کسی کی نظر میں برتری حاصل کرنے کا یہ جذبہ ہی تمہیں ریاض کی جانب لے گیا

جو تمہاری طرح سب کی جانب سے دھتکارا ہوا دوسرا فرد تھا۔ ریاض کی نیازمندی اور احساس کمتری نے اسے اور گہرا کر دیا اور گھر والوں کی مخالفت نے اسے جنگل میں لگی ہوئی آگ کی طرح بھڑکا دیا۔ پھر تم نے ہر قیمت ادا کر کے ریاض کو پانے کا تہیہ کر لیا مگر ریاض کے قدم اس دشوار راستے پر لڑکھڑا گئے۔ ابا کی ایک ڈانٹ پر محبت اچھل کر دور جا پڑی اور وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر بھاگ گیا۔

خط کے آخر میں تم نے اسے خوب ذلیل کیا تھا---- بزدل تو سمجھتا ہے اس طرح تو نے اپنی محبت کو رسوائی سے بچا کر میری لاج رکھ لی۔ مگر ابھی ہماری محبت شروع ہی کہاں ہوئی تھی۔ پہلے ہی میری عزت کون سے جھنڈے پر چڑھی بیٹھی تھی۔ میں تجھے وہ دے ہی نہ سکی جو میری زندگی کا بلند آدرش ہے---- کاش میں تجھے اس بلندی پر پہنچا سکتی' جہاں تک خود میرا ہاتھ بھی نہ جا سکتا۔ اب میری روح اس وسیع سمندر میں اس تنکے کو تلاش کرتی پھرے گی۔

تو اب تم اس تنکے کی تلاش میں خوفناک چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ تم---- جو موم کی مورتی کی طرح اپنے خالق کے تخیل کی گرمی سے پگھل سکتی تھیں۔ کسی کی تیز نگاہوں سے سلگ سکتی تھیں۔ پھر اپنے چاروں طرف چھائی ہوئی اس بھیانک آگ میں تمہارے قدم کیسے نہیں ڈگمگاتے----؟

دوسرے دن میں نے اطہر کو تمہارے سامنے خوب ڈانٹا۔

" کل تم مجھ سے وعدہ کرنے کے بعد کیوں نہیں آئے؟ کبھی تو تمہیں اپنے وعدے کا خیال کرنا چاہئے۔ میں یہاں انتظار میں بیٹھا رہا اور بقول قدسیہ کے جناب کسی بار میں پڑے رہے۔"

اطہر کے بے ساختہ قہقہے رک گئے اور وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے میں نے اسے پھانسی کا حکم سنایا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بڑا پشیمان میرے پاس آیا۔

" اور اس نے میرے متعلق کیا کہا----؟ اسے میری عادتوں کی خبر ہے؟ کیا اس نے میری شکایت کی تھی۔ وہ بہت رنجیدہ ہوئی----؟" زندگی میں آج پہلی بار میں نے اطہر کو شرمندہ دیکھا تھا۔ وہ بھی کسی کی شکایت سننے کو تیار تھا' اس سے متاثر ہو سکتا تھا۔

" یہ تو نئی بات ہے۔ جبکہ تم ہمیشہ سے فریب دیتے آئے ہو اور قدسیہ ہمیشہ فریب کھاتی آئی ہے۔"

" آپ بھی اسے ایسا سمجھتے ہیں بھائی جان!" اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"قدسیہ کے بگڑنے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ بڑی بدنصیب لڑکی ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر اسے کچھ دے نہ سکوں تو اس کی بدنامیوں میں اضافے کا سبب بھی نہ بنوں۔ میں سچ مچ بہت برا ہوں اور قدسیہ کو فریب دے کر بھی نقصان ہی میں رہوں گا۔"

وہ باہر چلا گیا اور ایک بار پھر تم میرے سامنے نئی گتھیاں لئے آگئیں اطہر کونسا راستہ اختیار کر رہا تھا!

وہ بے رحم انسان جو اپنے مفاد کے آگے کسی پر رحم نہ کر سکتا تھا۔۔۔۔۔ تم مجھے ایک کسوٹی نظر آئیں جس پر سونا اور پیتل دونوں واضح شکل میں چمک اٹھتے ہیں۔

"گناہوں کے اتصال سے اتنا پاک جذبہ بھی وجود میں آتا ہے؟"

پھر تمہاری کہانی کا باقی حصہ میں خود نہ دیکھ سکا۔ میری مصروفیتیں مجھے کلکتہ کھینچ کر لے گئیں اور وہاں سے مجھے آندھرا کے علاقوں میں جانا پڑا اور آندھرا کی بیدار زندگی اور پرجوش سرگرمیوں نے تمہاری محبت کی نیم مردہ رینگتی ہوئی کہانی بھلا دی اور گھر میں ہونے والے یہ چھوٹے چھوٹے حادثے ذہن کے کسی کونے میں تھک کر سو گئے۔

ایک بار عائشہ نے لکھا کہ اطہر کی مسلسل نافرمانیوں کے سبب ابا نے اسے عاق کر دیا ہے اور وہ گھر سے چلا گیا ہے اور معلوم ہوا کہ تم اچانک گھر سے غائب ہو گئیں اور کسی نے ایک بار مجھے بتایا کہ تم دونوں اب لکھنؤ میں رہتے ہو چچا ابا اب تمہیں گھر بلانے پر تیار نہیں ہیں۔

اس سے آگے کی کہانی مجھے کسی نے نہیں سنائی، مگر میں اس بات کا منتظر رہا کہ اب اطہر اپنا الو سیدھا کرنے کو تمہیں بمبئی لے جائے گا۔ جہاں کئی برسوں تک ٹھوکریں کھانے کے بعد میں تمہیں ایک دن کسی فلم میں دیکھوں گا۔ ہیروئن کے پیچھے' ایکسٹراؤں میں کولھے مٹکاتے ہوئے کوئی آوارہ سا گیت تمہارے لبوں پر ہو گا' جو تمہارے مصنوعی چہرے' چھاتیوں' پنڈلیوں اور کمر کی نمائش کرے گا۔ تم ایک جھوٹ کا خول ہو گی' سلولائیڈ کی گڑیا' جس کی ہر جنبش دوسروں کی تابع ہوتی ہے' اور تم اپنی خودداری کی لاش پر ناچ رہی ہو گی۔

ایک حد سے زیادہ جذباتی لڑکی کے تخیل کی اڑان ہمیشہ یوں ہی کھائیوں میں گر کے دم توڑ دیتی ہے۔۔۔۔ مجھے تم دونوں کے نام سے نفرت ہو گئی۔ عائشہ نے ایک بار لکھا بھی کہ قدسیہ وہاں کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکر ہو گئی ہے' اطہر بیمار ہے اور وہ دونوں بڑی تکلیف کے دن گزار رہے ہیں۔

لیکن میں نے بڑی سختی سے اسے لکھ دیا کہ میں اب قدسیہ کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتا۔

اطہر کی یہ تبدیلی جتنی نفرت انگیز تھی اتنی ہی تعجب خیز بھی تھی- وہ کسی کی شادی کی خبر سن کر بھی مذاق اڑایا کرتا تھا- وہ کہا کرتا تھا کہ "ایک ہی راگ مسلسل لوگ کیسے سنے جاتے ہیں- میں تو دو ہی دن میں پاگل ہو جاؤں-"

پھر اس نے دو سال تک اس راگ کو کیسے سنا؟

امی اپنی قسمت کو رو کر بیٹھ رہیں' ان کی زندگی کے دونوں کڑوے پھل گئے- میں تو خیر اپنی خطرناک زندگی سے انہیں کوئی فیض نہ پہنچا سکتا تھا- مگر ابا یہ بھی برداشت نہ کر سکے کہ اطہر کی قسمت اچانک پلٹا کھائے' وہ کوئی اچھی ملازمت حاصل کر لے-

پھر امی کے آنسوؤں نے ابا سے خط لکھوائے جس میں اطہر کو اپنی خاندانی عزت اور بے شمار دولت کا واسطہ دیا گیا تھا اور تمہیں اطہر کی محبت کا-- اور آج عائشہ نے لکھا ہے-----

" بھائی جان! آپ قدسیہ سے نفرت کرتے رہے- کیونکہ آئندہ اس کے متعلق کوئی بات نہیں ہو گی جو میں آپ کو سناؤں گی- آج اطہر بھائی کو ابا تنہا گھر لے آئے ہیں' قدسیہ کسی معمولی سی بیماری سے مر چکی ہے-"

تم زندگی بھر میری عزت کرتی رہیں اور میں تم سے نفرت کرتا رہا- یہ ہم دونوں کی اپنی اپنی ذہنیت کا قصور ہے' ادھر منہ کرو----- تمہاری آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو کیا کہہ رہے ہیں؟

کیا سچ مچ تم کسی معمولی سی بیماری سے مر گئیں! اس چھوٹی سی بیماری کو اپنے نازک جسم پر نہ سہہ سکیں اور اس بیماری کا علاج کسی سے نہ ہو سکا---- اطہر سے بھی نہیں- مجھ سے بھی نہیں جو تم سے نفرت کرتا رہا-

تمہیں اپنی شکست پر آنسو نہیں بہانا چاہئیں- کیونکہ تم نے اطہر کو وہ تحفہ دے دیا جس کے لئے تم زندگی بھر سرگرداں رہیں اور چپ چاپ اندھیرے میں کھو گئیں- اب تمہاری روندی ہوئی سسکیاں اور جھلملاتے آنسو ہی مجھے تمہاری موجودگی کا احساس دلاتے ہیں-

تم آج گھٹی گھٹی آہوں اور پیتے ہوئے آنسوؤں سے اس کمرے میں میرے لئے اپنی عزت کا تحفہ لے کر آئی ہو- مگر میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا کہ جلے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں پھینک کر' تمہارے خیال کو بھی ذہن سے جھٹک دوں-

ڈریم لینڈ

یہ حکایت وہاں سے شروع ہوتی ہے جب الف لیلہ کی پہلی رات نے کائنات میں اپنے خونی پنجے گاڑے تھے۔ اور معصوم دوشیزاؤں کو بادشاہوں کی خلوت گاہوں میں وزیر زادی شہزاد کی طرح بھیجنا شروع کیا تھا۔ پھر صبح کو اس لڑکی کے منہ پر کالک مل کر اسے قتل گاہ کی جانب دھکیل دیتے تھے۔

اس دن سے آج کے ترقی یافتہ دور تک' جب سیاہ رات کو ہزار کینڈل پاور کے گولے اجالے کے ملمع چڑھا دیتے ہیں' بڑے محلوں کے دیوتاؤں کو کنواریوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ یہ بھینٹ الف لیلہ کی طویل کہانیوں کو طویل تر بنا رہی ہے۔

یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنی انسانی بربریت کی تاریخ۔

رات بھر پلک جھپکائے بغیر کہانی سننے والے فانوسوں کی شمعیں اب سپیدہ سحر کی آمد سے نڈھال ہو رہی تھیں۔ تخت طاؤس کی جڑاؤ سیڑھیوں کے نیچے ایرانی قالینوں کے گرد' ہاتھوں میں گنار اور سروں پر چراغ رکھے ہوئے بغداد اور دمشق کی خوبصورت کنیزوں کے پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگرو اب خاموش ہوگئے ہیں۔ عود و عنبر کی لہراتی ہوئی خوشبوئیں اب دم توڑتے ہوئے انسان کی سانسوں کی طرح سست رفتار ہو چکی ہیں۔ تخت طاؤس کے نیچے اپنے مراتب کے لحاظ سے بیٹھے ہوئے محل کے تیرہ یک چشم نوجوان وزیر غافل کی بیٹی کا سودا بادشاہ سے ہوجانے پر حسد کی آگ میں بھنے جا رہے تھے۔ نائب وزیر عاقل بھی اپنی بیٹی کے کم دام لگنے پر مغموم ہو چکا تھا۔ ایک بوڑھا اژدھا سب کے پیروں کے نیچے سے نکل کر اس کے سینے پر لوٹنے لگا اور سب اچک اچک کر ایک دوسرے کی آنکھ میں سے شہتیر نکالنے لگے۔

ہال کے آخری کونے میں بیٹھے ہوئی نشاط کو بھی اپنی آنکھ میں کچھ کھٹک محسوس ہوئی۔ اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر نینا کا ملائم ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور اپنی بھاری آواز کو ملائم بنا کر بولی۔

"اگر تم کہو تو گھر چلیں اب ڈارلنگ۔ مجھے تو یہ ڈرامہ کچھ پسند نہیں آرہا ہے۔ ویسے ہم نے چندہ تو دے ہی دیا ہے۔۔۔؟"

جواب میں نینا اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر اس کے قریب بیٹھی ہوئی روشنی بڑے غور سے

اسٹیج کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں ایک زہرہ جبین دوشیزہ کو لوگ زبردستی بادشاہ کی خواب گاہ میں پہنچا رہے تھے۔

نشاط نے اسے بھی اٹھایا اور وہ تینوں باہر نکل آئیں۔ اجالے میں آکر روشنی نے دیکھا۔ نینا کی آنکھیں چھلکنے کو تیار تھیں' اور غصہ کی وجہ سے نشاط کی کاجل سے بنی ہوئی بھوئیں لرز رہی تھیں اور بعض وقت نینا اور نشاط کی طبیعت کو سمجھنا روشنی کی عقل سے باہر ہوجاتا۔ اتنے دنوں سے نینا کتنی دلچسپی لے رہی تھی۔ اس امدادی شو کے لیے اس نے کافی رقم دی تھی۔ مگر آج نہ جانے کیوں اس کا موڈ اتنا خراب ہورہا تھا۔۔۔؟

دوسری شام کو روشنی کرسی پر لیٹی شام کا اخبار دیکھ رہی تھی' جس میں رادھا کشن نے اپنے پراپیگنڈے کے لیے کسی مشہور ادیب سے اپنی تعریف میں مضمون لکھوایا تھا۔ مگر اچانک اس مضمون پر رات والے ڈرامے کی ہیروئن نمودار ہوئی اور اخبار کی خبروں پر دھوئیں کی طرح پھیل گئی۔ چند روپوں کے عوض بکنے والی لڑکی' دنیا کی اہم خبروں پر کیوں چھائی جارہی ہے۔۔۔!

روشنی نے اخبار میز پر پھینک دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ موسم بڑا سلونا ہورہا تھا۔ سیاہ بادلوں کے پرت چڑھتے چلے آرہے تھے۔ یوں لگتا جیسے اب آنے والے لمحے میں ہوا کی نمی اپنے ساتھ موتیوں کی طرح قطروں کو بھی اندر دھکیل دے گی۔ شام کے دم توڑتے ہوئے اجالے میں چمکنے والی بجلی کی کوند نینا کے گلابی رخساروں پر بکھر جاتی تھی۔ اور نینا کو دیکھنے سے پہلے راجیش گھبرا کے روشنی کو دیکھتا جو ایسے وقت اس کمرے میں ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔

مگر نینا' راجیش کی ملتجی نظروں سے بے خبر اور موسم کے سلونے پن سے لاپروا بنی ریڈیو سٹ پر اپنی دوست دلاری کا گانا سننے میں یوں غرق تھی جیسے دلاری بیہوش کیے بغیر اس کا اپریشن کررہی ہو۔

"میرے سپنے ہوئے سانچے"

وہ دبلی پتلی خاموش لڑکی ــــــ جس کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے سارے چھپے دبے رازوں کو آشکار کردیتی ہیں' ان سپنوں کی حقیقت کھول دیتی ہیں' جن کے سچے ہونے کا وہ اعلان کر رہی ہے۔

دس روپوں کے لیے ریڈیو اسٹیشن کے ہر کارکن کی خوشامد کرنے والی وہ کلاکار' جس

کی آواز کا سوز اور لوچ سب کو پسند ہے۔ مگر دکھ اور اداسی کا یہ جادو اس کی آواز میں کہاں سے آیا' اٹھارہ سال کی مختصر سی عمر میں اتنا سارا دکھ کیسے جمع ہوگیا۔ اگر آج دلاری کی آواز میں یاس کی پکار ہے تو اس کے گیتوں میں امید کی گھنٹیاں کب بجیں گی! کب اس کا حسن جھوم جھوم کر گائے گا اور چاروں طرف خوشیوں کے دیپ جلیں گے۔۔۔؟ روشنی نے سوچا ۔۔۔ یہ سپنوں کو سچا بنانے کا خواب بھی لڑکیاں کب سے دیکھتی آئی ہیں اور نہ جانے کب تک دیکھتی رہیں گی۔ دلاری اور روشنی سے لے کر نینا تک۔۔۔ جو ان بے سہارا چھوکریوں کو اپنے دستر خوان کے ٹکڑوں پر پال رہی تھی۔ راجہ رادھا کشن کی اکلوتی بیٹی۔

پس منظر میں سارنگی میں مدغم دلاری کی آواز یوں آرہی تھی جیسے وہ مدتوں سے گاتے گاتے تھک گئی ہو۔

"ریڈیو بند کردو روشنی۔۔۔" راجیش نے نینا کی لاپروائی سے اکتا کر کہا۔

سچ مچ یہ کیا جادو ہے۔ یہ کیسی بجلی کی گرج ہے۔ یہ کیسی آواز ہے جو بیک وقت کائنات کے ہر ذرے کو منور کرسکتی ہے۔ مگر وہ راجیش کی بے تاب امنگوں کو نینا تک نہیں پہنچا سکتی۔ نینا کے اس خطرناک کی شہرت یافتہ حسن کو دیکھ کر راجیش اپنے آپ کو ان شہزادوں کی صف میں پاتا ہے جنہیں اپنی محبوبہ کو جیتنے سے پہلے سات بعید از قیاس شرطیں پوری کرنا ضروری ہوا کرتی تھیں۔

یہ محل کیسا انوکھا تھا۔ یہاں کے رہنے والے کتنے عجیب سے تھے۔ روشنی نے پہلی بار "ڈریم لینڈ" میں قدم رکھا تھا تو اس کی خوبصورتی میں کھو گئی تھی۔ سامنے ایک بے حد خوبصورت لڑکی کو بے حد خوبصورت لباس پہنے دیکھ کر اسے سچ مچ "ڈریم لینڈ" کوئی سحر زدہ محل معلوم ہوا تھا جہاں خوفناک صورتوں اور بے پناہ طاقتوں والے جن بھوتوں نے اس شہزادی کو اسیر کررکھا تھا۔

پھر کسی دلاویز خواب کا جزو سمجھ کر اس نے آنکھیں بند کرنا چاہیں تو نشاط اسے ہوش میں لے آئی اور اسے نینا کے سپرد کردیا گیا۔ نینا کی آنکھیں کتنی خوبصورت تھیں' اس کی گلابی مخمل کے ہاتھ۔۔۔ سیاہ بالوں کے پھولوں نما گچھے' جو گردن تک پھیل کر اوپر مڑ جاتے تھے اگر شیریں' لیلیٰ اور کلوپیٹرا کے حسن نے محبت کی لازوال کہانیوں کو جنم دیا تو پھر اس لڑکی کی کہانی کیا ہوگی! اسے جیتنے والا مرد کون ہوگا!

روشنی کی روح پر نینا کا نشہ اتنا چھا گیا کہ جب اس نے اپنے چہرے پر آنے والی

لنوں کو پیچھے جھٹک کر اسے آنے کا اشارہ کیا تو اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اس نے یہاں کے خوبصورت اسٹیچو، قیمتی قالین، صوفے، سیڑھیاں، آئینے، گلدستے اور رنگ برنگے پردے دیکھنا چھوڑ دیئے۔ اس کی نظریں چمکتے ہوئے ٹھنڈے فرش پر پھسل گئیں۔ جہاں نینا کا سایہ دراز ہو کر اس کے سارے پر محیط ہو چکا تھا۔

دوسرے دن نینا نے اسے بتایا کہ اتنی اچھی اور شریف لڑکی کو وہ خادمہ بنانا پسند نہیں کرتی، بلکہ ایک دوست کی طرح اسے اپنے ساتھ رکھے گی۔

اس دن سے روشنی اس گھر کی ایک فرد گنی جاتی تھی اور یہاں کے رہنے والوں کو اچھی طرح پہچان چکی تھی۔

اس گھر میں ایک بڈھی مغرور اور سر پھری دادی تھیں جو نوکروں سے کجا، نینا سے بھی بات کرنا گوارا نہ کرتیں، اور جنہیں ہر روز صبح سارے گھر کو سلام کرنے جانا پڑتا تھا۔ نینا کے پتا رادھا کشن تھے۔ جو اپنے اجداد کے پشتینی خطابوں سے محروم ہونے کے بعد جاگیرداری کے خاتمے پر بے شمار جاگیر سے بھی محروم ہو رہے تھے۔ آج کل وہ اپنے خاندانی جواہرات فروخت کر کے الیکشن کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ کیونکہ اب اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے سے کسی بیرونی سفارت کا عہدہ نہ سہی کسی ریاست کی چیف منسٹری تو کہیں نہ گئی تھی۔ یوں بھی کانگریس اتنی بے مروت نہ ہوئی تھی کہ نوابوں اور جاگیرداروں کو بالکل ہی فراموش کر دے۔ دن بھر وہ اپنے خوشامدی مصاحبوں اور روپیہ اینٹھنے والے ایجنٹوں میں گھرے اپنی کامیابی کے خواب دیکھا کرتے تھے اور بڑے بڑے ایجنٹوں کے ہاتھ محل کا نادر الوجود چیزیں فروخت کرنے میں لگے رہتے تھے تاکہ الیکشن کی پبلٹی پر روپیہ اچھی طرح خرچ ہو سکے۔

ایک نینا کی رشتہ دار بمن تارہ تھی، جو معمولی شکل و صورت کی سہی مگر میک اپ کر کے اپنے آپ کو نینا کے مقابل سمجھتی تھی۔

ان کے علاوہ ایک اور عورت نشاط بھی تھی جو روشنی پر ترس کھا کر اسے مدراس کے قحط زدوں کے کیمپ سے اٹھا لائی تھی۔ وہ مستقل طور پر یہاں رہتی تھی لیکن پھر بھی اس گھر کے سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ اس کا شوہر اس سے دوگنی عمر کا ایک کروڑ پتی تاجر تھا اور نشاط اپنے سیکنڈ ہینڈ عاشق رادھا کشن پر تن من دھن سے محبت جتاتی تھی۔ اپنے تاجر شوہر کے ہاتھوں رادھا کشن کی کتنی ہی فضول سی چیزیں نہایت گراں قیمت پر فروخت کروا

چکی تھی۔

مگر ان سب میں روشنی کو صرف نینا پسند تھی' جو سینئر کیمبرج میں پڑھتی تھی اور معصوم لڑکیوں کی طرح اپنے حسن سے بے خبر تھی۔

روشنی نے پہلے دن ان سب کو دیکھا تو اس کے خیال گڈ مڈ ہوگئے۔ نینا کی دادی بداخلاق اور چڑ چڑی تھی۔ تارہ مغرور اور اوچھی۔ نشاط سر سے پیر تک فریب کا جال تھی۔ اس کی تیز آنکھوں اور بے باک لہجے سے روشنی کو بڑا ڈر لگتا تھا۔ جب وہ ٹانگ پر ٹانگ ڈال کر کرسی پر بیٹھی سگریٹ کے چھلے بنایا کرتی تو بالکل امریکن ناولوں کی کوئی بلیک میلر معلوم ہوتی تھی۔ بیٹھتے وقت ہمیشہ اس کی ساری کا پلو گود میں آن گرتا اور اس کے چولی نما بلاؤز کی معمولی سی آڑ کچھ بھی نہ چھپاپاتی تھی۔

اس گھر کے نوکر بھی اپنے مالکوں کے نقش قدم پر تھے۔ ان سب کے درمیان نینا یوں دکھائی دیتی جیسے ہزاروں گناہ گاروں کے درمیان پاک مریم کا مجسمہ رکھا ہو۔ آنکھیں جھکائے' دنیا کی ناپاک نگاہوں اور گناہوں سے بے خبر' اتنی خاموش سی' سہمی سہمی' جیسے لطیف دھواں بن کر تحلیل ہو جائے گی۔

رادھا کشن بھی اپنی بھاری جسامت کے باوجود اپنی بیٹی کی طرح بے ضرر سے' بھولے سے' دکھائی دیتے تھے۔ جب نینا نے انہیں بتایا کہ روشنی یہاں مستقل طور پر رہے گی تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے تھے۔ "بڑی اچھی بات ہے ڈارلنگ' نشاط نے اس معاملے میں بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا ہے کیا نام ہے تمہارا۔۔۔؟ "۔ انہوں نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے روشنی کے آر پار دیکھنا چاہا تو وہ سمٹ کر نینا کی اوٹ میں ہوگئی۔ جی چاہا ابھی یہاں سے بھاگ جائے۔

"روشنی"

"نام تو بڑا اچھا ہے۔۔۔" ایک اور بڑا پیگ بناتے میں وہ پھر زور سے ہنسے۔

"اس کوٹھی میں یہ لڑکی ہماری قسمت بن کر آئی ہے۔ روشنی' تم اس محل کو بھی روشن کردینا۔ آمیں"

اپنی بے آسرا دنیا سے نکل کر روشنی کو اس کوٹھی کی وسعت بہت بڑی دکھائی دیتی تھی۔ امیروں کی اس خوبصورت اور رنگین دنیا کو اس نے کبھی قریب سے نہ دیکھا تھا۔ مگر یہاں آکر وہ ہر اس چیز کو پسند کرنے لگی تھی جس سے پہلے نفرت کرتی تھی۔ نشاط تک کو'

جسے حسین بنانے میں خدا سے زیادہ خود اس کا ہاتھ تھا۔ وہ میکس فیکٹر کا میک اپ اتنی نفاست سے کرتی تھی کہ شعلہ جوالہ معلوم ہوتی تھی۔ روشنی بھی بڑی دیر میں پہچان سکی کہ نشاط کی خم دار بھوئیں' ترشے ہوئے ہونٹ' بڑھے ہوئے ناخن اور ابھری ہوئی چھاتیاں' سب میک اپ کا کرشمہ تھیں۔ اس کے بالوں کو سنہرہ رنگ دے کر ان میں خم ڈالے گئے تھے۔ ہنسنے بولنے میں اتنی احتیاط سے کام لیتی تھی جیسے ہنسی نہ ہو تو مہذب چیخیں ہوں۔ اپنی کھرج دار مردانی آواز کو خوبصورت ٹیون میں ڈھال کر یوں بات کرتی جیسے ریڈیو کی کوئی نو آموز صدا کار۔ جب چلتی تھی تو جسم کا ہر ہر عضو علیحدہ ہونے کی کشمکش شروع کر دیتا تھا۔

مگر روشنی کو وہ بھی اچھی لگتی تھی۔ "ڈریم لینڈ" میں کتنے مہربان لوگ رہتے تھے۔ یہاں وہ کسی کے متعلق بری رائے قائم نہ کر سکی--- یہاں ہر شخص اپنے خوابوں کی تعبیر میں کھویا ہوا تھا۔ رادھا کشن سے لے کر روشنی تک۔ وہ ایک بال جیسے پتلے دھاگے پر مستقبل کی بھاری امیدوں کو اینٹیں چنتے رہتے تھے۔ کوٹھی کے اطراف لمبے لمبے سرو' شمشاد' یوکلپٹس اور سنبل کے پھیلے ہوئے درخت جھوم جھوم کر ان کے حسین خیالوں کی داد دیتے تھے۔ بڑے ہال کمرے میں ہونٹوں سے بانسری لگائے ہوئے کرشن جی کی تصویر ہر آنے جانے والے کا بڑی دل نشین مسکراہٹ سے استقبال کرتی تھی۔ اس مسکراہٹ میں طنز ہوتا تھا یا یقین--- یہ مسکراہٹ دنیا اوراس کے رہنے والوں سے بعض اوقات بڑی بے تعلقی کا اظہار کرتی اور کبھی ڈوبتوں کے لیے تنکے کا سہارا بھی بن جاتی۔ یہ تصویر اس گھر میں رہنے والوں کے ہر ہر راز سے واقف تھی۔ ہر صبح نینا بڑی عقیدت سے اس کے فریم پر پھول چڑھاتی تھی اور اس کے باریک لب یوں پھڑ پھڑانے لگتے تھے جیسے اپنی خواہشوں کو وہ زبان پر لانے سے بھی مجبور ہو۔ فرط عقیدت سے اس کی پلکیں نم ہوجاتی تھیں۔ کرشن جی کی تصویر کے سامنے کھڑی ہوکر روشنی نے بار ہا سوچا تھا کہ اب جینے کا سہارا مل گیا ہے۔ اب اسے غنی کے ظلم سہنے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ ایک بلند پرواز چڑیا ہے جو ہوا کے دوش پر سوار ہو کر جہاں جی چاہے بیٹھ جائے گی۔ یہیں کھڑے ہو کر نینا کی دادی نے لٹتی ہوئی جاگیر کے زندہ رہنے کی دعائیں مانگی تھیں۔ اور رادھا کرشن نے الیکشن جیتنے کے بعد بھاری چڑھاوا دینے کا وعدہ کرشن جی سے یوں کر رکھا تھا جیسے اپنا کام بنانے کے لیے کسی کانگریسی کو رشوت دینے کا ارادہ کرلیا ہو۔ جب کبھی نشاط کے مردہ ضمیر میں کسی حرکت کا احساس ہوتا تھا تو وہ کرشن جی سے شکتی مانگتی تھی۔ پھر اس کے بعد مشکل کشا کو بھی نیاز دینے کا وعدہ

کرلیتی۔ اسے تعویذوں' گنڈوں اور نجومیوں پر بڑا اعتماد تھا۔ بلکہ کشمیر میں ایک سادھو کے کہنے پر ہی اس کے رادھا کشن کو الیکشن کے لیے اکسایا تھا۔

البتہ تارہ کی صورت دیکھ کر روشنی کو بہت سی باتیں یاد آجاتیں جو وہ بھول جانا چاہتی تھی۔ تارہ کی شکل بالکل اس سیٹھانی سے ملتی تھی جو غنی کو پھانس کر بمبئی لے بھاگی تھی۔ جب سے وہ سیٹھانی اس کی دنیا لوٹ کر بھاگی تھی' روشنی کو بڑے آدمیوں کی عورتوں سے نفرت ہوگئی تھی۔ تارہ نے بھی ان قحط زدہ لونڈیوں کو کبھی منہ نہ لگایا تھا۔ البتہ اسے روشنی کا نام پسند تھا۔

"روشنی--- روشنی کتنا خوبصورت اور رومینٹک نام ہے۔" پھر اس نے بڑی معنی خیز نظروں سے نینا کو دیکھ کر کہا تھا "سنو نینا' جب تمہارے لڑکی ہو تو اس کا نام نرگس رکھنا نرگس---"

روشنی سطح زمین سے بلند ہونے لگی۔ مگر نینا اس مذاق سے بڑی اداس ہوگئی تھی۔ اور اس اداسی کو منانے کے لیے نشاط نے اپنے جیبی آئینے میں چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے تم پہلے بھی کسی اچھے گھر میں کام کرچکی ہو۔"

"جی" روشنی بہت کم بولتی تھی۔ حالانکہ نینا چاہتی تھی کہ وہ بے تکلفی سے جواب دیا کرے' تاکہ اس کے دل سے سب کا رعب نکل جائے۔

"کن صاحب کے ہاں کام کیا تھا---؟" تارہ نے ماتھے کی لٹیں جھٹک کر پوچھا۔

"اپنے شوہر کے ہاں"

"کہاں رہتا ہے وہ---؟" نشاط کے ہاتھ پیالی تک جاتے جاتے رک گئے۔

"بمبئی میں۔"

"پھر تم کیوں قحط کے امدادی کیمپ میں پڑی تھیں!"

"اسے ایک میم صاحب بھگا کے لے گئیں۔"

اس بات پر نینا اور تارہ کو اتنے زور کی ہنسی آئی کہ چائے کا پھندہ حلق میں اٹک گیا۔ ہنستے ہنستے دوہری ہو کر وہ صوفوں پر گر گئیں۔ بڑی بے زاری کے ساتھ مسکرا کر نشاط کو بھی ساتھ دینا پڑا۔ یوں جیسے زبردستی شرنار تھی فنڈ میں چندہ دینے پر مجبور کر دی گئی ہو۔

"خوب کہانی ہے تمہاری---" نینا نے ہنسی روک کر کہا۔ اور روشنی آج پہلی بار

نینا کی ہنسی میں ڈوب گئی۔ جب نینا ہنستے ہنستے چپ ہوگئی تو روشنی کا جی چاہا نینا یوں ہی زندگی بھر ہنستی رہے۔ چاہے اس کے لیے روشنی پر تعجب خیز غموں کے کتنے ہی پہاڑ ٹوٹ پڑیں۔ نینا کی ہنسی میں اداسی کی ہلکی ہلکی لہریں سی دوڑتی تھیں۔ یوں جیسے سچی چینی کے برتین ٹوٹ رہے ہوں۔

"ایک صدی قبل مظلوم والدین پولیس میں یوں رپورٹ لکھواتے تھے کہ ہماری لڑکی کو ایک مرد لے بھاگا۔ مگر بچاری روشنی کے پتی کو ایک عورت بھگا لے گئی۔"

تارہ اور نینا پھر مسکرانے لگیں۔ مگر نشاط میں اب مزید ساتھ دینے کی سکت نہ تھی۔ اسے اپنے ہونٹوں کی لپ اسٹک کا زیادہ خیال تھا جس پر ہنسنے سے شکنیں سی پڑ جاتی تھیں۔

"تو کس طرح لے بھاگی وہ تمہارے شوہر کو---؟" تارہ نے میز پر کہنیاں ٹکا کے پوچھا۔

اور روشنی نے غنی اور سٹھانی کا پورا معاشقہ سنا دیا۔

یہاں آکر وہ غنی کی بے وفائی اور اپنے دکھوں کو بھولتی جارہی تھی۔ اگر انسان کو چین نصیب ہو' "ڈریم لینڈ" کے باسیوں جیسے عشق و آرام ملیں' تو پھر غنی جیسے بے وفا مردوں کے متعلق سوچنے کی کیا ضرورت تھی۔ نینا نے اسے اپنی پرانی ساریاں دی تھیں' نئے فیشنوں کے بلاؤز اور جوتے' شلواروں کے سوٹ۔ وہ اکثر روشنی کو اپنے ساتھ لے جاتی تھی اور آنے جانے والوں سے ایک دوست کی طرح تعارف کرواتی۔ مگر نیناں کی دادی کو اس کی یہ خاطریں قطعی نہ بھاتی تھیں۔ جب وہ دوسرے نوکروں کی طرح روشنی سے بھی ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیتی تھیں تو نینا اس کا ہاتھ پکڑ کے لے جاتی۔

"رانی جی یہ ہمارے سرونٹ اسٹاف کی لڑکی نہیں ہے۔ یہ تو ایک جاگیردار کی بیٹی ہے۔ بچاروں پر بڑی مصیبت آئی ہے آج کل۔"

پھر ایک دم بوڑھی رانی کے دل میں روشنی کے لیے ہمدردی کے سوتے پھوٹ پڑتے۔

"بھگوان غارت کرے اس راج کو جس نے ہمارے بچوں کا چین و آرام چھینا۔ بڑھاپے میں ہماری شان گھٹائی۔ آج یہ دن آن لگے کہ ہمارے تیرے میرے لیتے پھریں"

اس راج کا نام سن کر رادھاکشن بھی دوڑتے ہوئے آئے: "رانی جی اس راج کو برا نہ کہو۔ ارے اب تو ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ بس اپنی موت ہی سمجھو۔ یہ تو اسی راج

کی برکتیں ہیں کہ ہمارے لیے ایک در بند کیا تو ستر در کھول دیے۔ اب صرف اپنے بھاگوں کی بات ہے رانی جی۔ اگر ہمارے بھاگ میں لکھا ہے تو آپکا بیٹا اسے آن بان سے رہے گا"

"تھو ہے اس آن بان پر۔۔۔" کروٹ لینے کی کوشش میں وہ بڑبڑائیں۔

"لو بھلا سو پشت سے تخت و تاج کے سائے میں پلنے والوں کو بھی اب بھاگ سنوارنے کی ضرورت آپڑی۔ کبھی تمہارے پتا کے زمانے میں کسی انگریز کے بچے کی اتنی ہمت نہ پڑی جو یوں چھوٹی کنکریاں پہاڑوں کو مارنے دوڑتیں۔"

رادھا کشن چپ ہو جاتے۔ اپنے منتخب ہوجانے کے بعد ان چھوٹے چھوٹے سنگریزوں کو چکی میں ڈال کر پسوانے کی ترکیبیں سوچتے۔ انہیں پیروں سے مسلنے کی اسکیمیں بناتے۔

ان دنوں روشنی کو یوں لگتا تھا جیسے دیو اسے سوتے میں اٹھا کر ہمالہ کی چوٹی پر چھوڑ گئے ہوں۔ اتنی بلند پوزیشن حاصل کرنے کے بعد وہ گھنٹوں تارہ کی طرح بال بنانے' نشاط کی طرح ساڑھی باندھنے اور نینا کی طرح ہنسنے کی کوشش کرتی تھی۔ بہت سنبھل کے صحیح تلفظ ادا کرنے کی کوشش کرتی۔ بلکہ سب کے سامنے تو عموماً" خاموش ہی رہتی تھی۔ جب تارہ کا دوست راشد اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا تھا تو اس کے ہاتھ کانپنے لگتے اور زبان اپنی جگہ سے ہلنے کی قسم کھالیتی۔ پھر سب مل کر اس کا خوب مذاق اڑاتے تھے۔ بلکہ تارہ نے تو کئی بار ذرا مہذب الفاظ میں اسے ڈانٹ بھی دیا۔ مگر ایسے موقعوں پر راجیش تارہ سے جھگڑ بیٹھتا۔ ایک بار اس نے مذاق میں تارہ سے کہا بھی تھا کہ روشنی تمہاری سوسائٹی میں پہنچ کر اپنی اصل قدر و قیمت کھو بیٹھے گی۔ اور اس بات پر ان دونوں میں اتنے زور کا جھگڑا ہوا کہ نینا کو لڑائی ختم کرانے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ آخر راجیش نے تارہ سے معافی مانگ لی۔ وہ بہت سیدھا اور نرم دل تھا۔ اتنا بھولا کہ ایک معمولی سے جج کا بیٹا ہونے کے باوجود نینا کو اپنی زندگی سمجھے ہوئے تھا۔ مگر روشنی کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا تھا کہ نینا بھی اسے آکاش کا تارہ سمجھے ہوئے تھی۔ جیسے اس کے لیے زندگی بھر ترسے گی۔ اب نینا کی طبیعت اکثر خراب رہنے لگی تھی۔ وہ اپنی بیماری سے بہت پریشان رہتی۔ لوگوں سے ملنا جلنا بھی کم کردیا تھا۔ کئی کئی دن کالج نہ جاتی۔ ہر وقت سر چکراتا رہتا تھا۔ کسی وقت ٹھیک طرح کھانا نہ کھا سکتی۔ سب اس کی بیماری سے پریشان تھے مگر کسی ڈاکٹر کا باقاعدہ علاج نہ ہوتا۔

رادھا کشن یوں ہی اپنے کاموں میں منہمک رہتے۔ نشاط اس کی ہمت بندھایا کرتی

تھی اور تارہ معمولی سی مزاج پرسی کرجاتی۔ نشاط اکثر اسے تنہا کمرے میں بٹھا کے جانے کیا کیا سمجھاتی تھی کہ روتے روتے نینا نڈھال ہوجاتی اور اس کی بیماری کوئی نئی صورت اختیار کرلیتی تھی۔

نشاط کی چالاک نظروں سے روشنی نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ضرور نینا کو شادی کے لیے مجبور کررہی ہے۔ اس دن روشنی کو بے حد غصہ آیا۔ اتنی روشن خیال اور اونچے گھر کی لڑکی کو بھی کیا یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی پسند سے شادی کرسکے۔ کیا "ڈریم لینڈ" جیسے ترقی پسند محل میں بھی کوئی اپنے سپنوں کو سانچا نہ کرسکے گا---؟

وہ سب تفریحاً" عثمان ساگر آئے ہوئے تھے۔

یہاں پر کتنے اونچے نیچے خم تھے؟ پوری فضا تلاطم خیز تھی۔ دور تک ساگر کی موجوں کا مدوجزر اور درختوں کے ہلکے گہرے سائے' تارہ اور نینا کی رنگین پھڑپھڑاتی ہوئی ساڑیاں۔ راج کے اسی وقت کہے ہوئے ادھورے ادھورے شعر۔ تارہ کے گیت اور راشد کے قہقہے--- اور ان سب پر امنڈتے ہوئے اودے بادلوں کی دھند۔

روشنی کا دل ناچ اٹھا۔ جی چاہا پیروں میں گھنگرو باندھ کر اس طرح ناچے کہ ساری دنیا الٹی گھوم جائے اور وہ ناچتے ناچتے کہیں گر کے ہمیشہ کے لیے خاموش ہوجائے۔ وہ سب اچھے اچھے شعر گنگناتے ہوئے جو راجیش کی طرح دوسرے شاعروں نے اپنے محبوب کے کانوں میں کہے ہوں گے۔ ان ہی درختوں کی چھاؤں میں جہاں راج بیٹھا نینا کے حسن کی بلائیں لے رہا ہے شاعروں نے وہ شعر تخلیق کیے جو آج بھی زندہ جاوید ہیں۔ ہر بار جب محبت یہاں کسی کے دل کے تار جھنجھوڑ دیتی ہے تو وہ شعر خود بخود سطح آب پر رقصاں ہوجاتے ہیں۔ یہاں کی مدہوش فضاؤں میں گھل جاتے ہیں۔ نہ جانے کتنی تاراؤں اور نشاطوں پر ایسی نظمیں بھی لکھی گئی ہوں جو اگر نہ لکھی جاتیں تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ کیونکہ وہ نشاط کے میک اپ کے ساتھ مرجاتی ہیں۔ یہاں ہمیشہ نینائیں شراب و خمار کے ساغر چھلکائیں گی اور ان فضاؤں کو اپنے حسن کی تابناکی بخشیں گی۔ اس رو پہلے پانی کی لامحدود وسعتوں میں نہ جانے کتنے آنچلوں کی رنگینی سمٹی ہوئی ہے اور ریشمی آنچلوں کے ساتھ رنگین کلیوں کو چار طرف پھیلا گئی ہے۔

نینا کے ساتھ جھک کر پانی میں اپنا عکس دیکھنے والا راج سوچ رہا ہے کہ وہ اس وقت مررہے تو اچھا ہو۔ مگر وہ نہ مرسکے گا۔ ممکن ہے جسمانی طور پر مرجائے۔ مگر یہ فضائیں

ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ یہ محبت لافانی نغمے ہمیشہ گونجا کریں گے۔

روشنی کی اس محویت کو دیکھ کر راشد کی بے تاب نظریں نہ جانے اس سے کیا کہنا چاہتی تھیں۔ مگر تارہ کی تیز نگاہیں راشد کی کڑی نگرانی کرتی رہیں۔ جب وہ چائے کی ٹرے لیے ہوئے سب کے قریب آئی تو راشد نے نینا کو بتایا۔

"میں تمہاری اس دوست کی زندگی کے پلاٹ پر ایک ناول لکھوں گا۔"

نینا ابھی تک پیالی ہاتھ میں تھامے راجیش کے ساتھ گھومنے کا کوئی منظر یاد کر رہی تھی' اس لیے یہ فضول سی بات اس نے سنی ہی نہیں۔ مگر راجیش نے کارڈز ایک جانب سمیٹ کر کہا۔

"اور اس کتاب کا انتساب تارہ کے نام ہونا چاہیے۔"

"مجھے معاف کیجئے گا راشد صاحب۔" تارہ نے بگڑ کے کہا "برائے مہربانی میرا نام ان بے ہودہ باتوں میں نہ لائیے گا۔"

"کیوں۔۔۔؟" راج نے پوچھا۔ "کیا روشنی اور تارہ کا ساتھ نہیں ہو سکتا!۔"

اور سب کے قہقہوں میں تارہ نے ہنس کے کہا:۔

"جی ہاں' کیونکہ میں آپ جیسے انٹیلکچوئل کو بے وقوف سمجھتی ہوں' جو سماج اور تاریخ کے دھاروں کو اپنی مرضی کے مطابق موڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اس نچلے طبقے کو اونچائی پر پہنچانے میں آپ خود کھائی میں جا گریں گے۔"

اچانک مسرت کی وہ قوس قزح روشنی کے سامنے ٹوٹ گری۔ ساگر کی خوبصورتی غائب ہونے لگی۔ اور پھر جی چاہا کہ پانی کی گہرائیوں میں کہیں جا چھپے۔

ان دنوں "ڈریم لینڈ" میں بڑی چہل پہل مچی رہتی۔ رادھا کشن روزانہ اپنی صدارت میں کہیں ایک جلسہ منعقد کراتے اور ایک مخصوص تقریر (جس میں اپنے آباؤ اجداد کی عوام سے ہمدردی اور کمیونسٹوں کی مخالفت ہوتی تھی) کر آتے۔ یہ تقریریں ان کے ایک پرانے کانگریسی دوست نے بڑی مشق کے بعد انہیں رٹا دی تھی۔

وہ ریکارڈ کی طرح ہر جگہ اسے اگل آتے۔ ان جلسوں میں سننے والوں کے لیے بھی رادھا کشن کو پیسے خرچ کرنا پڑتے تھے' کیونکہ گلیوں میں پھرنے والے بچے بھی صاف کہتے پھرتے تھے کہ جلسے میں بلانے کے لیے ہمیں کچھ دو ورنہ نہیں آئیں گے۔

گھر میں رانی جی' تارہ اور نشاط اور رادھا کشن اپنے دوستوں میں بیٹھے مستقبل کے

شاندار پلان بناتے اور سب کے قہقہوں سے در و دیوار گونج اٹھتے تھے۔ رانی جی بیچاری گٹھیا کی مریض تھیں' اس لیے وہ پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر آتی تھیں۔

ان ہی دنوں جگمگ کرتی نینا کی سالگرہ آن پہنچی۔

روشنی نے بڑے جوش و خروش سے اس تقریب میں حصہ لیا۔ "ڈریم لینڈ" کے چپے چپے کو برقی قمقموں سے جگایا گیا۔ چاروں طرف، پھولوں اور روشنیوں کی لتائیں جھوم رہی تھیں۔ الیکٹرک کے چھوٹے فوارے میزوں پر سجے ہوئے تھے جن میں گلاب کی خوشبو مہک اٹھتی۔

بڑی میز کے گرد سجائی ہوئی موی شمعوں کی جھلملاہٹ اور آرکسٹرا کے دھیمے شور میں روشنی نے مہمانوں کو گیت سنائے۔ تارہ نے وائلن پر کلاسیکل دھنیں بجائیں۔ روشنی نے دلاری کے ساتھ مل کر بھارت ناٹیم ناچ دکھایا اور نینا کو پھولوں' تحفوں اور مبارکبادوں سے چھپا دیا۔

روشنی اس دن بہت مسرور تھی۔ مگر بار بار یہ خیال اسے اداس بنا دیتا کہ نینا آج ہر دن سے زیادہ مضمحل تھی۔ آج اس نے ہالی وڈ کی ایکٹریسوں کی طرح سفید چمکدار لباس پہنا تھا' جس کے اندر سے اس کے سیمابی جسم کی گلابی' بجلی کی طرح کوند رہی تھی۔ آج اس کے سیاہ ریشمی بال فوجی ٹوپیوں کی طرح اوپر اٹھے ہوئے تھے اور انہیں موتیوں سے باندھا گیا تھا۔ اس کے بالوں میں سفید گلاب کی کلیاں ٹنکی ہوئی تھیں اور گلے میں سچے موتیوں کی مالا پڑی تھی۔ جب روشنی اس کا ہاتھ پکڑ کے باہر لائی تو لوگ تالیاں بجا رہے تھے' مگر نینا جیسے اپنی ارتھی کو آگ لگانے آئی تھی۔ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں' ہونٹ کانپ رہے تھے اور اس اداسی نے اس کے حسن کو فروزاں کردیا تھا۔

اس کے نیم عریاں جسم پر جانے کتنی گرسنہ نگاہیں رینگ رہی تھیں۔ پھر مردوں کے اس ہنگھٹ میں روشنی نے نینا کے لیے سب کو پرکھا۔ مگر آج راجیش اس محفل میں نہیں تھا۔ اور اس کی غیر موجودگی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ نینا تک اپنا ہاتھ نہیں لے جاسکتا۔

آج نشاط نے بالوں کے ساتھ ساتھ اپنی بھوؤں کا اسٹائل بھی بدل دیا تھا۔ اور شمع محفل بننے کی کوشش میں پوری طرح مصروف تھی۔ اس کا بوڑھا شوہر رحمان سیٹھ (جو آٹے کی بھری ہوئی بوری معلوم ہو رہا تھا) اپنے مصنوعی دانتوں کو بار بار ٹھیک کررہا تھا۔ اس کی

ندیدی نگاہیں بار بار نینا پر اٹھتی تھیں اور وہ بڑی بے تکلفی سے اس کا مزاج پوچھ رہا تھا۔
پھر تارہ نے موضوع بدلنے کے لیے اس سے مسکرا کے پوچھا۔ "رحمان صاحب آپ کیوں نہیں پارلیمان کے لیے کھڑے ہوجاتے۔ آپ کا تو کافی دور دور تک اثر ہے؟"
اور وہ اپنے پھولے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار طاری کرکے بولا۔
"میں صرف بزنس مین ہوں مس تارہ۔ الیکشن کے لیے اپنا مال بیچنے والوں سے ہی مجھے کافی منافع مل رہا ہے۔ پھر ان حماقتوں میں کیوں پھنسوں؟"
رحمان سیٹھ نے دراصل یہ بات تارہ سے نہیں بلکہ رادھا کشن سے کہی تھی۔ وہ باری باری ہر شخص سے کہہ چکا تھا کہ اس وقت نشاط کے جسم پر جو جواہرات ہیں ان کا مقابلہ ہندوستان میں آغا خان کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا--- اور جواہرات کا یہ ذکر رادھا کشن کے سینے پر دھموکوں کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ ابھی اٹھ کر رحمان سیٹھ کو قائل کرچکے ہوتے' اگر رحمان کے ہاتھ انہیں اپنا ایک انمول ہیرا نہ بیچنا پڑتا۔
پھر بھی رادھا کشن کے لیے نشاط کے جسم کی قیمت بوڑھے رحمان سیٹھ کی تلخ باتوں سے زیادہ نشاط انگیز تھی۔ آج بھی کتنے نوجوان اسے باہوں میں سمیٹ کر ناچنے کو بے قرار تھے۔ رادھا کشن سوچتے کہ وہ ابھی قطعی بوڑھے نہیں ہوئے ہیں اور انہوں نے خضاب کے ساتھ ساتھ جو دواؤں کا استعمال کیا وہ محض حفظ ماتقدم کے طور پر ہے' ورنہ نشاط جیسی عورت ان پر کیوں مرتی---؟
رات کے ایک بجے مہمانوں کو رخصت کرکے روشنی نینا کے کمرے میں آئی تو اس کے دل میں دیوالی کے چراغوں کا اجالا بھرا ہوا تھا۔ وہ آج نینا سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ یوں ہی بے معنی اور اچھی اچھی باتیں۔ آج آنے والی عورتوں کے رومان۔ ان کے کپڑوں اور زیوروں پر تبصرے۔ نوجوانوں کی ندیدی نظریں اور نینا کا سرد مہر برتاؤ۔ نشاط کے عاشقوں کے قصے اور رحمان سیٹھ کی حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی جیسے--- جیسے --- نہ جانے وہ کیا کیا بکتی رہی اور نینا معمولی سی ہوں ہاں کے ساتھ سنتی رہی۔
"اچھا نینا دیوی' آج آپ کا سب سے زیادہ پسندیدہ مہمان تو نہیں آیا۔ مگر سب سے زیادہ ناپسندیدہ مہمان کون تھا---؟"
نینا چونک پڑی اور شبہ کی نظروں سے روشنی کو دیکھنے لگی۔
وہ نینا کے غصہ سے سہم گئی اور اٹھ کر سامنے کی درییچیاں کھول دیں۔ باغ کی

جانب سے مختلف پھولوں کی مہک اندر آنے لگی۔ آسمان پر بدلیاں تیر رہی تھیں۔ پندرہ تاریخ کا چاند بڑی بے ساختگی سے مسکرا رہا تھا۔ اور باغ کے اونچے درخت چاندنی کی چادر اوڑھے سو رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے پٹ پر سر ٹیکے بڑی دیر تک کھڑی رہی۔

"کیا سوچ رہی ہو روشنی---؟" نینا اس کی معنی خیز خاموشی سے اکتائی جا رہی تھی۔

"کچھ نہیں" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"آج مجھے وہ دن یاد آرہا ہے جب غنی نے اماں سے جہیز لینے سے انکار کردیا تھا کہ مجھے صرف روشنی چاہئے' دولت نہیں۔ مگر سیٹھ کی بیوی نے صرف دولت سے ہی تو اسے کھینچ لیا۔ آج راجیش صاحب نہیں آئے اور آپ اتنی اداس رہیں۔ ممکن ہے انہوں نے سوچا ہو کہ وہ آپ کی دولت کا تماشا نہیں دیکھیں گے۔ مگر یہ جھوٹ ہے۔ ایسے خواب مرد شادی سے پہلے دیکھا کرتے ہیں۔ پھر ہمیشہ کے لیے ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔"

"ایسا نہ کہو روشنی---" نینا کہنیوں کے بل قالین پر اوندھی لیٹ گئی۔

"آج راج کہیں بھی ہو وہ میرے ہی متعلق سوچ رہا ہوگا۔ وہ مجھے پالینے کو اپنی قسمت کی معراج سمجھتا ہے۔ مگر ایسا کیوں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ یہ بات بھول جائے۔ میں اس کے علاوہ کسی اور کی بھی تو ہوسکتی ہوں۔ اب میں اسے کچھ نہیں دے سکتی تو وہ سر پٹک پٹک کر نہ مرے۔ ایسے ناممکن خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ ایسے خوابوں سے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔" وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونے لگی۔ روشنی کھڑکی چھوڑ کے اس کے پاس آبیٹھی۔

"اگر آپ کی محبت سچی ہے تو آپ کو راج سے کون چھین سکے گا۔ کون آپ کی مرضی کے خلاف مجبور کرسکتا ہے۔ اور نشاط تو چاہے---" مگر نینا نے جلدی سے روشنی کا منہ بند کردیا۔

"میں جانتی ہوں کہ آج تمہیں معلوم ہوگیا۔ ہاں ڈیڈی' ایک بار مجھے پچاس ہزار کے بدلے رحمان سیٹھ کے ہاتھ بیچ چکے ہیں۔ خیر مجھے تارہ سے یا نشاط سے کیا شکایت' جب کہ--- جب کہ---" رفتہ رفتہ وہ خاموش ہوگئی۔

روشنی ڈر کے دور ہٹ گئی' جیسے نینا کوئی جادو گرنی ہو' جس نے آج اپنا نیا روپ بدلا تھا۔ اسے چاروں طرف شعلے لپکتے دکھائی دے رہے تھے اور اس آگ میں نینا کی پاکیزگی اور معصومیت جل رہی تھی۔ روشنی کے خوبصورت سپنے سیاہ پڑ رہے تھے۔ گول گھومنے

والے جھولے میں بیٹھی وہ چکرا رہی تھی۔ دیوانوں کی طرح آنکھیں پھاڑے وہ نینا کو دیکھتی رہی۔ اور بڑی دیر کے بعد اپنی قوت گویائی پر قابو پاسکی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا--- مجھے کیا معلوم--- مگر اب بھی کچھ نہیں گیا۔ آپ راج کو لے کر کہیں دور جاسکتی ہیں۔"

"کیسے چلی جاؤں روشنی---" وہ اٹھ کر نینا سے لپٹ گئی۔

"اب تو تین چار مہینے کے بعد---" اور اس نے خود ہی اپنا منہ بند کرلیا۔

اس رات جب ایک گھنٹے تک تھپکیاں دے کر وہ نینا کو سلا کے خود سوئی تو اس نے بڑا عجیب و غریب خواب دیکھا۔ جیسے وہ اس محل سے' اس زمین سے بلند ہوتی جارہی ہے۔ ایک ایسے محل میں پہنچ گئی ہے جہاں ہر طرف رنگینیاں ہی رنگینیاں ہیں۔ جیسے آج پھر کسی دوسری نینا کی سالگرہ ہو رہی ہو اور چاروں طرف نور کا سیلاب سا آرہا ہے۔ ہر طرف مردوں اور عورتوں کے قہقہے کھنک رہے تھے۔ دھیمی دھیمی موسیقی کا شور بلند ہورہا تھا۔ اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے نور کے اس منبع کو تلاش کررہی تھی۔ اچانک اس کی چیخ نکل گئی۔ چھت کے اوپر فانوسوں میں ہاتھ پاؤں بندھی بہت سی الف لیلہ کی ہیروئنیں لٹک رہی تھیں' جن کے چہروں کے نور سے یہ محل جگمگا رہا تھا۔ ان کی زبانوں سے لہو ٹپک ٹپک کر قالینوں کو خوبصورت بنا رہا تھا۔

خوف کے مارے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ نینا کو پکڑے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

دوسرے دن نشاط نے اس سے کہا کہ اگر وہ نینا کے مستقبل کو تباہ کرنا نہیں چاہتی تو ان کے ساتھ میسور چلے۔ نشاط اور نینا کے احسان تلے دب کر' وہ انکار تو کسی صورت میں نہ کرسکتی تھی' پھر یہ تو نینا کے مستقبل کا معاملہ تھا۔ جس کے لئے وہ اپنی جان بھی ہنسی خوشی نچھاور کردیتی۔

پھر جب نینا' روشنی اور نشاط کے ہمراہ واپس آئی تو پہلے کی طرح تندرست ہوچکی تھی۔

روشنی کی گود میں ایک چاند سا بچہ تھا اور نینا کے دل سے گناہ کا بار ہلکا کرکے وہ بڑی مسرور تھی۔

نشاط اور رادھا کشن کی نوازشیں اب روشنی پر اور بڑھ گئی تھیں اور نینا کی نگاہیں اسے دیکھ کر یوں جھک جاتیں جیسے وہ قابل تعظیم ہستی ہو۔

راج نے اسے روشنی کی معصومیت سے تعبیر کیا۔ بھلا ان محلوں میں پہنچ کر کوئی لڑکی کسی طرح بچ سکتی ہے۔ اس کی نظروں میں دونوں کی عزت تھی۔ روشنی کی بھی جو اپنی سادگی میں لٹ گئی اور نینا کی بھی جس نے یہاں بھی روشنی کا ساتھ دیا۔ اس نے نینا کی طویل غیر حاضری بھی اسی لیے معاف کردی۔

لوگ روشنی کو دیکھ کر ہنسے۔ نوکروں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ نینا کے دوست اس کی طبیعت پوچھنے آتے مگر روشنی کو ان باتوں کی بالکل پرواہ نہ تھی۔

اس دن بے بی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ اور کسی کو اس کی بیماری کا ہوش نہ تھا۔ کیونکہ آج رادھا کشن کے ووٹوں کی گنتی ہورہی تھی اور ان کے مقابل امیدوار کے ووٹ بڑی تعداد میں گنے جاچکے تھے۔

نینا کا دل ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔ وہ بار بار روشنی کی گود میں پڑے ہوئے بچے کو دیکھتی اور ا کنٹرول آفس سے فون ملاتی' تارہ' نشاط' رانی جی اور رادھا کشن دوپہر سے وہیں تھے۔ نشاط جشن منانے کے پروگرام کی پوری تیاریاں کرچکی تھی۔ اور رادھا کشن کئی بار اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ کر کہہ چکے تھے۔

"تم نے دل کے ساتھ رادھا کشن کی زندگی بھی لوٹ لی ہے نشاط۔"

بار بار نینا کو بچے کے پاس آتے دیکھ کر روشنی سوچنے لگی۔ آخر ماں کی ممتا کا جذبہ کیسا ہوتا ہے۔ کتنا وسیع اور بے پایاں۔ اس بچے کو اٹھا کر وہ باہر کیوں نہیں پھینک دیتی۔ اس کا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتی۔ اسے رحمان سیٹھ کے منہ پر کیوں نہیں مار آتی۔

شام کے چھ بجے نینا کے ہاتھ فون پر تھے۔ اس نے بڑی اداسی سے رسیور رکھ دیا اور کرسی پر آکے گر گئی۔

بڑی دیر کی کوشش کے بعد جب روشنی بے بی کو چپ کرا پائی تو اس نے آہستہ سے نینا کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کیا خبر آئی ہے؟"

نینا کی بڑی بڑی آنکھیں ذرا سی کھلیں اور ان کے اندر بھرے ہوئے درد کو روشنی نے اپنے دل میں بھی محسوس کیا۔ پھر اس نے نیم وا آنکھوں سے روشنی کی گود میں سسکتے ہوئے بچے کو دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ ٹہل ٹہل کر بچے کو بہلاتی رہی۔ نینا کا چہرا کتنا پیلا نظر آرہا تھا۔ اس وقت سے بھی زیادہ جب اس نے روشنی کو اپنا راز بتایا تھا۔ جب

یسور سے واپس آتے وقت ایک بوڑھی یورپین عورت نے کہا تھا کہ آپ کی نوکرانی کا بچہ بالکل آپ کا بچہ معلوم ہو رہا ہے۔

_____ اسے ڈر لگنے لگا۔ جیسے نینا مرچکی ہو۔ وہ اتنی خاموش کیوں ہے۔ اپنے باپ کی شکست پر قہقہے کیوں نہیں لگاتی۔ نشاط کی گردن کیوں نہیں پکڑتی۔ یہ کیسا ظلم ہے کیسا عیش و آرام ہے۔ کیسی آزادی ہے---؟ رات کے دس بجے بے شمار تعزیت کے لیے آنے والوں سے نبٹ کر وہ سب یوں نینا کے کمرے میں آئے جیسے ابھی ابھی کسی کی چتا کو جلا کے آرہے ہوں۔

رادھا کشن پر لرزہ چڑھا ہوا تھا۔ نشاط کا میک اپ غائب ہو چکا تھا۔ اور وہ ٹوٹی ہوئی قبر کی طرح مرمت طلب نظر آرہی تھی۔ تارہ بھی شکست کا احساس بھلانے کے لیے کچھ نہ کچھ بکے جارہی تھی۔

"ہمارے اسی فی صد ووٹ قطعی چرائے گئے' ورنہ ناممکن ہے کہ ان غنڈوں کو اتنے ووٹ مل جائیں۔ اصل میں آج کل کی پبلک پر بھروسا کرنا ہی حماقت ہے۔ وہ سنہرے خوابوں کے جھانسے میں آگئی ہے۔ مگر بقول راج کے اتنا تو میں بھی کہوں گی کہ ہم عام لوگوں تک پھر بھی اپنی آواز نہ پہنچا سکے۔"

"اور عام لوگوں تک آپ کی آواز پہنچ ہی نہیں سکتی۔" راج نے کہا۔

"ہماری سب سے بڑی کمزوری تو راجوں مہاراجوں کا لیبل ہے۔ اور آج کل عوام نوابوں' جاگیرداروں سے بدظن ہو چکے ہیں۔" پھر وہ نینا کے قریب گیا۔

"اتنا رنج نہ کرو نینا ڈیر۔ ان لوگوں کے متعلق تو سوچو جنھوں نے اپنی جان کی بازیاں الیکشن کی خاطر لگا دیں مگر پھر بھی ہار گئے۔"

پھر سب چور ہوگئے۔ صرف روشنی کی گود کا بچہ بے قراری سے رو رہا تھا اور نینا ان سب باتوں سے بے خبر آنکھیں بند کیے یوں ہی پڑی تھی۔

"اسے یہاں سے لے جاؤ روشنی۔ کیا چیں چیں لگا رکھی ہے۔"

تارہ نے بیزار ہو کے کہا اور جب روشنی تارہ کو گھورتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی تو اس نے سکوت توڑنے کی کوشش کی۔

"سنا راج' تمھارا دوست راشد جو روشنی پر ایک ناول لکھ رہا ہے۔ اس سے کہنا تمھاری کہانی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔" راجیش کو خاموش دیکھ کر وہ کہنے لگی:۔

"میں نہ کہتی تھی ہمیں اس نچلے طبقے کو بلندی پر پہنچانے کے خواب نہیں دیکھنا چاہئیں۔ مثال کے لیے چاچا کی شکست اور روشنی کے اعمال دیکھ لو۔

اچانک رادھا کشن کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔

"تارہ تم اس منحوس لڑکی کو اس کے بچے سمیت آج ہی یہاں سے نکال دو۔ میں یہ گندگی اپنے گھر میں نہیں دیکھ سکتا۔" اور پھر پورے "ڈریم لینڈ" پر سناٹا چھا گیا۔

وہ قصے کہانیوں والا پراسرار محل بن گیا۔ جس میں بے شمار جھلملاتے خوابوں کے بھوت ناچ رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے، جیسے یہ کوئی خوبصورت کوٹھی نہیں شمشان گھاٹ ہو۔ جہاں اکیلی روشنی بے شمار خوابوں کی چتائیں اپنے بازوؤں میں سنبھالے کھڑی تھی۔

مٹی کی گڑیا

جلدی جلدی پوری کہانی اپنے باپ کے کانوں میں انڈیل کر ملیشم نے سانس لی تو اسے چکر سا آگیا اور فرط مسرت سے وہ کانپنے لگا۔ با لکشیا بھی اس خوشی میں بے قرار ہو کر اپنے بیٹے سے لپٹ گیا۔

"چل جھوٹا ہے--- نہیں تو جھوٹ بول رہا ہے۔" اس نے امید و بیم کے ملے جلے لہجے میں کہا اور اپنے یقین کو مکمل کرنے کے لیے ملیشم کی کمر میں روپے ٹٹولنے لگا۔

"اچھا تو دکھا کہاں ہیں وہ روپے---" اس نے دونوں ہاتھ یوں پھیلا دیئے جیسے ان رپوں کا حق دار وہی ہے۔ ملیشم نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کا میل رگڑ رگڑ کر پونچھا اور پولے پولے ہاتھوں سے یوں گرہیں کھولنے لگا جیسے سانچے میں سے مٹی کی گیلی گڑیا نکال رہا ہو۔ بے شمار گرہوں کے بعد اس نے ایک ننھی سی پوٹلی پکڑی اور دوسرے ہاتھ میں با لکشیا کا ہاتھ تھام کے خوب اچھی طرح صاف کیا۔ پھر اپنی دھوتی میں بندھے ہوئے نوٹ کو زخم کی طرح چھوا دیا۔

"ہے---؟" وہ خوشی سے آنکھیں پھاڑ کے چلایا اور گھٹی ہوئی آواز میں بولا:۔

"پورے سو روپے کا ہے--- چار پچیس---" ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ کی چار انگلیاں پھیلا کر با لکشیا کی آنکھوں میں گھسا دیں۔ مگر نوٹ کے اس لمس نے کچھ دیر تک تو با لکشیا کو یوں مدہوش سا کر دیا جیسے کرنٹ چھو لیا ہو۔ پھر وہ ملیشم کے اس رویے سے بجھ سا گیا۔

اسی وقت رات کو بھی آنا رہ گیا تھا' ورنہ ملیشم اپنے باپ کے چہرے پر پھیلے ہوئے حسد اور شکست کو کتنے مزے سے دیکھ سکتا تھا۔ اطمینان کی لمبی سانس لے کر وہ اپنے باپ کو ترسانے کے بہانے سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے سر کے اوپر درالکشمی کا سایہ دیکھ کر سہم گیا۔ یوں لگا جیسے درالکشمی اس کی گردن دبوچنے والی ہے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں جلتا ہوا چراغ تھا۔ نیچے سے گردن اٹھا کر دیکھنے میں درالکشمی کتنی اونچی نظر آرہی تھی۔ کسی مندر میں رکھی ہوئی مورتی کی طرح پرہیبت اس کی آنکھوں میں ملیشم نے جو چیز دیکھی اسے کوئی نام نہ دے سکا۔ وہ بیک وقت خاموش اور چیختی ہوئی نظر' جو ملیشم کے دل کو دہلا گئی مگر پگھلا نہ سکی--- کیونکہ اس جادو کا توڑ اس کی کمر میں بندھا ہوا تھا۔

یہ درا کتنی عجیب ہے--- اس نے آنکھیں بند کر کے گھومتے ہوئے دماغ کو ٹھکانے پر لانا چاہا۔ اس کے ہاتھ میں جلتا ہوا چراغ ہے، مگر پھر بھی ساری دنیا کا اندھیرا اس کے سیاہ چہرے پر سمٹ آیا ہے۔ مہادیو کی طرح جس نے سارے سمندروں کا زہر پی لیا تھا کہ آئندہ انسان اس زہر سے ہلاک نہ ہو سکیں۔

اس لمحہ اسے پھر درالکشمی کی آنکھوں میں چھپی ہوئی وہ خوفناک چمک یاد آئی۔ لیکن اپنے ختم ہوتے ہوئے سگریٹ کے ساتھ اس نے خیال کی گردن بھی زمین پر رگڑ رگڑ کے کان میں اڑس لی۔

اس کے پیروں کے نیچے کی زمین روئی کی طرح نرم ہوگئی تھی اور وہ اوپر اٹھتا جا رہا تھا۔ زندگی کی ساری مردہ اور نیم مردہ خواہشیں اس کے آس پاس ناچ رہی تھیں۔ اپنی لنگڑی ٹانگ کے بھروسے پر اتنا اونچا ہو کر وہ پریشان ہوگیا۔ ہاتھ بڑھا کر درا لکشمی کا سہارا لینا چاہا مگر اس کا ہاتھ سو روپے کے نوٹ پر جا پڑا۔ کرکراتا ہوا نوٹ۔ جس پر ہاتھ پڑتے ہی درالکشمی کا ہیولا مدھم پڑنے لگا۔ اور وہ چونک پڑا۔ جلدی سے چاروں طرف دیکھ کر کمر سے بندھے ہوئے نوٹ کو ٹٹولا۔ اس پر ہاتھ پڑتے ہی کتنے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ جدھر دیکھو روشنی کے حلقے گھومنے لگتے۔

چوہے کے بل جیسے کوارٹروں سے دھوئیں کے ساتھ ساتھ چیخ و پکار بھی پوری جنگم بستی (دھیڑوں کی بستی) میں پھیل رہی تھی۔ محلے میں شاید اس وقت کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو خاموش ہو۔

ہر روز رات ہوتے ہی اندھیرا ان کے دلوں میں بھر جاتا اور وہ دن بھر کی ناکامی کا غصہ اتارنے کے لیے ایک دوسرے سے لڑ پڑتے۔ سب اپنے سے کمزور ہستی کو قصور وار ٹھہراتے۔ مائیں بچوں کو مارتیں، ماؤں کو ان کے شوہر پیٹتے، بہوؤں کی خبر ان کی ساسیں لیتیں اور صرف بہوئیں رہ جاتیں، جو دن بھر کی سخت محنت کے بعد شام کو ساس کی گالیاں، شوہر کی مار اور رات بھر کی بھوک کما پاتی تھیں۔ تھوڑے دن وہ قسمت کا لکھا سہ جاتیں۔ روتی چلاتی پٹتی رہتیں۔ جادو گر عورتوں سے دوائیں لا کر شوہر کے کھانے میں ملا دیتیں۔ آخر ایک دن بستی میں دند مچتا کہ فلاں کی بہو کسی مزدور کے ساتھ بھاگ گئی یا اسے کوئی صاحب لے اڑے۔

"اونہہ---" ملیشم نے بے زاری سے منہ پھیر لیا۔ "یہ بستی کب تک روتی رہے

کی جانے---؟"

اس کی بڑبڑاہٹ سن کر با لکشیا قریب آبیٹھا۔

"کیا--- کیا کہہ رہا ہے ملی---؟" اس وقت با لکشیا نے اپنے لہجے سے تحکم اور حقارت کھرچ کھرچ کر صاف کر دیا تھا۔

"تجھ سے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔" اس نے شان بے نیازی سے کہا اور خود ہی با لکشیا کی اکڑ اور دھونس جانے کہاں منہ چھپا کے بھاگی تھی۔ بڑی دیر سے اپنی زبان کو آرام دے رہا تھا۔ ورنہ روزانہ ملیشم اور درالکشمی کے گھر میں گھستے ہی وہ گالیوں سے سواگت کرتا تو پھر سب سو جاتے مگر با لکشیا کی زبان نہ تھکتی۔

ملیشم نے پلٹ کر دیکھا۔ اپلوں میں گھری ہوئی درالکشمی کا ہیولا بالکل چھپ گیا تھا--- دری بے چاری ___ آج اسے دری پر بے اختیار پیار آرہا تھا۔ سارے میٹھے ناموں سے پکارنے کو جی چاہ رہا تھا۔ مگر وہ درا کی طرف دیکھ کر ہی گھبرا گیا۔ دماغ میں بہت سی چکیاں چل رہی تھیں اور وہ گھبرا کے سوچتا کہ کیا سوچے---؟

آج سے پہلے اس کی دنیا میں خوفناک بھوک چھائی ہوئی تھی۔ چیونٹیوں کی طرح خشکے کی بھری تھالیاں اور اس کے سامنے قطار بنائے رینگتی چلی جاتیں۔ وہ سو رہا ہے اور کلال خانے میں رکھے ہوئے سیندھی کے مٹکے اسے لوریاں سنا رہے ہیں۔ وہ اپنی ٹوٹی ٹانگ پر گھسٹ رہا ہے اور کسی شوخ بچے کی طرح روپوں کے ستارے اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

روپے ہر بار اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکل بھاگتے۔ ان دنوں وہ اپنے خالی پیٹ کو ہاتھوں سے دبائے ٹھنڈے پتھروں پر جس کروٹ بھی لیٹتا اس کے تصور میں درالکشمی کی بجائے کوئی اور چیز ہوتی۔ پیٹ بھرنے کی کوئی اور مزے دار چیز ___ دنیا کتنی خوبصورت تھی۔ آرزوؤں اور تمناؤں سے املی کے پیڑ کی طرح لدی ہوئی۔ مگر آج سے پہلے ملیشم نے ان باتوں کے متعلق کیوں نہ سوچا تھا---!

آج درالکشمی کی بدولت وہ سو روپے کا مالک بن بیٹھا تھا' اور درالکشمی کا دھیان آتے ہی زندگی میں پہلی بار' آج اس کا جی پسیج جاتا۔ دوسری عورتوں کی طرح وہ دن میں کئی کئی بار ملیشم اور با لکشیا کی مار کھا کے بھی گالیاں نہیں دیتی تھی۔ کبھی بھاگ جانے کی دھمکی نہ دی۔ مگر اسے مارے بغیر بھی تو چارہ نہ تھا۔ آخر اپنی شکستوں کا بدلہ کس سے لیا

جائے۔۔۔!

اپنی ٹوٹی ٹانگ سے وہ دن بھر گھر میں پڑا مٹی کی گڑیاں بنائے جاتا۔ ایک ہی سی بے شمار گڑیاں۔ جو زندگی بھر ایک ہی زاویے سے کھڑی رہتیں اور اپنے خالق کی مرضی کی تابع رہتی تھیں۔

ان گڑیوں کو بنانے میں وہ اتنی محنت کرتا تھا کہ پسینے کی دھاریں ماتھے سے ٹپک کر گڑیوں کا کچا رنگ بگاڑ دیتی تھیں۔ پھر بھی بازار میں ان کی کوئی قیمت نہ ہوتی۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں ان کی خوبصورت دیکھ کر ٹھٹک جاتیں تو ان کی مائیں بچیوں کا ہاتھ گھسیٹ لیتی تھیں۔

"مٹی کی گڑیا ہے۔ ہاتھ لگانے سے ٹوٹ جاتی ہے۔"

دن بھر میں وہ چار پانچ آنے سے زیادہ کبھی نہ لایا۔ اسی لیے درالکشمی کے نوکری سے واپس آتے ہی وہ لڑنا جھگڑنا شروع کردیتا تھا۔ حالانکہ درالکشمی نے محنت کرکے سارے گھر کو پالنے کا احسان کبھی نہ جتایا۔ کبھی اپنی تنخواہ میں سے ایک پیسہ نہ مانگا۔ ہمیشہ نوکری پر سے اپنے حصے کا آدھا کھانا اس کے لیے لاتی رہی اور اب کتنی خاموشی سے سو روپے کے عوض اپنے مالک کے پاس چلی جائے گی۔ شریف گائے کی طرح۔ جبھی تو بڑی بوڑھی عورتیں لڑکیوں کو گائے سے تشبیہہ دیتی ہیں۔ دونوں کا یہی فرض ہے کہ مالک کے اشارے پر گھومیں۔ بچاری گائیوں کے سپرد بھگوان نے کتنا مشکل کام کردیا ہے۔ ساری دنیا کو اپنے سینگ پر اٹھائے کھڑی ہیں اور جب تھک کر اپنا سینگ بدلنا چاہتی ہیں تو دنیا میں کتنے بھونچال آجاتے ہیں۔ مگر آج تو اسے کوئی بھونچال نظر نہ آیا۔ دری نے اس کی پوری بات نہ سن لی تھی اور اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ چراغ ہاتھ میں تھامنے بالکل ساکت کھڑی رہی۔ پھر چراغ کی لو نے بڑھ کر اس کی کلائی کو ڈس لیا تو لڑکھڑا کے وہ گر پڑی اور گڑیوں سے بھری ٹوکری لڑھک گئی۔ جھنجلا کر اس نے چراغ گڑیوں پر پٹک دیا۔

"کیسی گڑیاں بناتا ہے تو؛ ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ گئیں۔ کھیلنے والے بچے کیا جانیں یہ کتنی نازک ہوتی ہیں۔"

وہ درالکشمی کے غصہ پر حلق پھاڑ کے ہنسنا چاہتا تھا مگر اس کا دل خالی گھڑے کی طرح ہنسی سے خالی تھا۔ بھلا آج اس ذرا سے نقصان پر درا کیوں گھبرائی جارہی ہے۔

"جانے دے۔ جانے دے۔" وہ ہنسی سے مایوس ہو کر بولا۔۔۔ "بکاؤ چیز ہے ہماری بلا سے ٹوٹے یا رہے۔"

آج پہلی بار درالکشمی کے غصہ کو اس نے ہنس کر برداشت کیا تھا۔ بے چاری کا ہاتھ جو زور سے جل گیا ہے۔ خیر اب صاحب کے بنگلے میں جا کر اس کی زندگی سدھر جائے گی۔ اس وقت اسے پگلی درگا یاد آئی جو کسی بنگلے سے نکال دی گئی تھی اور اب سڑکوں پر برہنہ چیختی چلاتی پھرتی۔ مگر جنگم بستی کے مرد اسے دیکھ کر غصہ میں آجاتے تھے۔

"ارے بنگلوں میں پہنچ کر ہمارے نصیب جاگ اٹھتے تو بھلا ہی نہ تھا۔ بھاگتے وقت یہ کیوں نہ سوچا تھا کہ تو بنگلے کی بیگم صاحبہ نہیں جو سدا راج کرے گی۔"

مگر درالکشمی بڑے نصیبوں والی ہے۔ وہ ضرور بنگلے کی بیگم صاحب بنے گی۔ ملیشم اپنے دل کو سمجھانے لگا اور درالکشمی کے ساتھ گزارے ہوئے دن ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے سامنے سے گزرنے لگے۔

درالکشمی ہمیشہ اس کے قریب رہی۔ ان کے جھونپڑوں کے درمیان ایک بانس کی دیوار حائل تھی۔ اسے درا کی پیدائش کا وقت بھی یاد تھا' جب لڑکی ہونے پر اس کے باپ نے بیوی کو خوب مارا تھا' اور اپنے باپ کی فلک شگاف چیخوں کو سن کر درا نے اپنے کمزور احتجاج کو فضول سمجھا تھا اور سہم کر خاموش ہوگئی تھی۔ اس دن سے ملیشم نے پھر کبھی درا کی چیخیں نہیں سنیں۔ ہر احتجاج کو دل کے قبرستان میں دفن کر دینا اس کی فطرت بن چکی تھی۔

جب تک وہ کھانے کمانے کے قابل تھا اس نے کبھی درا لکشمی کے خلوص و محبت کا جواب نہ دیا پھر مزدوری کرتے میں وہ سیڑھی سے پھسل کے گرا تھا تو سب سے پہلے دوڑتی ہوئی درا لکشمی ہی اس کے پاس آئی تھی۔ وہی اس کے ساتھ ہسپتال گئی۔ اپنے نو بہن بھائیوں کا دھندا سمیٹ کر وہی اس کی ٹانگ پر مالش کرنے آتی تھی۔ وہ ملیشم کی صورت اور جوانی کی بجائے اس کی بے بسی اور بیماری پر ہی تو ریجھی تھی۔ محبت ان کے دلوں میں ایسے ہی ناممکن راستے سے داخل ہوئی تھی۔

دن بھر وہ باپ کی جھڑکیاں' بڑے بھائیوں کے طعنے اور بھاوجوں کی گالیاں سننے کو زخمی کتے کی طرح کونے میں پڑا رہتا تھا۔ اپاہج آدمیوں کو بھیڑیوں کی طرح پھاڑ ڈالنے کو وہ لوگ برا نہ سمجھتے تھے۔ زمانے کی سرد مہری نے مروت اور محبت کے فرضی ڈھکوسلے بھی مٹا دیئے تھے۔ ایسے وقت صرف درا ہی اسے ڈھارس بندھاتی تھی۔ ٹوٹی ٹانگ ایک پل بن گئی تھی جسے الانگھ کر درا اس کی جانب آگئی۔ اس کے مستقبل میں پھیلا ہوا اندھیرا دیکھ کر

مارے ہمدردی کے بیاہ کرنا بھی منظور کرلیا تھا۔ یہ درا ہی تھی جس کے آنے پر ملیشم کے کاندھوں پر دو پر نکل آئے تھے اور وہ ناممکن فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔ پھر وہ رات آگئی' جب نئے کپڑوں اور باجوں کے بغیر ہی درالکشمی دلہن بن کر اس کے گھر آگئی تھی۔ آج اس کی پرانی ساری ہلدی میں رنگی ہوئی تھی اور سندور کا ٹیکا ملیشم کی غلامی کی مہر بنا اس کے ماتھے پر چمک رہا تھا۔ اس کی ماں اپنے لنگڑے بیٹے کی شادی پر اور کیا خرچ کردیتی---!

اس رات آتے ہی درالکشمی نے اس کے لیے دوا بنائی تھی اور ملیشم سے بے حد خفا تھی۔

"ایسی اجاڑ دلہن--- کیا میں دلہن لگتی ہوں---! تو میرے لیے آئینوں والی چوڑیاں بھی نہیں لایا"

اس کی آنکھوں میں آئینے جھلملانے لگے تو ملیشم نے ہاتھ میں مٹی اٹھا کر قسم کھائی تھی کہ وہ بہت سی چوریاں لادے گا۔ اس دن سے درا نے ہزار بار اسے وعدہ یاد دلایا اور ہزار بار اس کا جی چاہا کہ مٹی کی گڑیا ایک آنے میں بکنے کی بجائے سو روپے میں بکنے لگے تو کتنا اچھا ہو۔ وہ پچاس روپے میں اپنی ٹانگ کا علاج کروالے اور دونوں ٹانگوں پر دوڑتا ہوا باہر نکل جائے۔ پھر جب شام کو گھر واپس آئے تو اس کے پاس چھم چھم کرتی چوریاں ہو۔ ایک لال ساڑی ہو۔ چاول ہوں اور ایک تھلیا میں بھری سیندھی ہو۔ وہ ہنس ہنس کر درالکشمی کو دلہن بنائے گا۔ اسے سرخ ساڑی پہنا کے ماتھے پر سیندور کا ٹیکا لگائے گا تاکہ درا کا دلہن بننے کا ارمان پورا ہوجائے۔ پھر نائنا کو بھی معلوم ہوجائے گا کہ وہ صرف بوڑھا بیل ہی نہیں ہے' جسے مفت میں کھانا دیا جاتا ہے۔ اس کی مصروفیت کو دیکھ کر بابا لکشیا کو غصہ آجاتا تھا--- "یہ کیا مٹی کی پتلیاں بنائے جاتا ہے۔ کبھی ان سے بھی ہماری قسمت جگی ہے---؟"

مگر آج ملیشم کی قسمت ایک ہی گڑیا نے جگا دی تھی۔ آج وہ دری کی ہر فرمائش پوری کرسکتا ہے۔ صرف چوڑیاں ہی کیا' سو روپے جیب میں ڈال کر تو کئی درا لکشمیاں خریدی جاسکتی ہیں--- اور آج رات گیارہ بجے صاحب آکر درالکشمی کو لے جائیں گے۔ پھر اس گھر کے آنگن میں چونے کے پھول کھلانے والا کوئی نہ رہے گا۔ اس کی ٹوٹی ٹانگ پر کوئی مالش نہ کرے گا۔ اب درالکشمی خود بھوکی رہ کر اس کے لیے کھانا نہیں لایا کرے گی۔ وہ اپنا غصہ کس پر اتارے گا---! درالکشمی کے بغیر زندگی کا تصور کتنا نامکمل ہے۔

اتنی اچھی دری کے لیے وہ کیا کرے۔ کیسے بتائے کہ یہ سو روپے کتنے کمینے ہیں جو آج درا کو اس سے دور کر رہے ہیں کاش وہ بھی ایک لنگڑا مرد ہوتی جس کی قیمت دنیا کے بازار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک بے جان مٹی کی گڑیا نہ بنتی۔

سو روپے کے نشے پر تلخ سی لہریں ابھرنے لگیں۔ جیسے آج اس کی دوسری ٹانگ بھی گر کے ٹوٹ جائے گی اور وہ ہوا میں معلق ہوجائے گا۔

پھر بستی والے بھی اپنے وقت پر تو بھیگی بلی بن جاتے ہیں مگر دوسرے کی ذرا سی بات کو یوں گھر گھر پہنچاتے ہیں جیسے کسی پوجا کا پرشاد بانٹ رہے ہوں۔ اسی کا پڑوسی رامیا ایک سال پہلے ہی پچاس روپے میں اپنی بیٹی کو کسی سیٹھ کے ہاتھ فروخت کرچکا تھا۔ مگر آج اپنے آنگن میں کھڑے ہو کے محض ملیشم کو سنانے کے لیے کہہ رہا تھا:۔۔۔

"پیٹ کی خندق بہت بڑی ہے بھائی۔ صرف ایک عورت کی لاش سے نہیں بھر سکتی۔"

ملیشم نے آگے رامیا کی بات سننا ہی نہ چاہی۔ جب سے اس کی بیٹی گئی تھی وہ ایسی ہی خوفناک باتیں کرتا تھا۔ اصل میں وہ جھنروس بالوں والی راجا نے یہ بات سن لی تھی، اور اپنی جوؤں کی طرح شام کو بستی بھر میں یہ بات پھیلا دی تھی۔ نما کی ساس نے بیچ باڑے میں کھڑے ہو کر محلے کی بہوؤں کو درالکشمی کی یہ سعادت مندی سنائی تھی۔ پھر ملے جلے کواٹروں میں یہ بات دھواں بن کر چھا گئی۔ جنگم بستی کی ساسوں کو با لکشیا کی قسمت پر رشک آرہا تھا۔ کاش ان کی بہوئیں بھی اتنی قیمتی ہوتیں۔ جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے وہ نل کے پاس جمع ہو کر خوب حلق پھاڑ رہی تھیں۔

"پاڑ آئی پونو۔ اگی دلگنی ایں سونٹی موگڑ کی (غارت ہو جائیں۔ آگ لگے ایسے شوہر کو)۔ دھیڑ واڑے کے مرد اپنی سوکھی ماری بچے لٹکائے ہوئے بیویوں کو دیکھ کر آہیں بھرنے لگے۔ اکٹھے سو روپے میں تو آج تک کوئی دھیڑنی نہ بکی تھی۔ کوئی بڑا نصیبوں والا ہوا تو دس بیس روپے لے مرا' ورنہ بنگلے کے صاحب لوگ تو دھیڑنیوں پر اپنا آبائی حق رکھتے ہیں۔ یوں بھی عورتوں کو روکنے کے لیے کوئی بند نہیں باندھا جاسکتا۔ نہ جانے کتنے صاحب لوگ شکار کھیلنے گاؤں میں آتے ہیں تو جاتے وقت کھیتوں میں تتلیوں کی طرح اڑنے والی لڑکیوں کو بھی انھا کے موٹر میں ڈال لیتے ہیں۔ ان کے بھائی اور شوہر ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے روتے چلاتے بھاگتے ہیں' پھر اپنی حماقت پر کھسیا کر موٹر کا پیچھا کرنا فضول سمجھتے ہیں۔ ان تیز رفتار

موٹروں کو کون پکڑ سکتا ہے---!

چند دنوں بعد وہ لڑکیاں شہر کے چکلے میں جا بیٹھیں یا کسی دوسرے گاؤں میں بھیک مانگتی پھرتیں۔

ان باڑوں کی جتنی عورتیں گھروں میں نوکری کرتی ہیں وہ بنگلوں کی ملکیت ہوجاتیں۔ اسی لیے تو شہر میں آکے عورتیں سو طرح سے کمانے لگتی ہیں۔ بوڑھی عورتوں کو بھیک مل جاتی ہے، بچے معظم جاہی مارکیٹ کے کوڑے میں سڑے پھل ڈھونڈنے نکل جاتے اور مرد کاندھے پر پھاوڑا رکھے مزدوری کی آس میں گھومتے پھرتے۔

شام ہوتے ہی دن بھر کی ناکامی شور بن کر ابلتی۔ ہر گھر میں چیخ پکار مچ جاتی۔ تین تین گز کے کمرے اور بالشت بھر کے آنگن والے کوارٹروں میں پندرہ پندرہ آدمی پیک کیے ہوئے سامان کی طرح فٹ ہوجاتے۔ وہیں سب کے چولہے سلگتے۔ وہیں بچے غلاظت بکھیرتے اور مرد جلتی لکڑیاں کھینچ کر عورتوں کو مارتے تھے۔ بچوں کی چیخوں اور عورتوں کی سسکیوں میں چولہوں کا دھواں مل جاتا۔ یہ گیلی لکڑیاں ہمیشہ رس رس کر جلتی ہیں۔ نہ جانے کب شعلہ بن کر لپک جائیں، مگر اب کیا ڈر ہے۔ اب درالکشمی کی بے پناہ جوانی سے کوئی خطرہ نہ رہے گا۔ ان دو برسوں میں درا کا قد دروازے کی چوکھٹ کو چھونے لگا تھا اور ساڑی کی دھجیاں جسم کے بہت سے بے قابو حصوں کو چھپانے سے قاصر تھیں۔ اس کے سامنے محلے کے غنڈے درالکشمی کو دیکھ کر گانے لگتے:۔

او نلا سیرپا، او یرا رانیکے پلا۔ -پسٹر کی ایکڑ چو سودے اور بنگاری درا۔

(او کالی ساری والی اور لال چولی والی لڑکی۔ کبھی ادھر بھی دیکھ اور سونے کی درا لکشمی)۔

اپنی ٹوٹی ٹانگ پر صبر کرکے وہ خاموش ہوجاتا تھا۔ مگر ہر وقت خدشہ لگا رہتا تھا کہ کسی دن ذرا ان آوارہ چھوکروں کے جھانسے میں آجائے گی۔ نہ جانے کیوں جو بھی درا کو دیکھتا نظریں وہیں جم جاتیں۔ اس کا سیاہ فام جسم سیاہ پتھر کی مورتیوں کی طرح خوبصورت تھا۔ جس دن نوکری سے واپس آنے میں درالکشمی کو دیر ہوجاتی تو خود ہی گھسٹتا ہوا ملیشم بنگلے پر چلا جاتا۔

ایک دن کار میں سوار ہوتے وقت صاحب نے اسے سیڑھیوں پر بیٹھا دیکھا تو تعجب کے مارے نیچے اتر آئے۔ درا کے یقین دلانے پر بھی وہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ یہ لنگڑا کبڑا

اس کا شوہر ہے۔ پھر وہ ملیشم پر ایک دم مہربان ہوگئے۔ اکثر ٹوٹی پھوٹی تلگو میں اس کی ٹانگ کا حال پوچھتے اور ملیشم کے پیہم سجدوں سے بے زار ہو کے ایک آدھ آنہ بیڑی پینے کو پھینک دیتے۔ مگر آج انھوں نے سو روپے کا نوٹ پہاڑ کی طرح اس کی طرف پھینک دیا۔۔۔ ایک دم۔۔۔ اتنے اچانک طور پر کہ ملیشم ان روپوں کے بوجھ سے دب کر حرکت بھی نہ کرسکا۔ صرف اتنا یاد رہا کہ آج رات گیارہ بجے درا چلی جائے گی۔ بچارے یہ صاحب کتنے شریف نکلے۔ وہ یوں ہی کسی دن درا کو روک لیتے تو ملیشم کیا کرلیتا۔ آج دری اپنی قسمت پر جتنا چاہے ناز کرسکتی ہے۔

چولہے کے سامنے جھکی ہوئی درالکشمی کے چہرے پر شعلوں کا عکس ناچ رہا تھا، جیسے وہ بھڑک کر جل رہی ہو۔ با لکشیا اپنے بیٹے کی سرد مہری سے اکتا کر اب اونگھنے لگا تھا۔ لیکن ملیشم چاہتا تھا وہ جاگتا رہے۔ آج خوب جی بھر کے اسے جلائے، آج دل دکھانے کے سارے بدلے گن گن کر لے۔

اپنے باپ سے نفرت کی یادیں بہت لمبی تھیں۔ ان کے پہلے سرے کو یاد کرنا ہوتا تو ملیشم کو بہت پیچھے دیکھنا پڑتا تھا۔ وہ دن، جب وہ دن بھر گندے چیتھڑوں میں لپٹا دودھ کے لیے رویا کرتا تھا۔ ماں صبح اٹھ کر اس کے حلق میں دو بوندیں بھی نہ ٹپکا پاتی کہ با لکشیا ملیشم کی ٹانگ پکڑ کر زبردستی پٹک دیتا تھا۔ دھکے دے کر بیوی کو مزدوری پر بھیجتا۔ اس وقت ملیشم کو ساری دنیا میں اپنا ہمدرد کوئی نہ ملتا تھا۔ صرف ماں ہی تھی جس کا دن بھر انتظار کیے جاتا اور شام کو اس کی چھاتی سے چمٹ کر اچھل اچھل کے دودھ پیتا تو ماں دنیا کی سب سے پیاری چیز بن جاتی۔ ماں کے پیروں تلے سورگ کا تصور کسی ایسے ہی بچے کا ہوگا۔

عورت ہر روپ میں کتنی بڑی نعمت بن جاتی ہے!

روتے میں نڈھال ہو کے وہ اونگھتے اونگھتے ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا تھا۔ چاروں طرف خوبصورت بادل، سنہرے تارے، اور ماں کے ہزاروں ہاتھ منڈلاتے پھرتے۔ کوئی دودھ بھری پیالیاں مسلسل دیئے جاتا۔ پھر اچانک با لکشیا کا ہاتھ اس کے منہ سے پیالہ چھین لیتا اور وہ سوتے میں ہی بسور کر رہ جاتا تھا۔

یہ مضبوط ہاتھ اس کی مسرتوں کے درمیان ہمیشہ سے حائل رہا۔

پھر رفتہ رفتہ ماں کا دودھ چھٹ گیا۔ اب ماں اسے باسی چاول کھلا کے سیندھی پلا دیتی تھی کہ نشے میں خاموش پڑا رہے۔ ماں کا خون چوسنے والی اب ایک اور جونک آگئی

تھی، جس کا حق مار کے اب بھی وہ کبھی کبھی ماں کے سینے سے چمٹ جاتا تھا۔

روز رات کو ماں اپنے پلو میں تھوڑے سے چاول باندھ کر لاتی تھی اور اس کے آتے ہیں گھر میں دیوالی کا اجالا چھا جاتا۔ سب بچے چیخ چیخ کر، ایک دوسرے کو مار پیٹ کے اپنی خوشی کا اظہار کرتے تھے اور ماں سب کو ٹھونک بجا کر چولہے کے پاس چلی جاتی۔ لمحوں اور منٹوں کا شمار کرکے سب چاول پکنے کا انتظار کرتے تھے، جو ماں سب کو تقسیم کر ڈالتی تھی۔ اس بار پھر چھوٹے بڑے حصے پر شور مچ جاتا اور ماں لکڑی اٹھا کے مارنے کو دوڑتی۔

"بھگوان تمہیں غارت کرے۔ تمہارے حلق سوکھ جائیں۔ کچھ اس کے لئے بھی رکھوں یا نہیں، جس کے دم سے گھر میں چراغ جلتا ہے---؟" شاید ہر عورت اس غلط فہمی میں رہتی ہے کہ کبھی نہ کبھی اس کا شوہر زندگی میں اجالا بکھیر دے گا۔ اور پھر وہ خود اپنے آپ کو جلا کر زندگی کی روشنی قائم رکھتی ہے۔ جس کے دم سے گھر میں چراغ جلنے کی امید تھی وہ اس کا باپ با لکشیا تھا۔ دن بھر کمانے کے بعد سب پیسوں کی سیندھی پی لیتا اور نشے میں جھومتا ہوا گھر آتا تو اس وقت بھی اس کی کمریوں جھکی رہتی تھی جیسے منوں بوجھ اٹھائے ہو۔ اونٹ کی طرح گردن جھکائے، ہونٹ لٹکائے، ملیشم نے اپنی زندگی میں کبھی تاتا کو ہنستے ہوئے نہ دیکھا۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ اس نے گھر میں گھستے ہی مار پیٹ نہ کی ہو۔ کسی بچے کو اٹھا کے نہ پٹکا ہو۔

اپنے بہت بڑے حصے کا ایک ایک دانا کھا کے بھی وہ انگلیاں چاٹتا رہتا۔ تھالی میں کوئی گرا پڑا دانہ ڈھونڈے جاتا۔ بچوں کی صورت دیکھ کر تو اسے مارنے کے لاتعداد بہانے مل جاتے تھے۔

سات برس کے ملیشم کو وہ چار بجے صبح سے کان پکڑ کے اٹھاتا اور دن بھر مار مار کے کھیتوں میں کام کرواتا تھا۔ اس زمانے میں اڑتی ہوئی تتلیوں اور ٹڈوں سے مایوس ہو کے ملیشم زمین کو کریدا کرتا تھا، ممکن ہے کوئی دبا ہوا خزانہ مل جائے اور وہ بڑی شان سے تاتا کے سامنے لے جا کر پھینک دے۔ پھر وہ ملیشم کو ضرور پیار کرے گا۔ اس کے زخموں سے لہولہان ہاتھوں پر ٹھنڈا پانی ڈالے گا اور شاید گڑ کی پٹی خریدنے کو ایک پیسہ بھی دے دے۔

مگر ایسا وقت کبھی نہ آیا۔ اس کے ہاتھوں کے زخم دل تک پھیلنے لگے۔ جب وہ اپنی ایک ٹانگ کھو کر گھر میں آ پڑا تو بھائی بہن اپنے ٹھکانوں سے لگ چکے تھے۔ صرف وہی تاتا

کی گالیاں اور مار کھانے کو موجود تھا۔

ان دنوں اس نے کئی بار تالاب میں ڈوب مرنے کی ٹھانی مگر درالکشمی نے روک لیا۔

درالکشمی اس کی زندگی کے ہر کونے پر پھیلے ہوئی تھی۔ اس کی صلاح پر وہ ٹانٹا کو لے کر شہر آگیا اور وہ دونوں محنت کرکے اس کا دوزخ بھرتے۔ نہ جانے کیوں بھگوان بھی بالکشیا کو اپنے پاس بلانا بھول گئے تھے۔

آج بھی بالکشیا اسے جی بھر کے خوش نہ ہونے دے گا۔ آنکھیں مچا کے ملیشم کو یوں گھور رہا تھا جیسے اس کی آنکھ جھپکتے ہی سو روپے کا نوٹ لے کر بھاگنے والا ہو۔

لیکن ملیشم پہلے ہی سے مقابلے کو تیار تھا۔ آج اس کے جسم میں نئی طاقت آگئی تھی۔ یہ سو روپے ہر گھڑی ایک نئی لے میں بجنے لگتے۔

اب وہ اپنی ٹانگ کا علاج کرائے گا۔ ایک نئی دھوتی خریدی جائے گی۔ ساڑھے چار آنے والا سینما بھی دیکھ لینا چاہئے اور عابد شاپ کے ہوٹلوں میں بیٹھ کر کھانا کھایا جائے گا۔ کھانے کے نام پر اسے خان یاد آگیا۔

جب چاول کی کنجی بھی نہ ملتی تو خان سے ادھار لینا پڑتا۔ اب اس کے پاس اتنے روپے ہوگئے تھے جتنی گنتی بھی ملیشم کو نہ آتی تھی۔ کئی بار وہ سیتا پھل کے بیج یا املی کے ہیٹے لے کر حساب کرنے بیٹھا پھر اٹھا کر پھینک دیئے۔ جو خان کہے وہ تو دینا ہی پڑے گا' پھر حساب کرنے سے کیا فائدہ۔

بے چارہ خان تھا بھی شریف آدمی۔ روز شام کو سائیکل لیے بستی میں آتا اور ترس کھا کے سب کی ضرورتیں پوری کردیتا تھا۔ پھر گلی کے چوراہے پر پہنچ کر اندر آنے والے ہر مزدور کی جیب وہیں جھٹک لیتا تھا۔ ملیشم کی آمدنی کبھی دو چار آنے سے آگے نہ بڑھی۔ اس لیے جب خان اسے ہنٹروں سے مارتا تھا تو درالکشمی خان کے پاؤں پر گر جاتی۔ اس کا قرض ادا کرنے کی ذمے داری خود لیتی۔ مگر خان جانتا تھا کہ درا ان دھیڑنیوں میں سے نہیں تھی جو ہر رات کئی کئی روپے کما لاتی ہیں۔ اس سے تو کوئی ہنس کر بات کرتا تھا تو ساری بستی کو اکٹھا کرلیتی تھی۔

ان مہربانیوں کو یاد کرکے ہی تو ملیشم کو یقین تھا کہ آج بھی وہ انکار نہ کرے گی۔ ایک دم سو روپے ملنے کی جو ملیشم کو خوشی تھی' درالکشمی یقیناً اس خوشی میں شریک

ہوگی۔ اس بے چاری کی بھی آج تک ایک خوشی پوری نہ ہوسکی۔

آج اس کی ساری مہربانیاں یوں یاد آرہی تھیں جیسے ہوا کے دوش پر اڑتے ہوئے خزاں رسیدہ پتے آرہے ہوں۔

اپنی لاٹھی ٹٹول کر وہ باہر جانے لگا تو بابا لکشیا چونک پڑا۔ "رات میں کہاں جارہا ہے۔ اس وقت سڑکوں پر موٹروں کا میلہ ہوگا۔"

ملیشم دل میں خوش ہوگیا۔ آج مندر کے پجاری کی طرح نانا اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔

"میں ابھی آتا ہوں۔ تم ذرا درا کو دیکھتے رہنا۔" اس نے آہستہ سے اپنے باپ کے کان میں کہا۔ یوں ہی ایک نامعلوم سا خوف تھا کہ کہیں درا بھاگ نہ جائے۔ مگر بابا لکشیا اپنی عادت کے مطابق چیخ کر بولا۔

"ارے میں اچھی طرح جانتا ہوں' خود ہی اس صاحب کے ساتھ بھاگنے والی تھی۔ اچھا ہوا تو نے دیکھ لیا۔ اگر اس نے ذرا چوں چرا کی تو باندھ کر تالاب میں پھینک آؤں گا' مگر تو آتے وقت میری سیندھی ضرور لیتے آنا۔" پھر وہ مڑ کے خوف سے سہمی ہوئی لکشمی سے بولا---

"مرد جس چھری سے تجھے قتل کرے اس چھری کے بھاگ جاگتے ہیں۔ سمجھی دھیڑ کی اولاد---؟"

دھیڑ کی اولاد نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے ملیشم کی طرف دیکھا اور کوٹھڑی کے اندھیرے میں ڈوب گئی۔

سیندھی کے نشے میں لڑکھڑاتا ہوا ملیشم جب واپس آیا تو صاحب موٹر لیے گلی میں کھڑے تھے اور گھر میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

اس نے موٹر کی طرف جاتی ہوئی درالکشمی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جھونپڑی کے اندر آنے کے بعد وہ درا سے کچھ نہ کہہ سکا۔ سیندھی کا لذت آگیں سرور اس کے حلق میں پھنس گیا اور وہ منہ کھول کر چیخ بھی نہ سکا۔

"میں نے تجھ سے چوڑیاں لانے کا وعدہ کیا تھا نا۔ لے آج لے آیا ہوں۔" وہ رک رک کر بولا اور چراغوں کی طرح چمکتی ہوئی چوڑیاں کاغذ میں سے نکال کر اس کے ہاتھوں میں ڈالنے لگا۔

"کتنے دنوں سے میں نے وعدہ کیا تھا۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"مگر اب ان کی کیا ضرورت---!" درالکشمی کی آواز میں صرف نصیحت ہی ٹٹولی جاسکتی تھی۔

"واہ کیوں نہیں ___ آج تیری ایک تمنا پوری ہوگئی ہے نا--- تو بڑی اچھی ہے درا ___ تو دیوی ہے۔ تو مہادیو ہے۔ آج تو نے میری زندگی کا سارا زہر پی لیا ہے۔ آج میں بھی تجھے خوش کرنا چاہتا ہوں۔" وہ اندھیرے کو ہٹا کر درالکشمی کا پرمسرت چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔

"بول--- بول تجھے اچھیں لگیں یہ چوڑیاں---؟" موٹر کے مسلسل بجنے والے ہارن سے گھبرا کر وہ جلدی جلدی سے پوچھنے لگا۔ مگر درالکشمی نے کچھ نہ کہا۔ اس کی کلائیوں میں پڑی ہوئی چوڑیوں کے نگ چمک رہے تھے اور ایسے ہی دو نگ اس کی پلکوں پر لو دے اٹھے۔

لڑکھڑا کے وہ پیچھے ہٹ گیا۔

"حرام زادی--- مردار ___ اور کیا سونے کے کڑے لے گی---" بڑی مشکل سے بے قابو ہاتھ کو اٹھا کر وہ درالکشمی کی طرف جھپٹا اور اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرا کے گر پڑا۔

درالکشمی جا چکی تھی۔

اس نے اپنے آس پاس ٹٹولا۔ بہت سی گڑیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اچانک اسے چکر سا آنے لگا۔ سیندھی ابکائیوں کے ساتھ الٹ کر پھر منہ میں آنے لگی اور وہ پیٹ پکڑ کے چلایا---

"سالی یہ مٹی کی گڑیاں' ذرا سی ٹھیس برداشت نہیں کرسکتیں---؟"

○

دیوداسی

یوں باہر سے کوٹھی کو دیکھو تو کسی خاص بات کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔

وہ بہت ہی سنسان کوٹھی تھی۔ اس کے باغ میں صرف خاردار جھاڑیاں اگتی تھیں اور بے شمار گلہریوں نے وہاں گھر بنا لیے تھے۔ دن بھر آم اور جامن کے پیڑوں پر ان گنت قسم کی چڑیاں پھدکتی پھرتیں۔ پھر کوئی آہٹ پا کر وہ ایک دم اڑتی تھیں تو پکی جامنوں کا مینہ سا برس پڑتا، مگر کوئی بچہ ان جامنوں کو اٹھانے کے لیے نہیں لپکتا تھا۔ ہتمبیلی کی ہری کلیاں سفید پھول بن کر ہنستے ہنستے پیلی پڑ جاتیں، مگر کسی مالی کی نگاہ ان پر نہیں جاتی تھی۔ خزاں کی تیز رو ہوائیں، سوکھی پنکھڑیوں کو سارے باغ میں اڑائے اڑائے پھرتیں۔ بچاری ننھی منی کانپتی ہوئی پنکھڑیاں ہاتھ پھیلائے کسی سہارے کو ڈھونڈتی رہ جاتیں، لیکن یہ بات اتنی اہم تو نہ تھی کہ محلے والے کوٹھی کو بھوتوں کا مسکن سمجھ کر یہاں داخل ہونا ہی چھوڑ دیں۔ کبھی اس کے اندر بھی تو جھانک کر دیکھ لیتے جہاں کے گہرے سکوت میں ہزاروں نغمے مچلتے تھے اور دو وحشت زدہ آنکھیں سنگ مرمر کے ستون کو تھامے ہر وقت کسی کے انتظار کیے جاتی تھیں۔ یہی باغ تھا جسے لوگ چل چل کر دیکھنے کو آتے تھے اور دادی اماں شکاری کتے کی طرح ٹہل ٹہل کر باغ کی حفاظت کرتی تھیں۔ کیا مجال جو کبھی ان کے پوتے بھی ایک پھول توڑ ڈالیں۔

مگر آج وہ شریر بچے، وہ ہنستے گاتے بچوں کی ٹولی، اس کی کڑی نگرانی سے روٹھ کر جانے کہاں چلی گئی تھی۔ کاش کوئی بچہ پھر آجائے۔ اس کی غصہ ور بہو پھر پلٹ آئے اور وہ دیے میں گھی زیادہ ڈالنے پر خوب لڑے۔ مدت سے ایک ہی جگہ پر رکھی ہوئی چیزوں کو بدل ڈالے۔ کوئی جھنکار ہو۔ کوئی شور ہو۔

مسہری پر لیٹے لیٹے دادی کمرے کے شاندار سامان کو دیکھتی تھیں۔ شیر کی کھال پر بچھی ہوئی مخملی گدوں کی کرسیاں، اخروٹ کی لکڑی کا فرنیچر، قدیم مصوری کے نادر نمونے، ایرانی قالین، چاندی اور نکل کے مجسمے، جن پر مسلسل جمنے والی گرد نے انہیں تقریباً چھپا دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کوئی آجائے جسے وہ یہاں کے ذرے ذرے سے وابستہ کہانیاں سنا سکے۔

اس کی کہانیاں اب مردہ ہو چکی تھیں۔ انہیں سننے والے بچے اپنے ماں باپ کے ساتھ گرمیاں گزارنے کشمیر گئے تو پھر گھر واپس نہ آسکے۔ ان کا ہوائی جہاز کسی پہاڑ سے

ٹکرا کے یوں بکھر گیا تھا جیسے دادی کے بھیانک خواب کسی شر کی ضرب سے کھیل کھیل ہو جاتے ہیں۔

کبھی کبھی دادی کا دل بہت گھبراتا تھا تو دو منزلیں طے کر کے وہ اپنے گھٹیا زدہ پیر گھسیٹتی ملکہ کے کمرے میں پہنچتی تھیں۔ سنگ مرمر کے ستون سے ٹیک لگائے ملکہ یوں کھڑی ملتی جیسے وہ خود بھی پتھر بن چکی ہو۔ اس کے بے حد سفید رنگ میں سرخی کی رمق بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ بڑی بڑی ویران سی آنکھیں بعض اوقات بڑی خوف ناک معلوم ہوتی تھیں۔ گھنے اور بے حد لمبے بال ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ یا تو ملکہ انہیں باندھنا ہی نہ چاہتی تھی یا پھر اسے فرصت نہ ملتی۔ اس کی آنکھیں نیچے پھاٹک پر لگی رہتی تھیں اور وہ خود نہ جانے کہاں ہوتی جو دادی کی لعنت ملامت بھی اس تک نہ پہنچتی تھی۔

دادی کو دیکھ کر ملکہ کو یوں لگتا تھا جیسے وہ خود لڑکی نہیں خاندانی قبرستان ہے۔ اس قبرستان میں دادی نے اپنے قہقہے بکھیرتے پوتوں کو' شاعر مزاج بیٹے کو اور نک چڑھی بہو کو ایک ساتھ دفن کر دیا تھا اور اب درگاہ کی مجاور بنی بیٹھی تھی۔

اکثر ملکہ کو ایک بھولی بسری کہانی یاد آتی تھی۔ جب ایک رات بڑے زور کی آندھی آئی تھی۔ نہ جانے کتنے گناہوں کی سیاہی نے اس رات کو سیاہ بنا دیا تھا۔ پھر ایک بہت بڑا دیو اپنے شہپر کھولے آیا اور پورے گھر کے مکینوں کو اپنی مٹھی میں سمیٹ کر لے گیا۔ صرف ملکہ اس کی انگلیوں کی درز سے پھسل کر نیچے گر پڑی۔

"میں بھی جاؤں گی۔ میں بھی جاؤں گی" صبح گھر خالی پا کر وہ خوب روئی تھی۔ لیکن اس وقت تک اس کا باپ' جو اسے اپنی قانونی بیٹی ماننے پر تیار نہ تھا' اپنے قانونی بچوں سمیت موت کی وادی میں داخل ہو چکا تھا۔ بچوں کی ماں نے ہوائی جہاز میں سوار ہوتے وقت سوچا تھا کہ ملکہ کے ننھے وجود کو اب کہیں جلدی ہی ٹھکانے لگا دینا چاہیے ورنہ اس کے بچوں کی جائیداد کو سخت خطرہ ہے۔

ملکہ کی کوٹھی میں کھانا پکاتے پکاتے خود بھی ایک مزے دار نوالہ بنی صاحب کے منہ میں اٹکی رہی اور پھر چار برس کی ملکہ کو تنہا چھوڑ کر غائب ہو گئی۔

ملکہ یقین ہی نہ کر سکتی تھی کہ اس کی ماں مر سکتی ہے' اور وہ ماں کے بغیر کیوں نہیں مر سکی!

اب وہ اوپر کی منزل پر کھڑی ہو کر کوٹھی کے پچھواڑے والی خاردار تاروں کی حد

بندی دیکھتی رہتی تھی، جس کے آگے ٹوٹی پھوٹی قبروں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ زمین پر ہر طرف کانٹے دار زرد زرد پھولوں کی جھاڑیاں اگ رہی تھیں۔ بڑ کے بوڑھے درخت سادھوؤں کی طرح جٹائیں کھولے جھک جھک کر نہ جانے ایک دوسرے سے کیا سرگوشیاں کرتے تھے۔ جب زور زور سے ہوا چلتی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بہت سے دیو مل کر بچوں کو ڈرا رہے ہیں۔

صمد نے اسے بتایا تھا کہ یہاں مردے اپنی کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں اور کسی متنازعہ مسئلے پر جھگڑا ہوجاتا ہے۔ اس شور میں وہ اپنی ماں کی آواز ڈھونڈا کرتی تھی۔ لیکن اس کی ماں اگر لڑنے جھگڑنے کی صلاحیت رکھتی تو اتنی خاموشی سے کیوں مرجاتی۔

اپنی ماں کی طرح وہ بھی بہت کم گو تھی۔ ہر بات زبان پر آنے کی بجائے دل میں بیٹھ جاتی تھی۔ وہ نہ تو بہت زیادہ خوش ہوتی تھی نہ کبھی آنکھوں میں آنسو آتے۔ کسی بند حوض کے پانی کی طرح جو بڑھتا نظر آئے نہ گھٹتا۔ اور آخر کم ہوتے ہوتے ایک دن اتنے پر اسرار طریقے پر معدوم ہوجاتا ہے جیسے وہ ہمیشہ سے یوں ہی سوکھا پڑا تھا۔

اب وہ ننھی منی خزاں رسیدہ پنکھڑیوں کی طرح ہاتھ پھیلائے کسی سہارے کو ڈھونڈتی پھرتی۔

ان ہی دنوں نیلی کھڑکیوں والے بنگلے کے بچے اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"تم میرا ہاتھ پکڑ لو۔ پھر ہم دونوں چھلانگ لگا کر تاروں کی باڑھ پار کریں گے۔" صمد اسے اپنا ہاتھ پیش کرتا۔ وہ اتنی اونچی چھلانگ نہ لگا سکی، مگر صمد کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

ماں کے بغیر جینا اب ممکن معلوم ہونے لگا۔ صمد اور اس کی بہن نشاط کا ہر وقت ساتھ رہتا تھا۔

نشاط لڑنے میں پکی استاد تھی۔ ہر کھیل کے اختتام پر لڑے بغیر اسے چین ہی نہ آتا تھا۔ مگر صمد اس کے غصہ کو خاموشی سہتا۔ وہ بہت ہی نرم مزاج اور صلح جو تھا۔ ہر موقع پر وہ ملکہ کا ساتھ دیتا تھا۔

دادی نے اپنی کوٹھی یوں ویران دیکھی تو اسے اپنی جائز پوتی ماننا پڑا۔ بیٹے کی ایک ذرا سی بھول اب اس کی قسمت کا فیصلہ بن گئی۔

پاس پڑوس والوں نے دادی کے اس فیصلے پر ناک بھی سکیڑی اور ان کی تنہائی پر

ترس بھی کھایا۔

گھر میں خوشی چھم چھم کرتی آئے تو اپنے پڑوسیوں کو کیسے بھول جائیں! ڈپٹی صاحب کی بیوی زبردستی دادی کو اپنے ہاں لے گئیں۔

ملکہ نے زندگی میں پہلی بار اتنا بڑا ہنگامہ دیکھا۔ آج صمد کی قسمت پر وہ ناز کر رہی تھی۔

بیچ صحن میں ہاتھ چلا چلا کر گلا پھاڑنے والی میراثیں بیٹھیں تھیں اور ڈھولک کی تھاپ پر مبارک بادی سے زیادہ لطیفے اور قہقہے لگائے جا رہے تھے۔ بڑے طویل غوطے کے بعد وہ گیت کا ٹوٹا ہوا سرا ڈھونڈنے لگتیں ___ آنگن میرے آجاؤ اللہ میاں۔

مہمان بیبیاں لس لس کرتے جوڑے پہنے' زیوروں کے بوجھ سے بولائی ہوئی' سارے گھر میں قہقہے بکھیرتی پھر رہی تھیں۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ میراثیں مبارکبادیں گانے کی بجائے ابھی سے صمد کی ہونے والی ساس اور سالیوں کے گندے گندے مذاق اڑائیں--- نہ جانے وہ دن کہاں چھپا ہوا ہے---!

ان راست گالیوں سے لڑکیوں کے گروپ میں قہقہوں کا سیلاب آگیا اور کسی سرپھری نے "امبوا تلے ڈولیا رکھ دے کہار" اور "کاہے کو دینی بدیس" گانا شروع کر دیا۔ اب لڑکیاں دوپٹے سنبھال کر اپنی ماؤں کے رونے کا تماشا دیکھنے کو پہلے سے تیار ہو بیٹھیں۔

"اے آتو کی بہو' ابھی سے کس کے سہاگ گانے بیٹھ گئیں---؟" صمد کی ماں نے گھبرا کے پوچھا۔

"اپنی صاحب زادی نشاط بیگم کے حضور"

ننھی سی نشاط بیگم نے سنا تو دونوں ہاتھوں سے لٹکتا ہوا غرارہ تھامے بھاگی اور دادی کے پاس بیٹھی ہوئی ملکہ پر آن گری۔

"ملکہ یہ ہمارے سہاگ ہیں۔ ہمارے۔" نشاط چھاتی ٹھونک ٹھونک کر فخریہ اکڑ رہی تھی۔

ادھر نشاط کے سہاگوں نے کسی ماؤں کو رلا دیا تھا۔ دور بیٹھی ہوئی لڑکیاں کہاں تو ہنس ہنس کر لوٹی جا رہی تھیں' یا اب ایک دوسری کی آنکھ بچا کر اپنے آنسو پونچھنے کی فکر کر رہی تھیں۔

مگر وہ دادی کے کولہے سے لگی اونگھتی رہی اور میراثیں نشاط کے سہاگ گاتے گاتے

اس کے سہاگ گانے لگیں۔ سرخ کپڑوں میں چھپی' زیوروں میں لدی' وہ دلہن چچی کی طرح چھم سے چوکی پر آن بیٹھی اور ساری بیبیوں نے اسے گھیر لیا۔ مگر دولہے کا کہیں پتہ نہ تھا۔

انتظار کرتے کرتے وہ تھک گئی۔ ادھر بیبیوں میں الگ شور مچا ہوا تھا۔

صمد کو بلاؤ--- صمد کو بلاؤ--- صمد کے اندر آنے سے پہلے نہ جانے کس نے اس کا پاؤں کچل ڈالا ور وہ بلبلا اٹھی۔

بسم اللہ پڑھانے کا وقت۔ ملا جی باوضو تیار۔ مگر وہ دادی کی گود میں پچھاڑیں کھا رہی تھی۔

"اے دادی ملکہ کو گود سے اتار کے صمد کو دلہا بناؤ"

ذرا ہی دیر میں شیر مالوں کے ٹکڑے' روندی ہوئی کلیاں اور لڈوؤں کا چورا دے کر اسے بہلایا گیا' مگر وہ پیر تسمہ پا کی طرح دادی پر سوار تھی۔

"میں تو بیاہ کروں گی---" وہ دادی کی گرفت سے چھٹ کر زمین پر لوٹنے لگی۔

"اوئی دوانی ہوئی ہے چڑیل---"

"اری پہلے دلہا تو ڈھونڈ لے"

"میں تو صمد سے بیاہ کروں گی---" اس نے سب کچھ ٹھکراتے ہوئے فیصلہ کیا اور ساری بیبیاں ہنستے ہنستے دوہری ہوگئیں۔ ملا جی کے سامنے پھولوں کے بوجھ سے تھکا ہوا صمد بیٹھا تھا۔ بار بار سلام کرنے کے غیر دلچسپ مشغلے سے اکتا کر وہ اونگھنے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ ملکہ کی ہائے ہائے پر اس نے آنکھ کو ذرا سا کھول کر دیکھا تو ملکہ خاصی قابل قبول نظر آئی۔ کئی بار جی میں آئی کہ ملا جی سے لگے ہاتھوں نکاح بھی پڑھوالے' مگر تسبیح پڑھتے پڑھتے ملا جی نے ایسی ڈانٹ پلائی کہ وہ تو سہم کر رہ گیا اور ملکہ ڈر کے مارے یوں روتی ہوئی بھاگی جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔

وہ دن اور آج کا دن--- صمد کی دلہن ___ دلہن چچی نے اس کی چڑ باندھ لی۔ جو بھی نیا مہمان گھر آتا دلہن چچی اپنا وہی گھسا پٹا لطیفہ لے کر بیٹھ جاتیں۔ اور لوگ ہیں کہ دانت نکالے کھیں کھیں کررہے ہیں۔

"ملکہ تو میرے ساتھ بیاہ کرے گی---؟" ایک دن اپنے مصنوعی دانت دھوتے ہوئے عینک والے چچا نے پوچھا اور ملکہ کو پھر ملا جی کی صورت یاد آگئی۔ صمد کی اماں کہتی

تھیں کہ عینک والے چچا تو ہر دوسرے تیسرے سال ایک نئی دلہن چچی کا ناشتہ کرتے ہیں۔ ان کا منہ کتنا بڑا ہے۔ چھی ---- ملکہ کا جی متلانے لگا۔ پھر وہ صمد کی جانب مڑے۔

"کیوں بھئی صمد صاحب۔ آپ اس ماما کی لونڈیا سے بیاہ کریں گے ___ ایں ___ توبہ توبہ ___ چچ چچ ___ ہا---"

صمد نے ان کے لہجے میں رقیبانہ حسد صاف دیکھ لیا تھا۔ مگر کیا کیا جائے۔

صمد کو سارا گھر ماما کی لونڈیا سے کھیلنے پر منع کرتا تھا' مگر اسے تو ملکہ ذرا بھی ماما کی لونڈیا نہ لگتی تھی۔ اگر صمد دو گھنٹے بھی وہاں نہ جاتا تو وہ سنگ مرمر کا ستون پکڑے اس کا انتظار کرتی تھی۔ دن بھر وہ صمد کے لیے چڑیوں کے رنگین پر' کوئلوں کی کاٹی ہوئی کیریاں اور گلہریوں کے بچے جمع کرتی۔ صمد کی تختی صبح ہی صبح دھو کر رکھ دیتی تھی کہ ملا جی نہ ماریں۔ شام ہوتے ہی راستے میں پڑے ہوئے لیمو کے کانٹے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اٹھا کر پھینک دیتی۔ صمد کبھی جوتے نہ پہنتا تھا۔

پھر وہ تینوں چنبیلی کے نیچے ننھا سا گھر بنا کر بیٹھ جاتے۔ صمد "رابن سن کروسو" کی کہانیاں سناتا۔ نشاط عینک والے چچا کی نقلیں اتارتی اور وہ خود الٹے سیدھے پاؤں مار کے مٹکنے لگتی۔

"میرے چھوٹے سے من میں چھوٹی سی دنیا رہے۔"

عینک والے چچا کو ملکہ کے ساتھ بچوں کا کھیلنا پسند ہی نہ تھا۔ کتنی بار انہوں نے بھابھی سے کہہ کر صمد کو پٹوا دیا' گیٹ میں قفل ڈلوا دیا' ملکہ کی دادی سے شکایت کی۔

"تمہیں پڑھنا لکھنا ہے یا بڑی ہو کر ملکہ کی طرح ماما گیری کرو گی---؟" وہ نشاط کو سمجھاتے تھے۔

ملکہ کو اپنی کمزوری کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ ذلت کے مارے اس کی ناک جڑ سے کٹی جا رہی تھی۔ جب وہ صمد کے ہاں سے دھتکار دی جاتی تو اوپر کی منزل کے تنہا کمرے میں بیٹھی نیلی کھڑکیاں دیکھتی رہتی تھی---- جہاں صمد بیٹھا پڑھ رہا ہوگا۔ شاید اس کی دوات میں پانی ختم ہوگیا ہو۔ نہ جانے آج ماسٹر نے اسے کون سا سبق دیا ہے۔ آج پھر صمد کے ہاں کریلے پکے ہیں جو صمد نہیں کھائے گا۔

دادی نے اسے یوں اداس دیکھا تو ایک ہوسٹل میں داخل کر آئیں۔

صمد اور نشاط اب بہت دور ہوگئے تھے۔ اب وہ صمد کو اسکول جاتے ہوئے بھی نہیں

دیکھ سکتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ استانیوں اور لڑکیوں کے پیار نے اسے پڑھنے کی جانب متوجہ کیا۔ ایک سال بعد وہ گھر پہنچی تو صمد پھاٹک پر کھڑا اس کا انتظار نہیں کر رہا تھا۔ بڑی دیر بعد جب ملکہ نے خود ہی پکارا تو وہ دوڑتا ہوا آیا۔ پھر وہ تینوں گلہریوں کے نئے گھر ڈھونڈنے لگے۔ صمد نے اسے چڑیوں کے بچے گھونسلوں سے نکال نکال کر دکھائے۔ لجلجاتے ہوئے ذرا ذرا سے کیڑے' ان کے پوٹوں میں سے دانا چمکتا تھا اور وہ منہ کھولے کھولے چیاؤں چیاؤں کیے جاتے۔ نشاط ان کے ہاتھ میں سے بچہ چھین کر بھاگ گئی تو چڑیا ان کے سروں پر منڈلا کے فریاد کرنے لگی۔ خوف کے مارے ملکہ کا دل دھڑکنے لگا اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ " دے دو۔ بچے کو دے دو۔ وہ رو رہا ہے۔"

اس دن پہلی بار اس کے رونے پر صمد نے اسے خوب چڑایا۔ آخر ایک اور سال گزر گیا۔

پھر ہر سال جب وہ گھر آتی تو صمد پہلے سے زیادہ محتاط ملتا۔ آتا بھی تو یوں جیسے آنا ہی نہ چاہے۔ اتنے دنوں تک ملکہ کو اس کی ہزاروں فکریں لگی رہتی تھیں۔ اس کے پرچے کیسے ہوئے۔ فٹ بال کا دوسرا میچ کب ہے۔ اس کی نئی شرٹ پر سے انار کا دھبا مٹا یا نہیں!

مگر صمد کو ان باتوں کا جواب دیتے ہوئے اب شرم آتی تھی۔ پھر تو صمد کا یہ قاعدہ ہوگیا کہ وہ بالکل غیروں کی طرح جھک کر اسے سلام کرتا۔ سارے گھر سے چھپ کر اس کے ہاں آتا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت اداسی چھائی رہتی تھی۔

"تم یہ مت سمجھنا کہ امی مجھے یہاں نہیں آنے دیتیں۔ اصل میں آج کل میں آئی۔ سی۔ ایس کی تیاری کر رہا ہوں۔" پھر وہ ملکہ کو اداس دیکھ کر اس کا دل رکھنا چاہتا۔

"آج کل تم بہت اچھا گانے لگی ہو۔ رات جب تم باغ میں گا رہی تھیں تو مجھے نیند ہی نہ آتی تھی۔"

"تو میں آج سے نہیں گاؤں گی۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"کہیں ایسا مت کرنا ملکہ۔ مجھے تمہارے گیت بہت پسند ہیں۔ جس دن تم نہیں گاتیں میں اس دن سو بھی نہیں سکتا۔"

پھر وہ مطمئن ہو جاتی۔ سچ مچ اب صمد کو اور بھی تو بہت سے کام ہیں۔ وہ کوئی روٹھا تھوڑی ہے۔ مگر اب تک اس کے بچپن والے لگاؤ کو دیکھ کر صمد چڑ جاتا تھا۔

"ملکہ تم ہر وقت میرے متعلق مت سوچا کرو۔ بس آج سے تم ادب ودب پڑھنا شروع کردو۔"

صمد کے تلخ لہجے کو وہ ہمیشہ بھول جاتی تھی۔ مگر ڈپٹی صاحب کے گھر میں بھولی بھٹکی خوشی ایک بار پھر چھم چھم کرتی آئی اور ان کی بیوی صمد کا سہرا دکھانے زبردستی دادی کو گھسیٹ کر لے گئیں۔

گلا پھاڑ پھاڑ کر میراثنیں صمد کی سالیوں کو گالیاں دینے لگیں۔ قہقہوں سے بے حال لڑکیوں کی صف میں بیٹھی ہوئی ملکہ بھی آنکھیں پھاڑے ہنسنے کی کوشش کررہی تھی۔ پھر نشاط کے ساتھ سب ہی لڑکیوں نے اسے گانے پر مجبور کیا اور دلہن چچی زبردستی اسے پکڑ کر لے گئیں۔

پگ گھنگرو باندھ میرا ناچی رے---

وہ گاتے گاتے تھک گئی مگر آج دلہن چچی کو وہ اپنا پرانا لطیفہ یاد ہی نہ رہا اور وہ دروازے کی آڑ میں کھڑی اپنے آنسو پونچھے جارہی تھی۔

اس پر سکتہ سا ہوگیا تھا۔ کئی دن تک وہ ایک پہلو سے بیٹھی خلا میں گھورتی رہی۔ کالج چھوڑ دیا اور کمرے میں ٹہل ٹہل کر گنگنانے لگی۔

کالج میں اس نے باقاعدہ موسیقی سیکھی تھی۔ اب وہ ریاض کرتی تھی۔

اکثر وہ کھڑکیاں کھول کر یوں ہی کھڑا ہوجاتا تو صفیہ روک دیتی۔

"یہ ہروقت کی روں روں سے میرا تو سر چکرا جاتا ہے۔"

"ملکہ بھی اپنی ماں کے ڈھنگ پر جاری ہے۔" صمد کی ماں تشویش ناک لہجے میں کہتیں۔

"طوائفوں کی طرح گانا بھی تو سیکھ لیا ہے۔" صفیہ دلی خوشی کا اظہار کرتی۔

کبھی بھولے بھٹکے نشاط آجاتی۔ بڑے تکلف کے ساتھ بے تکلفی پیدا کرتی ہوئی۔

"میں آج کل انگلش پڑھ رہی ہوں بھائی جان سے۔ صفیہ بھابھی کہتی ہیں تمہاری انگلش بہت کمزور ہے۔"

"آج کل تو تم بہت اچھا گانے لگی ہو۔ بند کمرے میں گایا کرو تو اچھا ہے۔ رات جب تم گا رہی تھیں نا' ٹھیک اسی وقت صمد بھائی کو اختلاج کا دورہ پڑگیا۔ تم نہ جانے کیسے آدھی رات کو باغ میں گھومتی ہو۔ میرا تو ڈر کے مارے دم نکل جائے۔"

اکیلے کمرے میں لیٹے لیٹے اس نے زندگی کے ہر ہر پہلو کو تولا' سمجھا اور یقین کرلیا کہ خدا کی مصلحت یہی تھی اس میں نہ تو اس کے باپ کا قصور تھا نہ صمد کا۔ اب وہ کوئی سہارا ڈھونڈنا چھوڑ دے گی۔ بس یوں ہی کمرے میں لیٹی میرا کے بھجن گنگنائے گی اور اپنے اندر ہونے والے شور و غل کو سنے جائے گی۔ سامنے جھومنے والے بڑ کے درختوں کی سرگوشیاں سنے گی۔ شاید اسی طرح کسی دن اسے نیند آجائے!

لیٹے لیٹے اس کے جسم میں درد ہونے لگا تو اس نے دریا میں ڈوب مرنے کا پکا ارادہ کرلیا۔

کوٹھی کے صحن میں اس نے پہلا قدم رکھا تو خزاں رسیدہ سوکھی پنکھڑیاں درد سے کراہ اٹھیں۔ بسیرا لینے والی چمگادڑ اور آپس میں لڑنے والی چڑیاں گردن اٹھا اٹھا کر ایک دوسری کی خیریت پوچھنے لگیں۔ چاند بیچ آسمان میں تیر رہا تھا اور دور کہیں چرچ کی گھنٹیاں نئے سال کی آمد کا اعلان کرنے میں زور زور سے چلا رہی تھیں: بہار آرہی ہے' بہار آرہی ہے---

اس کا لمبا سایہ ناکامی کا پیامی بنا آگے آگے چل رہا تھا۔

بہت دیر بعد جب حوض کے ٹھنڈے پتھروں نے اس کے تلووں کو گدگدایا تو اس نے بڑے تعجب سے دیکھا کہ وہ نیلی کھڑکیوں کے نیچے کھڑی ہے--- دریا کا کنارہ' قبرستان اور خاردار تاروں کی حد بندی بہت پیچھے چھوٹ گئی تھی۔ پھر وہ یوں گھر کی طرف بھاگی جیسے کوئی اہم بات بھول گئی ہو۔

"دادی ___ دادی مجھے تھام لو ___ مجھے تھام لو دادی۔ اب ہم کسی کا انتظار نہیں کریں گے۔"

دادی کے زانو پر سر رکھے وہ گھنٹوں گا گا کر دادی کو بہلاتی رہی۔

"مورے مندر اجھوں نہیں آئے۔ کون چوک بھئی مو سے آلی۔"

اپنی تسبیح کو تکیے کے نیچے رکھ کر دادی بھی رونے لگیں اور بے جے ونتی کے سر فضا پر بادلوں کی طرح چھا گئے۔ اس کی آواز اونچی ہو کر باغ میں گونجنے لگی اور لڑنے والی چڑیاں فکر مند لہجے میں ایک دوسری سے پوچھنے لگیں :--- "کون چوک بھئی مو سے آلی---؟"

نشاط کے کمرے میں ملکہ کا گیت سن کر سب کے قہقہے ایک دم رک گئے۔ ہنسی کا

آخری پھڑپھڑاتا ہوا سر بڑی دیر تک فضا میں بھٹکی ہوئی فاختہ کی طرح لرزتا رہا۔

"مورے مندر ابھوں نہیں آئے---" صفیہ ملکہ کے گیت کو پھر اچھالتی۔ مگر اس بار قہقہے محض زبردستی کے تھے۔ جیسے جھٹ پٹے کے وقت تھکا ہارا پرندہ آخری بار اپنے کھوئے ہوئے ساتھی کو پکار اٹھتا ہے۔ اور اب تو بہت دنوں سے یہ بات محسوس کی جارہی تھی کہ سب کے قہقہے روٹھے ہوئے ساتھی کی طرح نہ جانے کہاں کھو گئے تھے' اور اب یہ دن بھر کی ہنسی کوئی سچ مچ کی ہنسی تھوڑی تھی' حالانکہ بال کھولے ہوئے ملکہ جب راتوں کو باغ میں گھومتی تھی تو نشاط نے اس کے متعلق بہت سے لطیفے اکٹھے کرلیے تھے۔ وہ ہر ایک کو یقین دلانے پر بضد رہتی تھی کہ ملکہ پر ایک جن عاشق ہے' جو چاندنی راتوں میں قبرستان سے نکل کر اس سے ملنے آتا ہے۔

"یہ سب ڈھونگ ہے۔" صفیہ بڑے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کرتی۔

"اپنی آوارگیوں پر پردہ ڈالنے کو اس نے یہ سوانگ بھرا ہے۔"

"اچھا تم دیکھ لینا۔ کسی دن اسے کوئی بھوت اٹھا کر لے جائے گا۔" کتاب سے نظر ہٹا کے نشاط پھر اپنی بات پر اصرار کرنے لگی۔

"میرا کی طرح" صمد نے انگور کے دانے نشانہ بنا بنا کے منہ میں اچھالتے ہوئے کہا۔

"میرا کے گیتوں میں اس کے پیار کی خوبصورتی اور اثر ہے۔ وہ زندگی بھر اپنے محبوب کا انتظار کرتی رہی اور پھر کرشن جی کی مورتی میں سما گئی۔ یا یوں سمجھ لو کہ ہم نے جانا کہ وہ مر گئی' مگر وہ ابھی تک ___ آج تک---"

"چاندنی میں بال کھولے گھومتی ہے۔" صفیہ نے جملہ پورا کیا اور سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔

"یقین نہیں آتا۔" نشاط نے کتاب صمد کے سامنے بڑھائی۔

"اچھا تو نہ آئے۔" اس نے کتاب پھینک دی اور کوفت دور کرنے کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

"یہ فارسی اور انگریزی شاعروں کو پڑھ پڑھ کر تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ پہلے اپنا کلاسیکی ادب دیکھو۔"

"میرا کو پڑھ لوں---؟"

پڑوسیوں کے قہقہے سن کر وہ دادی سے لپٹ گئی۔

"یہ سب راتوں کو باغ میں گھومنے کا نتیجہ ہے۔ اکیلی کمرے میں بیٹھ کر مت گایا کرو۔" دادی خود بھی گھبرا گئیں۔ "نماز کے بعد دعائیں کیوں نہیں پڑھتیں۔"

اس دن سے وہ دادی کے کمرے میں سونے لگی۔ اس نے اپنے طنبورے پر غلاف چڑھا دیا اور نماز پڑھنے کے بعد سجدے میں پڑے پڑے سو جاتی۔

چاندنی راتوں میں چاند سے اسے ڈھونڈتا پھرتا۔ نیلی کھڑکیوں پر کوئی سایہ رات بھر کانپتا تھا۔ بیر اور لیمو کے کانٹوں سے باغ کا راستہ پٹا پڑا تھا۔ اور ہمیشہ آپس میں لڑنے والی چڑیاں اپنی پڑوسنوں سے پوچھتیں "کون چوک بھئی مو سے آلی۔۔۔؟"

وہ بڑی سرگرمی سے دادی کی خدمت گزاری میں دن کاٹ رہی تھی۔ ان کے پیر دابتی' ان کے لیے کھچڑی پکاتی۔ گٹھیا کے مرض کے متعلق اس نے بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ بہت سے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ ان دنوں اسے جو بھی ملتا وہ دادی کے مرض کی دوا پوچھتی۔ دادی کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزوں کے نام گناتی۔ ان کے دکھوں پر روتی۔ کبھی بھولے بھٹکے اس کا نیم پاگل سا پڑوسی ناصر آجاتا تھا تو وہ اس کے ساتھ گھنٹوں پلان بناتی کہ دادی کو کس طرح خوش رکھا جائے! وہ چھپ چھپ کر دادی کی ضروریات پر نظر رکھتی تھی۔ اس وقت انہیں کس چیز کی ضرورت ہے۔ کیا وہ اب بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی ہیں۔

درد کی شدت سے گھبرا کر بعض اوقات دادی کو اس پر غصہ آجاتا تھا۔

"یہ تو ہر وقت مجھ سے کیوں چمٹی رہتی ہے۔ کبھی کبھی نشاط کے ہاں ہو آیا کر۔"

لیکن وہ مطمئن تھی' جیسے اس کے ہاتھ میں بھی دادی کی طرح بساکھیاں آگئی ہوں۔

پھر ایک دن دادی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ رات بھر وہ دادی کے سرہانے بیٹھی ان کا سر دباتی رہی۔ آس پاس کے سبھی پڑوسی مزاج پرسی کو آئے۔ نشاط' اس کی ماں' چودہ بچوں والی کرسچین ٹیچر' سگریٹ کا ایجنٹ اور دمے کا پرانا مریض ناصر' صمد اور اس کی بیوی صفیہ۔ وہ سب ایک ہی الفاظ میں لیکن بدلے ہوئے اسٹائل سے اسے دلاسا دیتے رہے۔

"تم دوسروں کے متعلق اتنی شدت سے سوچنا چھوڑ دو ملکہ۔ صرف یہی تمہارا علاج ہے۔"

صمد اسے سمجھاتا رہا۔ اور وہ چپکی بیٹھی سوچتی رہی کہ اس کا طنبورہ کالا کفن اوڑھے یوں لٹک رہا ہے جیسے سولی پر چڑھا دیا گیا ہے۔ کاش دادی اٹھ کر اس سے مہمانوں کا

استقبال کرنے کو کہتیں اور وہ جلدی سے طنبورہ کھول کر ہمیشہ اداس رہنے والے ناصر کو بھجن سناتی۔

گاتے گاتے وہ بے ہوش ہو کر دادی کے ٹھنڈے جسم پر گر گئی۔

جب ہوش میں آئی تو دادی کے خالی پلنگ پر لیٹی کراہ رہی تھی' اور باہر سوکھی پنکھڑیاں تیز ہوا کے جھونکوں سے بچتی' ہاتھ پھیلائے' کسی سہارے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

وہ دن بھر اطمینان سے لیٹی پڑوسیوں کی اپنے متعلق رائے سنتی رہی۔

عینک والے چچا ابھی تک اس کی رائے کا انتظار کر رہے ہیں۔ نشاط اسے پاگل سمجھتی ہے۔ اور نشاط کی ماں کے پاس بھی اپنی دائمی پیچش کے بعد صرف یہی ایک موضوع تھا' جس پر وہ بولنا شروع کرتیں تو اپنی طرف سے بہت سے پھندنے اور کلیاں ٹانکتی جاتیں' مگر سننے والا نہ اکتاتا تھا۔ بھلا ایک بھیدوں بھری کنواری کی داستان سنانے سے کون اکتائے گا!

ملکہ کو اپنی کہانی میں چالیس دروازے نظر آئے۔ اور ہر دروازہ کھولنے پر ایسے ہی چالیس دروازے اور ابھر آتے۔ اسے اپنے عاشقوں کی فہرست میں ناصر کا نام بہت پسند آیا۔

اس دن ملکہ نے پہلی بار سوچا کہ ناصر بڑے خطرناک مرض میں مبتلا ہے۔ اس کی صورت پر ہمیشہ اداسی چھائی رہتی ہے' اور اس کے گھر میں دوسرا کوئی آدمی نہیں ہے۔ کاش ناصر کا اپنا کوئی ہوتا جس کے دل میں اس کی فکر ہوتی۔

ایک دن دروازے پر دستک سن کر ناصر باہر نکلا۔ کمبل میں لپٹا ہوا' کراہتا ہوا۔ وہ دروازہ کی آڑ میں کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔ اجنبی غالباً" کسی سگریٹ کے کارخانے سے آیا تھا۔

"کیا آپ کی طبیعت پھر خراب ہو گئی---؟"

"نہیں۔ اس بار مجھے پورے ایک ہزار کا نقصان ہوا ہے۔ رات سے سوچ رہا ہوں کہ اب کیا ہوگا۔ پہلے ہی اتنا گھاٹا ہو چکا ہے۔" سگریٹ کے کارخانے والا آدمی چلتے چلتے رسمی طور پر بولا۔

"بڑا افسوس ہوا۔ کوئی کام ہو تو مجھ سے کہہ دیجئے گا۔"

"یہی تمہارا بڑا احسان ہے" ناصر نے آہ بھر کے کہا۔

"ورنہ مجھے کوئی دو بول کہنے والا بھی نہیں ہے۔"

اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ مگر ملکہ کے دل کے دروازے غیر ارادی طور پر

کھل گئے۔

اس رات وہ بہت سے بے تکے خواب دیکھتی رہی: کہ جیسے وہ بال کھولے جنگلوں میں ماری ماری پھر رہی ہے۔ وہ دادی کو سہارا دیئے کھڑی ہے۔ پھر دادی غائب ہوگئیں اور اس کے ہاتھ میں بساکھیاں رہ گئیں۔ وہ کسی پہاڑ پر سے لڑھکتی جا رہی ہے کہ اچانک صمد نے اسے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ وہ ایک چمکتے ہوئے ہیرے کو ہاتھ میں اٹھائے کھڑی ہے مگر وہ جلا ہوا سگریٹ بن گیا۔ جیسے کوئی راہ گیر بغیر بجھائے پھینک گیا تھا۔ وہ باغ میں کھڑی گا رہی ہے "مورے مندر ابھوں نہیں آئے۔" اچانک چرچ کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

"بہار آ رہی ہے--- بہار آ رہی ہے---"

صبح وہ بڑی دیر تک بستر پر اوندھی پڑی رہی۔

آخر ساری دنیا اس سے اتنی بے تعلق کیوں ہے۔ لوگ اس کے بغیر کیسے جی رہے ہیں۔ وہ لوگ کیسے بھول گئے ہیں کہ ملکہ بھی اس دنیا میں موجود ہے۔ مدتوں سے جمع آنسو اس کی پلکوں پر مچلنے لگے اور شکایتوں کا ہجوم ہوگیا۔ وہ نشاط کی بے رخی پر اسے ایک لمبا چوڑا شکایت نامہ لکھنے بیٹھی لیکن قلم میں روشنائی نہیں تھی۔ اس کا کیا قصور کہ روشنائی لانے کے لیے اسے ناصر کے ہاں جانا پڑا؟ ناصر کے گھر میں سامان بالکل مختصر سا تھا: دو چار کرسیاں، ایک مسہری، میز پر لاتعداد خطوط بکھرے ہوئے تھے، شیونگ کا سامان اور ریزگاری بھی اسی میز پر تھی۔ ناصر کرسی پر بیٹھا خطوط کے جواب لکھ رہا تھا۔ اسے ملکہ کے آنے پر بڑا تعجب ہوا، اور اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا کہ عورت کے بغیر محلے والے اسے یتیم سا جان کر نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔

"ہا بے چارا ناصر---"

اس نے زیادہ بات چیت نہ کی۔ مگر اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتی آئی۔

پہلے دن ناصر صرف وقت پوچھنے آیا۔ پھر اخبار مانگ کر لے گیا۔ کبھی ریڈیو پر بازار کا بھاؤ سننے چلا آتا۔ پھر تو وہ ہر روز کمپنی سے واپس آکر ملکہ کے کمرے میں بیٹھا اپنے نقصان کی تفصیل اور لوگوں کی خود غرضی کی داستانیں سنایا کرتا۔

ان دنوں وہ کھانا پکانے والی ماما سے لے کر نشاط تک سے یہی باتیں کرتی تھی کہ آج کل یہ سگریٹ کے کارخانے والے اپنے ایجنٹوں سے کتنا محنت کا کام لیتے ہیں اور کتنا کم کمیشن دیتے ہیں، اور دوکان دار کتنی بے ایمانی سے مہینوں کے بعد مال واپس کرکے ایجنٹ

کو پریشان کرتے ہیں---! وہ ہر ایک کو وہی سگریٹ پینے کا مشورہ دیتی جس کی ایجنسی ناصر کے پاس تھی۔ کئی سو روپے کے سگریٹ اس نے فروخت کے بہانے ناصر سے خرید کر جلا ڈالے۔

پھر ایک دن ناصر اس کے ہاں بڑے ڈرامائی انداز میں آیا اور وہ محلے والوں کی ہنسی کو نظرانداز کر کے شہنائیاں بجوائے بغیر مسز ناصر بن گئی۔

سب سے پہلے اسے شادی کی مبارک باد دینے صفیہ آئی' اور جب وہ روتے روتے بے حال ہوگئی تو اسے سمجھانے صمد آیا۔ شادی کے بعد اسے نہ تو خوشی ہوئی نہ دکھ۔ اسے ناصر سے محبت کرنے کا خیال تو نہ آیا' مگر وہ ناصر کے لیے بڑے سے بڑا ایثار کر سکتی تھی۔ وہ ناصر کا دکھ دور کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس کی تنہائی کا مداوا بن گئی۔ پھر اسے خود بھی تو بساکھیوں کی ضرورت تھی۔

اس کے کپڑے اب بھی میلے اور بے جوڑ رہتے۔ بال کھلے ہوئے۔ مگر اب سوچنے کے لیے اسے ایک محور مل گیا تھا۔ دن بھر وہ ناصر کے کاموں میں مشغول رہتی۔ ناصر کو موضوع گفتگو بنا کے وہ ہر شخص سے ابد تک باتیں کر سکتی تھی۔ اس نے ناصر کی ساری ناکامیاں' اداسیاں اپنے اندر سمیٹ لی تھیں۔ اور یہ کتنی خوشی کی بات تھی کہ وہ ایک تنہا آدمی کے دل کا خلا پر کر سکتی تھی۔

ناصر بہت ہی کم گو اور پرسکون انسان تھا۔ غیر جذباتی سا۔ اس نے شادی کا فیصلہ کرتے وقت ملکہ سے کہیں زیادہ خالص ایجنسانہ انداز میں کوٹھی اور اس کے قیمتی سامان کو تولا تھا۔

مگر شادی کے بعد ملکہ کی دردمندی نے اسے بہت متاثر کیا۔

بعض اوقات جب آفس میں بیٹھے بیٹھے رات زیادہ گزر جاتی تو وہ دوڑتا ہوا گھر آتا۔ مگر اسے ملکہ کو ساری کوٹھی میں تارچ لے کر ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا وہ جب تھک ہار کے واپس مڑنے لگتا تو ملکہ بیری کے نیچے بیٹھی کانٹے چنتی ہوئی ملتی۔

"تم اپنے لیے ایسے فضول کام کیوں ڈھونڈ لیتی ہو۔ میں ہمیشہ جوتے پہن کر چلتا ہوں۔ پھر کانٹوں کی کیا فکر ہے---؟"

"ہمیشہ جوتے کیوں پہنتے ہو۔ ننگے پیر کیوں نہیں چلتے---؟"

پڑھی لکھی بیوی کا یہ مذاق ناصر کو بہت بھاتا۔ کاش اس کے پاس زیادہ وقت ہوتا' وہ

ملکہ سے اور بھی بہت سی پر لطف باتیں سنتا۔ کئی کئی دن کے دورے کے بعد جب وہ رات کی ٹرین سے گھر آتا تو بال کھولے ہوئے سنگ مرمر کے ستون سے لگی ملکہ اس کا انتظار کرتی ملتی۔

آج بھی رات کو وہ گھر واپس آیا تو وہ ستون کے گرد باہیں ڈالیں ہوئے اس کا انتظار کرتے کرتے سو چکی تھی۔ بالکل اس سگریٹ کی طرح جو جلتے جلتے راکھ ہوجائے۔ لیکن جب ہاتھ جلنے لگے تو پینے والا چونک پڑے--- مگر اب وہاں راکھ کے سوا کیا رکھا تھا---؟

چاند نے آنکھیں کھولیں۔

ہر چیز سو رہی تھی۔ تمام دنیا کے ریڈیو اسٹیشن بازار کے گھاٹے کی خبریں سنا کر دوسرے دن صبح تک کے لیے اجازت لے چکے تھے۔ ان سینما گھروں میں آخری شو ختم ہوچکا تھا جہاں شیکسپیر کے المیہ ڈرامے دکھائے جاتے ہیں' اور ہر روز جولیٹ زہر کا جام پیتے پیتے بوڑھی ہو چکی ہے۔

بڑ کے درخت تیز ہواؤں میں جھوم رہے تھے۔ جیسے ہاتھ پھیلائے کسی کو بلا رہے ہوں۔

چاروں طرف بڑی گہری خاموشی تھی۔ کبھی کبھی کوئی کتا رو دیتا یا دور کہیں جنگل کی طرف سے کسی دھیڑ کی موت پر بجنے والی شہنائی المیے کو کراہ کراہ کے سنا رہی تھی۔

بڑے بڑے درختوں میں جھولتا ہوا' اونچی اونچی بلڈنگوں کا سہارا لیتا ہوا۔ چاند میرس روڈ کی ایک سنسان کوٹھی میں داخل ہوا۔

پیڑوں میں سے چھن کر چاندنی کے دھبے برص کے داغوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ نیلی کھڑکیوں میں ایک سایہ بے قراری سے ٹہل رہا تھا اور اپنی پڑوسنوں سے روٹھی ہوئی چڑیاں' خاموشی سے پوچھ رہی تھیں۔

"کون چوک بھئی مو سے آلی---؟"

بھنور اور چراغ

آپ نے کبھی اجنتا کے غاروں میں بدھ کا وہ عظیم بت دیکھا ہے' جو پہلی نظر میں بالکل غیر معمولی سا لگتا ہے' لیکن جو دوسرے زوایے سے دیکھنے پر اپنا انداز تفکر بدل دیتا ہے۔ ہر دیکھنے والے سے ایک نئی بات کہتا ہے۔ اس کے قدموں میں کھڑے ہو کر ہم لوگ کتنے چھوٹے نظر آتے ہیں۔

پیروں میں پس جانے والے کیڑوں کی طرح--- اس کی عظمت کا بوجھ ہم پر چھا جاتا ہے' کچھ ایسا ہی احساس ہوتا ہے جب میں سر کو یاد کرتا ہوں۔

"آپ اس تصویر والی عورت سے کوئی اور کہانی سنئے۔ آپ جب بھی اسے دیکھیں گے' یہ مسرت و یقین کی نئی کہانیاں سنائے گی---" پھر وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر چلی گئی تھی۔

جس چیز کو سر چھولے وہ کتنی خوبصورت ہو جاتی ہے۔ اس کے ہاتھوں کا لمس ہر چیز کی ہیئت بدل دیتا ہے۔ جب وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر چلی گئی تو میں نے محسوس کیا تھا جیسے میرا ہاتھ جسم سے علیحدہ ہو چکا ہے۔ میں اس کے لمحے کو ماضی کے گنے چنے مسرت بھرے لمحوں کے خانوں میں بند کر دینا چاہتا ہوں۔ اس خوش نصیب ہاتھ کو بار بار دیکھتا ہوں جسے سر کے ہاتھوں نے تھام لیا تھا۔

جب وہ چلی گئی تو میں سوچنے لگا' آج سے پہلے یہ ہاتھ میرے جسم کا جزو تو نہ تھا۔ ابھی سر اپنی یادگار کے طور پر دے گئی ہے۔

مجھے آج سے کئی مہینے پہلے کی ایک دوپہر یاد آئی' جب میں ساری دنیا کی نحوستیں سمیٹے پلنگ پر لیٹا سوچتا رہتا تھا کہ خود کشی کا سب سے انوکھا اور ہیجان پرور طریقہ کون سا ہو سکتا ہے۔ اس منحوس دنیا کو مٹانے کے لیے کتنے ایٹم بموں کی ضرورت ہوگی!

تین مہینے سے میری چالیس روپے کی ملازمت بھی چھوٹ گئی تھی' اور دنیا کی ہر امید ہاتھوں سے چھوٹتی نظر آ رہی تھی۔ یہ خبر سن کر ہر شخص دوڑا چلا آتا۔

"کیسے چھوٹ گئی رشدی کی نوکری!"

جیسے نوکری چھوڑنا بھی ہمالہ کی مہم کو سر کرنا تھا۔

"میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ تم لٹیا ڈبو کر ہی آؤ گے۔ نوکری کرنا ایسا بچوں کا کھیل تھوڑی ہے۔" ابا بڑبڑائے جاتے ہیں....

اماں بھی ابا کی ٹوٹی کمانیوں والی عینک لگائے' پھٹے کپڑوں میں پیوند ڈالتے وقت ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتیں۔ رعنا ذرا سی بات پر جھنجلا جاتی اور بھابھی اٹھتے بیٹھتے اپنی قسمت کو کوسے دیتی۔ کروٹ بدلنے پر پلنگ بھی یوں چرچراتا جیسے بوجھ سے اکتایا جا رہا ہو۔ کبھی کبھی حقہ پینے میں ابا ٹھنڈی سانس بھر کے بڑبڑانے لگتے۔

"کیا وقت آن لگا ہے۔ رشدی کی ماں۔ زندگی کی بچی کھچی سانسیں لینا بھی دوبھر ہو رہا ہے۔"

"تو پھر تشریف لے جایئے جناب۔" میں انہیں جواب دینا چاہتا۔

اس دن مجھے ہر شخص سے نفرت ہو رہی تھی۔ ہر ایک سے انتقام لینے کو جی چاہ رہا تھا۔ ہر ایک لہجے میں طنز چھپائے مجھ سے بات کرتا' حقارت بھری نظروں سے مجھے دیکھتا' ہر طرف سے لعنت کے فرشتے میرے راستے میں ناکامیاں بکھیرتے ملتے۔

حد ہوگئی۔ ابا جیسا مستقل مزاج انسان بھی ہمت ہار بیٹھا۔ آخر انہوں نے اپنے بچپن سے بڑھاپے تک کا راستہ انہیں دلاسوں کو تھامے گزارا تھا۔ وہ تو یوں میری کمائی کھانے کے انتظار میں جی رہے تھے جیسے دنیا میں آنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ اپنا قرض وصول کریں۔ کئی بار جی میں آئی کہ اٹھ کر ابا سے زندگی بھر کا حساب کتاب چکایا جائے۔ کون سے شاہانہ ٹھاٹ سے پالا تھا۔ ہمیشہ ایک ایک پیسے کو ترسایا۔ یہی چاہتے رہے کہ ایک دمڑی خرچ تک کیے بغیر میں رات ہی رات میں پڑھ کر ایک گریجویٹ نوجوان بن جاؤں۔

بس پھر وہ بڑے سے دالان میں اکڑوں بیٹھے مٹھو کو بولنا سکھائیں یا اپنے مصنوعی دانتوں کا میل ٹوتھ برش سے صاف کرتے رہیں اور اماں سے لڑتے جائیں۔

لیکن بی۔ اے پاس کرنا ہی کیوں ضروری تھا۔ ہر باپ اپنے بیٹے کے مستقبل پر بی۔ اے کی سند رکھ دینا چاہتا ہے' اور ہر ماں اپنی بیٹی کی زندگی میں سونے کے کنگنوں کا اجالا پھیلا دینا چاہتی ہے۔ ابا موڈ میں ہوتے تو میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر فخر سے کہتے۔

"یہ میرا سوا لاکھ روپے کا چیک ہے۔ اب دو چار برسوں میں ہم بھنا لیں گے۔"

اور اماں سر پر پلو ڈال کر اپنا نیا خواب سناتیں :---

"اللہ نے چاہا تو میرے بچے ہمیشہ خوش رہیں گے۔ رات تو میں نے خواب کیا دیکھا۔" وہ سر پر پلو ڈال کے سحر زدہ سی آواز میں کہتیں :

"کہ میں ہوں اور رعنا کو سونے کے کنگن پہنا رہی ہوں۔ ہمارے دروازے پر برات

کی دھوم مچی ہے اور میری جانے کیوں مت کٹ گئی ہے کہ میں بری کے جوڑے کی خاطر سمدھنوں سے لڑ رہی ہوں۔۔۔۔"

"لا حول ولا۔۔۔۔" ابا کو غصہ آجاتا۔ "تمہاری یہ لڑائی کی عادت تو نہ جانے کتنے بنتے کام بگاڑے گی۔ اللہ ہی ہے جو رعنا کی برات خیر سے آئے۔"

"نہ جانے ہر ماں یوں ہی خوابوں میں گھری رہتی ہے یا اماں ہی اپنے سپنوں کا اجالا گھر میں پھیلائے رکھتی ہیں۔

اب میری پیدائش کے وقت سے دبے ہوئے قرض کو واپس لینے کا وقت آن پہنچا تھا۔

مگر ابا کا چیک کہیں نہ بھن سکا۔ رعنا کی گوری کلائیاں کانچ کی چوڑیوں سے بھی محروم نظر آتیں۔ بھابھی پر دنیا کے ہر خوف ناک مرض نے بیک وقت حملہ کردیا اور سمدھنوں سے لڑنے کا ارمان اماں کے دل میں مچل مچل کر تھک گیا۔

اس دن مجھے سونے کے کنگنوں اور براتوں کی دھوم دھام سے نفرت ہوگئی تھی۔

اچھا ہی ہوا کہ بھائی جان مزے سے جنگ میں ٹھکانے لگ گئے۔ کاش ایک بار پھر جنگ ہو اور موت کی اس چناپٹی میں چند دنوں سب کو خوش کرکے میں بھی ختم ہوجاؤں۔ جب بھائی جان بیکار تھے تب بھی ہمارے گھر میں ایسا ہی سناٹا چھایا رہتا تھا۔ ابا ان کی بیکاری پر لعن طعن کرتے' اماں سسکیاں بھرتیں اور بھابھی ہر وقت بھائی جان کی مردانگی کو غیرت دلاتیں۔ چولہے کے پاس چھائی ہوئی خاموشی بھائی جان کے دماغ کے ساتھ ساتھ ان کی آنتوں کو بھی جھنجوڑ ڈالتی۔

ایک دن انہوں نے بڑی شان سے ایک فارم دکھایا۔ ابا نہیں نہیں کرتے رہے' اماں کا روتے روتے گلا بیٹھ گیا' اور بھابھی نے انہیں دونوں ہاتھوں میں چھپا کے کہا۔ "میں تو نہیں جانے دوں گی۔"

مگر دو سو روپے کی جھنکار نے اماں سے رو رو کر امام ضامن بندھوایا' بھابھی نے آنسو پونچھ کر رخصت کیا اور ابا شرمندہ سے کہتے رہے۔۔۔

"دیکھو بھئی خدا کیا کرتا ہے۔ صرف چند سال کی بات ہے۔"

مگر یہ بات صرف چند مہینے چل سکی تھی۔ اس دن منی آرڈر کی بجائے ایک بھاری سا لفافہ آیا تھا۔ اس دن فضا میں ایک دھماکہ ہوا' ایک شعلہ لپکا اور ایک گولی باری باری

سب کے سینوں میں گھس کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔

جب گھاؤ بھرنے لگے تو میں نے محسوس کیا کہ گھر میں بھائی جان کی کمی محسوس نہیں ہوتی' صرف وہ رونق کھو گئی ہے جو دو سو روپے سے چھائی رہتی تھی۔

اب بھائی جان کی زندگی پر مجھے رشک آرہا تھا۔ یہ امن کے لیے شور مچانے والے سب پیٹ بھرے ہوں گے۔ ورنہ جنگ دنیا کے بیکاروں کے لیے کتنی بڑی رحمت ہوتی ہے۔

اس وقت بڑے چچا لاٹھی ٹیکتے' کھانستے کراہتے آئے۔ "رشو بیٹا تمہیں کوئی بلا رہا ہے۔" بڑے چچا کو دیکھ کر میں نے نفرت سے کروٹ بدل لی تھی۔ گاؤں میں لٹ لٹا کے وہ اپنے بال بچوں کو لیے پہلی بار شہر آئے تھے۔ مگر یہاں آکر انہیں معلوم ہوا کہ انگریزی پڑھے بغیر مزدوری بھی نہیں ملے گی۔ جب سے میں نے بی۔ اے میں داخلہ لیا تھا ابا ہر ایک سے کہتے تھے کہ عزت اور شان دار ملازمت کے لیے بی۔ اے کرنا ضروری ہے۔ وہ سارے خاندان میں گھوم پھر کے میری قابلیت اور عقل مندی کا ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے۔ اس لیے روز شام کو بڑے چچا میرے پاس صلاح و مشورے کے لیے آجاتے تھے' کیونکہ میں ان کی نظر میں بہت بڑا انسان تھا۔

"تم بتاؤ بیٹا' اب میرے بچوں کا کیا ہوگا" شاید وہ پڑھے لکھے نوجوانوں کو غیب دان بھی سمجھتے تھے۔

"سوچتا ہوں رشو بیٹا' یہ بی۔ اے کا امتحان میں بھی دے ہی ڈالوں۔ بس ذرا انگریزی کی کسر ہے۔"

مگر آج بڑے چچا کو ابا نے وہیں روک لیا۔

"یہ کل کے لونڈے ہماری مشکلیں کیا سمیں بڑے بھیا۔ اگر کچھ قابل ہوتے تو پہلے اپنے لیے ہی کچھ نہ کر لیتے۔ یہ انگریزی بھی بس نام کی ہوتی ہے۔ ہم نے پڑھا کے دیکھ لی۔"

مگر بڑے چچا نے مجھے بڑی شفقت سے اٹھایا۔

"مایوس مت ہو بیٹا۔ اللہ سب کی سنتا ہے۔ جاؤ' باہر وہ لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

میں بڑی بے زاری سے اٹھ کر باہر گیا۔ وہاں ایک سانولی سی دبلی لڑکی بیٹھی تھی اور

ایک سیاہ فام مرد۔ دونوں سفید کپڑے پہنے تھے۔ لڑکی نے سینے کے پاس امن کا نیلا بیج لگایا تھا جس پر فاختہ بیٹھی ہوئی تھی۔ مرد کے ہاتھ میں کاغذوں کا ایک پلندہ تھا اور ایک بڑا سا بیگ۔ لڑکی کے ہاتھ میں رول کیے ہوئے کچھ کاغذ تھے اور ایک سیاہ مخمل کا پاکٹ' جس پر ٹنکی ہوئی ہنکیوں نے پورے کمرے میں روشنی کی لہریں دوڑا دی تھیں۔ میرے آتے ہی وہ دونوں کھڑے ہوگئے۔ سلام کے بعد لڑکی نے ایک کاغذ میرے آگے بڑھایا اور اپنے بلاؤز کے گریبان سے قلم نکالنے لگی۔ امن اپیل کا وہ کاغذ دیکھ کر میرا غصہ اور بڑھ گیا' مگر اس اجنبی لڑکی کے جوڑے میں لگے ہوئے سرخ گلابوں کو دیکھنے میں انہیں کوئی تلخ جواب دینا بھول گیا۔

"بات یہ ہے صاحب۔" میں نے کاغذ اس کی جانب لوٹاتے ہوئے کہا:۔

"میں جنگ کو برا نہیں سمجھتا۔ میں جنگ میں مرنے سے نہ تو خود ڈرتا ہوں اور نہ کسی کو بچانا چاہتا ہوں۔ اگر' ابھی' اسی وقت' اس کمرے میں بم گر رہے ہوں تو میں تیار ہوں---" آنکھیں بند کرکے میں لڑکی کے خط و خال کو یوں سمیٹنے لگا جیسے ایٹم بم گرنے کی آواز کا منتظر ہوں۔ پھر آنکھیں کھول کے میں نے لڑکی سے پوچھا:۔

"بتائیے' میں کیوں دستخط کروں---؟"

"بس یوں ہی۔ بہت سے ایسے ہیں جو دنیا کے دوسرے لوگوں کی خاطر بھی امن چاہتے ہیں۔"

اس بار مرد نے لڑکی کی مدد کی اور وہ لڑکی اداسی سے بولی:۔

"ممکن ہے آپ زندگی سے وقتی طور پر بے زار ہوں' لیکن دوسروں نے پیار و محبت کے جو محل بنائے ہیں انہیں تو باقی رہنے دیجیے--- جیسے--- جیسے ___ میرا مطلب ہے آپ کے گھر میں سے تو بہت سی آوازیں آرہی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں آپ کے دستخط میں اتنی تنہائی نہ ہوگی---؟"

میرا موڈ اور خراب ہوگیا۔

"ضروری نہیں کہ اس گھر میں رہنے والوں سے اب میرا کوئی پیار و محبت کا بھی رشتہ باقی ہو۔ اب میں ان کے لیے اور کوئی قربانی دے سکوں۔ مجھ سے پہلے اگر اس گھر پر شعلے برسنے لگیں تو مجھے افسوس نہ ہوگا۔"

اس کے ساتھ مرد نے اکتا کر لڑکی کو دیکھا۔ جس کا مطلب تھا' "اس منحوس سے

بحث بے کار ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں آپ کا قیمتی وقت یہاں بری طرح ضائع ہو رہا ہے۔" میں نے جتایا۔

"نہیں یہ ہمارا فرض ہے۔" لڑکی خوش اخلاقی سے مسکرائی "صرف پانچ منٹ دیجئے تاکہ ہم امن کی اہمیت آپ پر واضح کر سکیں۔"

"معاف کیجئے خاتون" میں تقریر کرنے کے انداز میں پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کے کھڑا ہو گیا۔

"مجھ پر جنگ اور امن کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے۔ آپ سے کچھ سن کر یقیناً" مسرت ہو گی۔ لیکن یہ بحث بے کارے ہے۔"

"خیر---" لڑکی نے مایوسی کے ساتھ قلم کو دوبارہ گریبان میں لگاتے ہوئے کہا:---

"انہیں مجبور مت کرو نزائن۔ بے چارے کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جب کبھی آپ کی محبوبہ سے صلح ہو جائے تو ضرور سوچئے گا کہ یہ دنیا کتنی خوبصورت ہے' اسے باقی رکھنا کتنا ضروری ہے۔" وہ دونوں ہنستے ہوئے چلے گئے۔

دوسرے دن میں پیس کمیٹی کے آفس میں بیٹھا ایک گھنٹے تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ پانچ بجے وہ تین لڑکیوں کے ساتھ آئی۔

"کہیے جناب آج کیا ہمارے آفس پر ایٹم بم پھینکنے کا ارادہ ہے---؟"

"نہیں' آج میں یہ اندازہ لگانے آیا ہوں کہ یہ دنیا کتنی خوبصورت ہو سکتی ہے۔ اسے باقی رکھنا ضروری ہے یا نہیں۔"

وہ زور زور سے ہنسنے لگی اور باری باری سب ہی لڑکیوں کے کانوں میں میرے متعلق سرگوشیاں کیں' اس طرح کہ میں نہ دیکھ سکوں۔

لیکن آج پھر شوخ رنگ گلابوں کی سفارش پر میں نے اسے معاف کر دیا۔

لڑکیاں چاہے پڑھ لکھ کر کتنی ہی مہذب بن جائیں' مگر سرگوشیاں' خوش فہمیاں اور چھوٹے چھوٹے راز ان کی زندگی سے جدا نہیں ہوتے۔ یہ راز جو اگر افشا ہو جائیں تو ان کا ہارٹ فیل ہو جائے لیکن ان رازوں کے پیچھے کوئی اہم بات نہیں ہوتی۔

اس نے دفتر میں اپنی فائلوں کی تکمیل کی اور بہت سے مصروف لوگوں میں مل کر ایک گھنٹے تک میز پر جھکی کام کرتی رہی' پھر ایک ہاتھ میں پاکٹ اور دوسرے ہاتھ میں

سوویت وومن' کا ایک پرچہ لیے میرے قریب آبیٹھی۔

"اب تو آفس بند ہو چکا ہے۔ آپ صبح آکر دستخط کر سکتے ہیں یا پھر یوں کیجئے---"

"لیکن میں دستخط کرنے تو نہیں آیا۔"

"اچھا---" وہ خوش ہو کر بولی۔ اور رسالہ اپنے گھٹنوں پر رکھ کر ایک تصویر دیکھنے لگی۔ ایک نوجوان عورت چہرے پر امید و بیم کی ملی جلی کیفیتیں لیے ایک بچے کو چھاتی سے چمٹائے ہوئے تھی اور دوسرے بچے کو اپنے ہاتھ سے چھپا رہی تھی۔ اس کی خوف زدہ نگاہیں دور کچھ دیکھ رہی تھیں' جہاں پہاڑیوں کے پیچھے ہوائی جہاز منڈلا رہے تھے' شعلے بلند ہو رہے تھے' اور دھوئیں کی چادروں کے پیچھے سے شفق کی ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔

"آپ معافی مانگنے آئے ہیں۔" بعض اوقات اس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت آجاتی تھی۔

"جی نہیں--" مجھے اس کی خوش فہمی پر ترس آنے لگا۔ "میں صرف آپ کا نام پوچھنے آیا ہوں۔"

وہ پھر ہنسنے لگی اور ہنستے ہنستے رسالہ میری جانب بڑھایا۔

"دیکھیے' یہ عورت کتنی اچھی ہے--- اچھا' آپ کو اس کا کون سا بچہ اچھا لگ رہا ہے۔ یہ ___ یا--- وہ گود والا--- میرے خیال میں تو ___>

"میرے خیال میں تو یہ عورت ہی سب سے اچھی ہے۔"

"اونہہ' عورت کے متعلق کون پوچھ رہا ہے۔"

"لیکن میں صرف عورت کے متعلق سننا چاہتا ہوں۔"

"اچھا---" اس نے رسالہ کھول کر غور سے اس عورت کو دیکھا۔

"اس کا نام آشا ہے یا شانتی۔ جنگ کے میدان میں جتنے چراغ بجھتے ہیں یہ اتنی ہی شمعیں روشن کر دیتی ہے۔ جب تک یہ زندہ ہے کائنات کا دل دھڑکتا رہے گا۔ آنے والی بہاروں پر کوئی شعلے نہ برسا سکے گا۔ اسے کہانیاں سننے کا شوق تھا' پھر یہ خود بھی کہانی بننے لگی تو اس نے خواب دیکھنا شروع کئے۔ یہ خواب دیکھنے والے بڑے دکھی رہتے ہیں۔ اپنے سپنوں میں نہ جانے کتنے موتیوں کا سراغ لگاتے ہیں اور آنکھ کھلنے کے بعد ان کی تلاش میں کانٹوں پر چلتے ہیں۔ ہر شخص اپنے خوابوں میں چمکنے والے ہیروں کی ضو سے اپنی زندگی کا اندھیرا دور کرنا چاہتا ہے--- اس لڑکی نے بھی جب نیچے جھک کر اس گہر کو اٹھانا چاہا تو اس

کے ہاتھ میں ایک ننھی سی کلی آگئی۔ ننھی سی، شاداب سی کلی، جس نے ابھی مسکرانا نہیں سیکھا، مگر اس کلی پر بجلیاں منڈلانے لگیں، موت انہیں ڈھونڈتی پھری--- ایسا تو اکثر ہی ہوتا ہے کہ ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے لباس پر ہیرے کی کنیاں ٹانکیں، مگر وہ درد کے پیوندوں میں بدل جائیں--- اب وہ اپنی کلی کو سینے سے لگائے افق کی جانب دیکھ رہی ہے، جہاں للت چلا گیا، شاید وہ مرچلا ہو یا کسی شہر کی اذیت گاہ میں تڑپ رہا ہو۔ شاید--- شاید اپنی سر کو خط لکھ رہا ہو۔ کاش ایسا ہی ہو کہ وہ خط لکھتا رہے۔ خط لکھتے وقت وہ بہت خوش رہتا ہے۔ شاعر ہے نا--- آج تک ایک نظم نہیں لکھی، لیکن آپ کہہ دیں کہ تم شاعر نہیں ہو تو خفا ہوجائے گا۔ کہتا ہے اوشا میری بہترین نظم ہے---

"للت کہتا ہے ___ للت کہتا ہے"

اس نے تصویر سے نگاہیں ہٹا کر مجھے دیکھا اور اچانک کسی نشانے سے زخمی ہو کر زمین پر آن گری--- "اوہ، معاف کیجئے۔ میں ___ آپ کیا کہہ رہے تھے۔ نہیں میں کیا کہہ رہی تھی---؟"

"للت کہتا ہے۔"

"نہیں۔" شرم و دکھ کے ملے جلے لہجے میں اس نے کہا: "للت کا ذکر چھوڑیئے، آپ مجھ سے کیا پوچھ رہے تھے۔"

"اس عورت کا نام"

"نہیں، آپ کوئی کہانی سنایئے" اس نے رسالہ بند کردیا۔

"مجھے تو سرخ گلابوں اور ہیرے کی کنیوں والی کوئی کہانی یاد نہیں۔ صرف سوالاکھ روپے کے بیکار چیک کا قصہ یاد ہے، جو کسی بینک میں کیش نہیں ہوسکتا۔ میری کہانی اپنی ملمع چڑھے کنگنوں کی امید ہے اور بری کے جوڑے کا ارمان۔ اور میری ماں کے جھوٹے خوابوں کا طویل سلسلہ--- شاید دنیا کی ہر ماں خواب دیکھنے کی عادی ہوتی ہے اور آنکھ کھلنے کے بعد اس خواب کا کوئی گرا پڑا ذرہ تلاش کرنے میں لگ جاتی ہے۔ بات یہ ہے سر___ معاف کرنا سرلا دیوی، کہ ہم لوگ آپ کی طرح سلیقہ سے خواب نہیں دیکھتے۔"

"اچھا تو آپ کل صبح یہاں آکر دستخط کردیجئے۔" وہ اپنا پاکٹ اور رسالہ لے کر کھڑی ہوگئی۔

"لیکن ابھی میں نے یہ طے کب کیا ہے کہ یہ دنیا کتنی حسین ہے، اسے باقی رہنے

دوں یا نہیں!"

وہ شاید مسکرائی ہو' کیونکہ اندھیرے کمرے میں کچھ روشنی کا احساس سا ہوا تھا۔

"یہ رسالہ لیجئے۔۔۔ اس سر سے پوچھئے۔ آپ جب بھی اس کو دیکھیں گے یہ یقین و مسرت کی نئی کہانیاں سنائے گی۔" پھر وہ مجھ سے ہاتھ ملا کے چلی گئی اور بہت دیر تک میں اپنے ہاتھ کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

کئی دن تک میں اس سے نہ مل سکا' مگر مردوں کی فطری تجسس والی رگ نے مجھے کئی لوگوں سے سر کے متعلق پوچھنے پر مجبور کیا' مگر عام طور پر اس کے متعلق بری رائیوں کا ڈھیر جمع ہوگیا۔

"ہم نے اسے چھپ چھپ کر مردوں سے ملتے دیکھا ہے۔"

"کہتی ہے میرا شوہر جیل میں ہے۔"

"وہ ہر ایک کو ایسی ہی من گھڑت کہانیاں سناتی ہے۔"

"صرف ایک ننھی سی بچی کے ساتھ گھر میں تنہا رہتی ہے۔ اس کے ہاں ہر وقت مرد آتے رہتے ہیں۔" بلکہ میرے ایک دوست کے دوست کا کہنا تھا کہ اس کے کسی دوست کے دوست نے اسے بتایا ہے کہ یہ امن وامن وغیرہ کا تو سب بہانہ ہے۔ جب کسی لڑکی کے پاس دکھانے کے لیے بہت سی ساڑیاں جمع ہوجاتی ہیں تو پھر وہ کسی کلچرل پروگرام میں حصہ لیتی ہے یا کسی جلسے میں عورتوں کے حقوق پر تقریر کرتی ہے' جہاں یونیورسٹی کے لڑکوں کے آنے کا امکان ہو۔ یا پھر ہاتھ میں امن اپیل اور قلم تھام کر ہر شخص کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ لوگ اس اپیل کو نہیں پڑھتے' جس میں تمام دنیا کے نیک دل لوگوں کو پکارا جاتا ہے' بلکہ وہ ان ملتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھتے ہیں ان خوبصورت ہاتھوں کو' جو ان کے آگے پھیلے ہوئے ہیں' اور پھر جی چاہتا ہے ہمارا نام اتنا لمبا ہو جائے کہ دنیا جہان کے سارے حروف ختم ہوجائیں' تاکہ ہم یوں ہی اس کے قریب کھڑے سینٹ کی خوشبو سونگھے جائیں۔ سرخ گلابوں کو دیکھے جائیں۔

میری مسرت پر اوس پڑ گئی۔ ہمیں ان لڑکیوں سے مل کر کتنی مایوسی ہوتی ہے جو ہماری دسترس سے دور ہوں۔ باسی گلابوں کے لیے کون مرتا پھرے۔

سر کے شاعرانہ لہجے میں' اس کی خوبصورت آنکھوں میں اور بلا وجہ ہنسی میں گھلی ہوئی آوارگی سے' مجھے نفرت ہوگئی۔ کئی بار وہ پبلک جلسوں میں نظر آئی۔ "کہئے آپ نے

دستخط کر دیئے؟"

"نہیں' اب میں نے دستخط کرنے کا ارادہ ملتوی کردیا ہے۔"

"میں نے نفرت سے کہا:---

"کسی دن فرصت ہو تو آفس آکر اس لڑکی کا پتہ ضرور بتایئے گا۔"

اس نے مخصوص بے تکلفی کا انداز پیدا کرتے ہوئے کہا:---

"مجھے اس کی بے وقوفی پر تعجب ہوتا ہے' جو ابھی تک آپ کو دنیا کی خوبصورتی کا احساس نہ دلا سکی۔"

لیکن میں نے سر کی اس کھلی دعوت کو بھی قبول نہیں کیا۔ مجھے سر کے مقابلے میں وہ لڑکیاں زیادہ پسند ہیں جو سینما ہال یا پارک میں اچانک آپ کو مخاطب کرتی ہیں: "آپ نے مجھے بلایا ہے---؟"

پھر میں اپنے کمرے میں پلنگ پر بوجھ بنا پڑا رہا۔

"اللہ نے چاہا تو اب رشدی کو نوکری ملنے ہی والی ہے۔ رات میں نے خواب میں کیا دیکھا کہ ایک بزرگ کہہ رہے ہیں: "جا اب تیری سب مشکلیں دور ہو جائیں گی"

اماں کے خوابوں کا سلسلہ اب دیوانگی کو چھو رہا تھا۔ اب تو سارے گھر کو متعدی مرض کی طرح خواب دیکھنے کی عادت ہوگئی تھی۔ پنجرے میں بند مٹھو جو دن بھر گردن میں چونچ دبائے اونگھتا رہتا تھا' معلوم نہیں خواب دیکھتا ہو گا کہ نہیں۔

دن بھر دفتروں کی خاک چھاننے اور لوگوں کی لعنت ملامت سننے کے بعد میں گھر آتا تو یہی سوچتا۔ یہ جانور خوابوں کے بغیر کیسے زندگی کاٹ دیتے ہیں۔ ان کی زندگی میں بڑی بڑی نوکریاں' گلابوں کی کلیاں' ہیرے کی کنیاں اور سونے کے کنگن کبھی نہیں جھلملاتے۔ (خواب دیکھنے والے انسان بڑے دکھی رہتے ہیں۔) مجھے سر یاد آئی۔

مگر وہ تو ہمیشہ خوش رہتی ہے۔ اس دن ڈاکٹر کچلو کے لیکچر میں ملی تو کیسے بن بن کے کہہ رہی تھی:---

"اوشا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بڑی مشکل سے آئی ہوں۔ کیا کروں یہ کام بھی تو ضروری ہے۔ للت کہتا ہے اوشا میری زندگی کی صبح ہے' مگر اوشا کی زندگی پر جنگ کی سیاہیاں پھیلنا چاہتی ہیں۔" پھر اپنے آنسو پونچھ کر وہ دوسرے آدمی سے مخاطب ہو گئی:---

"ہم امن میں کمیٹی کی مدد کے لیے ایک کلچر پروگرام کر رہے ہیں۔ میں کتھا کلی ناچ

پیش کروں گی۔ آپ کتنے ٹکٹ خریدیں گے؟"

چار مینار سگریٹ کا دھواں میرے حلق میں اٹک گیا۔

پروگرام کے ٹکٹ بیچنے میں وہ ایک دن پھر ہمارے گھر آئی۔

"میں نے آپ سے عرض کیا تھا نا' مجھے امن کے نام سے نفرت ہے۔ میں جنگ کے خواب دیکھتا ہوں' جو بھائی جان کی طرح میرے لیے بھی سکون و مسرت لے کر آئے گی۔"

"آپ رقص کا مظاہرہ کرنے کے لیے چندہ جمع کررہی ہیں' لیکن میں اپنے بیمار باپ کی دوا کے لیے کس نام سے فنڈ کروں' کون سی اپیل تیار کروں---؟"

"صرف ملازمت نہ ملنے سے آپ پر اتنی مایوسی چھائی ہوئی ہے۔" وہ افسوس و تعجب کے ملے جلے لہجے میں بولی۔

"میں نے ایک دن آپ کو "سوویت وومن" کا ایک پرچہ دیا تھا۔ آپ نے دوبارہ اس عورت کو نہیں دیکھا۔ اپنی ماں سے اب ان کے خواب نہیں سنتے---؟"

"وہ پرچہ کسی دن ڈھونڈ کر آپ کے آفس پہنچا دوں گا۔ مجھے ہر روز نئی کہانی سننے سے نفرت ہے۔" کئی مہینے گزر گئے۔ ان دنوں میں نے سر کو بہت کم دیکھا۔ جب بھی وہ ملی کچھ گھبرائی ہوئی سی۔ مجھ دیکھ کر کچھ پریشان' کچھ پشیمان ___ اور مجھے بڑی تسکین ملتی۔ جب انسان خود سلگ رہا ہو تو دوسروں پر انگارے اچھال کر کتنی تسکین ملتی ہے۔

یہ خیال ہی کتنا تسلی بخش ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگ ہم سے بھی زیادہ بے بس اور ذلیل ہیں۔ ہم بھی کسی سے اونچے ہوسکتے ہیں۔

پھر کئی مہینے تک وہ غائب سی رہی اور اس سے وابستہ نفرت کے نقوش بھی میرے ذہن سے مٹنے لگے۔ کئی بار اس کی ساتھی لڑکیوں اور مردوں کو دیکھ کر مجھے سر کا خیال آیا۔

جب میں نرائن سے ملنے کمپنی کے آفس گیا تو وہاں بھی سب ہمیشہ کی طرح اپنے کاموں میں مشغول نظر آئے۔ ان کی زبان سے سر کا نام کیوں غائب ہوگیا' جس کے بغیر کوئی کام پورا نہ ہوتا تھا' کوئی مسئلہ نہ سلجھ پاتا۔ جب وہ آفس میں آتی تو قہقہوں کا سیلاب آجاتا' اور سنجیدگی سے بات کرتی تو سب خاموش ہوجاتے۔ پھر اس کا کہانی سنانے کا انداز' کاش وہ اتنی جلدی اپنے آپ کو تباہ نہ کرلیتی۔ اتنی جلدی کھل کر نہ مرجھا جاتی۔ اتنی بہت سی کہانیاں نہ سناتی۔ کاش سر تم بھی اس ماں کی طرح افق کو دیکھتیں۔ کئی شمعیں روشن کرتیں۔ کاش سر--- سر--- سر--- کہاں ہے نرائن---؟"

"کئی مہینے سے تو ہسپتال میں تھی، لیکن آج کل یہیں ہے۔"

"ہاسپٹل میں---؟"

"ہاں---" نرائن ٹائپ رائٹر پر جھکا ہوا تھا۔ "اسد کی لڑکی بہت بیمار ہے۔ اس کی ملازمت چھوٹ گئی۔ ہم لوگ کیا کرسکتے ہیں۔ جو لوگ کام کرتے ہیں انہیں بھی کچھ نہیں دے سکتے۔"

دوسرے دن میں نے آفس میں سر کو دیکھا وہ بہت بدلی ہوئی سی تھی۔ جوڑے کی شوخ رنگ کلیاں مرجھا کے گر چکی تھیں اور ہمیشہ دودھ کی طرح صاف رہنے والی ساڑی بالکل میلی تھی۔ وہ بار بار لڑکھڑا کے کسی چیز کا سہارا لیتی اور بڑی نقاہت سے کچھ کاغذ سامنے رکھے ریڈی سے بحث کررہی تھی۔ پھر اٹھتے وقت اس نے فردا" فردا" سب کا شکریہ ادا کیا اور باہر آئی تو مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"ہیلو رشدی تمہاری ملازمت کا کیا ہوا---؟"

"ابھی تک نہیں ملی۔" میں نے لاپروائی سے کہا' اور اپنے سامنے اخبار کی دیوار کھڑی کرلی۔

"پھر---؟ تمہارے ابا اب کیسے ہیں۔ تم ابھی تک اپنے گھر پہ شعلے برساتے ہو---؟"

"تم بھی تو بہت دبلی ہوگئی ہو۔ میں نے سنا ہے کہ اوشا---"

اس نے اپنے ہتکیوں والے پاکٹ کو میز پر اوندھا دیا۔ کئی روپے کی ریز گاری بکھر گئی۔ جلدی سے اس نے اٹھا کر میری گود میں ڈال دی۔

"میں موٹی کیسے ہوسکتی ہوں رشدی۔ تم نے ابھی تک کلیوں کو ہنسنے کی اجازت نہیں دی۔ لو گھر جاتے وقت اپنے ابا کی دوا لیتے جانا۔ مجھے اس وقت بہت جلدی ہے۔ اوشا کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

"ٹھہرو سر---" میں نے پیسے واپس کرنا چاہے۔

وہ سیڑھیوں سے اترتے اترتے رک گئی اور پلٹ کر بولی :--- "سونے کے کنگن اور بری کے جوڑے بھی جلد ہی آئیں گے۔ جب تک تمہاری ماں کے سپنے سچے نہ ہوجائیں تمہیں اپنا چیک سنبھال کر رکھنا چاہئے۔ یہ سوا لاکھ کا چیک جب تم بھناؤ گے تو میں بھی اپنا

اس کے تھکے ہوئے چہرے پر وہی شاداب ہنسی تھی' وہی بے باکی اور رنگین خوابوں کا دھندلکا' جس کے حلقے میں اماں گھری رہتی ہیں۔

"پگلی ہے کمبخت---" اندر کوئی لڑکی سر پر لعنت بھیج رہی تھی۔

"ایک ہفتے کی محنت کے بعد ہم سب نے اوشا کے لیے یہ پیسے جمع کیے تھے اور---" میں جلدی سے سیڑھیاں اتر کے نیچے آیا۔ سڑکوں پر اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ موٹروں' سائیکلوں اور آدمیوں کے ہجوم سے بچتی ہوئی وہ یوں جارہی تھی جیسے جلتا ہوا چراغ بھنور میں پھنس کر چکرا رہا ہو۔

"سر--- سرلا۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ یہ دنیا باقی رہے گی۔ میں نے اپنی محبوبہ سے صلح کرلی ہے۔ مجھے سرخ گلابوں کی کلیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔"

سر نے جاتے جاتے مجھے پلٹ کر دیکھا اور اپنے پاکٹ والے ہاتھ کو اونچا کرکے مجھے آشیرواد دی۔ اس کی مسکراہٹ کے ساتھ پاکٹ کی چمکیوں نے جھلملا کر بہت سی شمعیں روشن کردی تھیں---

○

روشنی کے مینار

ٹرین تیزی سے پدا گوڑہ کے درمیانی اسٹیشن طے کر رہی تھی۔

مسافر ایک کونے میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ یا کبھی کبھی جھانک کر باہر دیکھ لیتا جہاں اونچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ آسمان کی سرحد سے مل گیا تھا۔ ان پہاڑیوں کے پیچھے کون سی دنیا آباد ہو گی---!

مسافر نے اس کے متعلق بالکل نہ سوچا۔

سورج دن بھر کی تھکن سے نڈھال ہو کر سیندھی کے درختوں پر جھک رہا تھا۔ اپریل کے آخری دن آ گئے تھے۔ فصلیں کاٹی جا چکی تھیں۔ کہیں کہیں سنہری دھوپ میں ترکاری کے کھیت یا گھاس کے میدان پھیلے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ کسان زمین صاف کر رہے تھے۔ سیندھے کے تناور درختوں کا سلسلہ ٹرین کے دونوں طرف اس طرح پھیلا ہوا تھا جیسے وہ سب بھی مسافر کے ساتھ ساتھ پدا گوڑہ کی جانب ایک سو ایک روپے کی انسپکٹری کے لیے دوڑ رہے ہوں۔

کئی بار اسے ٹرین کی سست رفتاری پر غصہ آیا۔ اگر یہی رفتار رہی تو دونوں وقت ملتے وہ کہیں رام گھاٹ پہنچ سکے گا' اور وہاں سے پدا گوڑہ تک جیسا کہ پرشوتم جمعدار نے بتایا تھا' اسے بس مل جائے گی' اگر بس کا وقت نکل گیا تو کوئی اور سواری یا پھر---۔

اور اس نے گھبرا کے سوچا کہ اگر بس چھوٹ چکی' سواری نہ ملی تو پھر--- آگے پرشوتم نے کیا بتایا تھا---؟

اس کے قریب دو مارواڑنیں بیٹھی تھیں' جو کسی بھاگی ہوئی لڑکی کے خاندان سے قطع تعلق کرنے پر زوردار بحث کر رہی تھیں۔ دو مارواڑی جن کے کانوں میں سونے کی بالیاں کانپ رہی تھیں اور سروں پر رنگین دھنک کی پگڑیاں بندھی تھیں۔ گجراتی میں ان تاریخی قصوں کا ذکر کر رہے تھے' جب ان کے آباواجداد نے ایک ایک کے ہزار بنانے کی وہ مثال چھوڑی جس پر وہ آج تک عمل نہ کر سکے۔ وہ کھدر پوش بہت دیر تک موجودہ کانگریس اور سوشلسٹ نظریوں کو علیحدہ علیحدہ کرنے میں ناکام ہو کر اب خاموش ہو بیٹھے تھے۔

تین کسان ان کی برتھ کے نیچے فرش پر بیٹھے' اپنے گاؤں کے کسی خاص واقعے کا ذکر کر رہے تھے' جس نے نہ صرف سارے گاؤں کو تہ و بالا کر دیا تھا بلکہ وہ خود بھی آج

یہی کہانی سنانے کسی دوسرے گاؤں جا رہے تھے۔ ایک کرچن عورت اپنے ایک درجن بچوں کے سر کھڑکی سے باہر نکالے تامل زبان میں سیندھی نکالنے کی ترکیب سمجھا رہی تھی۔ برتھ کے آخری کونے پر بیس بائیس برس کی ایک دبلی سی لڑکی گھٹنوں پر کہنیاں ٹیکے کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ اس کی آنکھوں کی دل کش چمک نے اس کے سانولے چہرے کو بہت خوبصورت بنا دیا تھا۔ کبھی وہ اچانک اپنے گھٹنوں پر رکھے ہوئے بیگ کو کھول کر کچھ کاغذ نکالتی اور ادھر ادھر دیکھ کر انھیں پھر بیگ میں رکھ کر زور زور سے پیر ہلانے لگتی۔

جب مسافر ٹرین میں سوار ہوا تو وہ وہ ایک جوشیلا ترانہ سنا رہی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ ایک فلمی گیت میں بدل گیا۔ اور اب تو گاڑی باقاعدہ سسکیاں بھر رہی تھی۔

سگرٹ پیتے اور درخت گنتے گنتے وہ بے زار ہو جاتا تو اس کی نگاہیں لڑکی کے چہرے کا جائزہ لینے لگتیں۔۔۔ کاش ان بوڑھی مارواڑنوں کی بجائے اس کی ہمسایہ وہ لڑکی ہوتی تو کم سے کم کوئی بات کرکے اسکی آواز ہی سن لیتا۔ اس کا نام معلوم ہو جاتا اور اس طرح یہ دو گھنٹے کا سفر کافی دلچسپ بن سکتا تھا۔ معمولی خدوخال کی سہی، بہرحال وہ ایک لڑکی تھی۔ اسے لڑکیوں کے نام معلوم کرنے کی بڑی جستجو رہتی تھی۔ پھر اس نے لڑکی کے لیے بھی کوئی موزوں سا نام سوچا۔۔۔ نینا۔۔۔ لتا۔۔۔ کامنی۔۔۔ سونیا۔۔۔ خورشید۔۔۔ انجم۔۔۔

ٹرین کس معمولی سی اسٹیشن پر چند منٹ رکی۔۔۔ اسٹیشن بالکل ویران سا تھا۔ بلکہ ٹین کا ایک شیڈ ڈال کر اسٹیشن نما بنا دیا گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر آدمیوں سے زیادہ کوے اور گدھ تھے، جو مسافروں کے پھینکے ہوئے جھوٹے پتے اور روٹی کے ٹکڑے لے کر اڑ رہے تھے۔ تاروں کے احاطے کے پار پتلی سی ناہموار سڑک اونچے نیچے پیچ و خم میں کھو گئی تھی۔ ایک بوڑھا لاٹھی میں گٹھری انکائے، ایک اخبار بیچنے والا لڑکا اور دڑانیوں کے ایک چھتے کا کیبن میں اضافہ ہو گیا۔ دڑانیاں بے حد گندی تھیں۔ سڑی ہوئی مچھلیوں جیسی بو چاروں طرف پھیل گئی۔ مگر انھیں دیکھ کر مسافر کو سنگ اسود کی چٹانیں یاد آ گئیں۔ سیاہ چمکتے ہوئے جسم ننگی چھاتیاں، سفید دانت، پاؤں میں نکل کے کڑے، گلے میں سرخ منکوں کی مالائیں اور ایک ادھوری سی دھوتی میں اپنا جسم چھپانے کی ناکام کوشش۔ جیسے اجنتا کی مورتیاں متحرک ہو گئی ہوں۔ بے اختیار انہیں چھو کر انگلیاں زخمی کرنے کو جی چاہتا۔ اخبار بیچنے والا لڑکا زور زور سے چیخنے لگا۔ اس کے پاس کوئی گھٹیا سا اخبار تھا۔ مگر ایک آنے میں

اچھا اخبار بھی تو نہیں ملتا۔ اگرچہ مسافر کی جیب میں پندرہ روپے تھے اور جب جیب میں پندرہ روپے ہوں تو انسان کا جی کسی چیز کو نہیں چاہتا! ابھی اسے قلی کو مزدوری دینا تھی۔ پداگوڑہ تک سواری کا کرایہ دینا تھا۔ رات کا کھانا تھا۔ چائے تھی۔ سگرٹ تھے۔ اور کیا پتہ صبح کچہری پہنچتے ہی اسے تنخواہ ملے نہ ملے۔

اپنی اقتصادی حالت کا اچھی طرح جائزہ لینے کا بعد اس نے بڑی مایوسی سے کھڑکی کے پٹ پر سر ٹیک کر سگریٹ سلگا لیا۔ جب بھی وہ کسی نئی ناکامی یا مجبوری سے دو چار ہوتا تو سگر۔ٹ سلگا لیا کرتا تھا۔

مگر اخبار بیچنے والا لڑکا اب بھیک سی مانگ رہا تھا۔ جیسے یہ اخبار آج نہ بکے تو ایک قیامت خیز طوفان آجائے گا۔ اس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے چھوٹے بہن بھائی ضبط کے بندھن توڑ کر رونے لگیں گے۔ اس کی بیمار ماں اپنے جسم اور روح کی کشمکش میں شکست کھا جائے گی۔ یہ اخبار نہ بکے تو ٹرین الٹ جائے گی' دنیا اپنے محور سے ہٹ جائے گی' ایک اور خوف ناک جنگ کا آغاز ہو جائے گا' جس کی بنیاد یہ اخبار بیچنے والا لڑکا رکھے گا--- یہ اخبار خرید لو ورنہ میں تمھیں اپنا دوسرا روپ دکھاؤں گا۔ اخبار تمھیں قطعی خرید لینے چاہیں' ورنہ کل کی ہیبتناک خبروں کے لیے تیار ہو جاؤ۔

ایک مارواڑی نے دوسرے کی جانب دیکھ کر پوچھا: "کونسی بھاشا ہے---!"

"کوئی بھی ہو ہمیں لینا نہیں ہے۔" اس کے ساتھی نے جلدی سے کہہ دیا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے اخبار خواہ کیسا ہی ہو اسے خرید کر بہرحال ایک آنے کا گھاٹا ہی رہے گا۔

"سب گپ چھوڑتے ہیں جی یہ لوگ--- میں نے تو اب یہ پیپر ویپر پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔"

وہ زور زور سے یوں ہنسنے لگا جیسے اس کے نہ پڑھنے سے اب دنیا ایک جگہ رک کر کھڑی ہو گئی ہے اور مارواڑی کے ہلائے بغیر اپنی جگہ سے جنبش نہ کر سکے گی۔

نا امید ہو کر لڑکا چلانے لگا: "صرف پانچ کمیونسٹوں نے تین سو آدمیوں سے جنگ کی--- مدراس میں قحط نہیں ہے۔ مسٹر منشی کا بیان--- تلنگانے میں سکون ہو گیا--- آج کا تازہ اخبار صرف ایک آنے میں۔ صرف ایک---"

کسی نے ان خبروں پر دھیان نہ دیا۔ البتہ دونوں مارواڑی چوکنے ہو کر سنبھل بیٹھے اور جلدی سے اخبار خرید کر لڑکی کی جانب بڑھے--- "بہن جی جرا یہ کھبر تو سناؤ۔"

"پانچ کمیونسٹوں نے تین سو آدمیوں سے جنگ کی---" لڑکی نے اخبار کی سرخی سنائی۔

"حساب تو لگایئے سیٹھ جی ایک کمیونسٹ کتنے انسانوں کے مساوی ہوتا ہے---؟"

دونوں مارواڑی اس کو غور سے دیکھنے لگے۔

"آپ کو معمے حل کرنا آتے ہیں سیٹھ جی---" لڑکی نے سنجیدگی سے پوچھا اور اخبار ان کی جانب بڑھا دیا۔

دونوں مارواڑی اس سے ناراض ہو چکے تھے اس لیے وہ دڑانیوں سے باتیں کرنے لگی۔

مسافر نے سوچا کہ آج ہر سامراجی ملک کے ماہران ریاضی سوال حل کرنے میں مصروف ہیں۔ اس غیر دلچسپ فضا سے تنگ آ کر وہ باہر جھانکنے لگا' جہاں پٹریوں کی ایک اور لکیر بھی ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی اور آس پاس کے درخت مست قدم ہو گئے تھے۔

گاڑی رام گھاٹ پر رک گئی۔

مسافر اپنا ہینڈ بیگ لے کر اتر گیا۔ آسمان پر دھندلکا پھیلنے لگا تھا اور رام گھاٹ کے اسٹیشن کی روشنیاں جاگ اٹھی تھیں۔ پلیٹ فارم پر شور مچا ہوا تھا۔ مزدوروں' کسانوں اور دھیڑوں سے اسٹیشن بھرا ہوا تھا' جو چھوٹی چھوٹی گٹھریاں' لاٹھیاں اور بچے کاندھوں پر لادے ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ دو چار سفید دھوتیاں بھی چمک جاتیں۔ پلیٹ فارم کا زیادہ حصہ اناج کے بوروں سے بھرا تھا جو شہر کو جانے والے تھے۔ مسافر کے پیر سے ایک خارش زدہ کتا دب گیا اور وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔

پلیٹ فارم سے باہر آ کر اس نے دیکھا کہ کوئی سواری اس کی منتظر نہ تھی۔

سامنے پرانے پیپل کے نیچے جہاں پرشوتم نے بس اسٹینڈ بتایا تھا' ایک بچہ پیشاب کر رہا تھا۔ پاس ہی ایک سفید گائے چر رہی تھی پلیٹ فارم کے دائیں جانب کئی بیل گاڑیاں کھڑی تھیں' جن کے بیل اور ہانکنے والے غائب تھے۔

اس نے دور تک پگڈنڈی پر نظر ڈالی' جو کسی سہاگن کی سیندور بھری مانگ کی طرح سرخ تھی۔ ادھر پانچ میل آگے جا کر وہ پداگوڑہ کو چھوتی ہوگی۔ پانچ میل کا سفر یاد کر کے اس کے پیر من من بھر کے ہو گئے۔ تھکن کا احساس اندھیرے کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگا۔

رام گھاٹ کے آبادی والے حصہ میں دھوئیں کے بادل امنڈ رہے تھے' کتے بھونک

رہے تھے اور بچوں کا دھیما دھیما شور بلند ہو رہا تھا۔

اس کے ساتھ اترنے والے مسافر ادھر ادھ کے راستوں پر گئے تھے۔ بہت دیر تک چاروں طرف پریشانی سے دیکھنے کے بعد اس نے دوبارہ اسٹیشن میں د س ہو کر اسٹیشن ماسٹر سے ایک رات کی پناہ مانگنے کا ارادہ کیا--- مگر اندر سے ٹرین والی لڑکی اور دڑانیوں کے گروہ کو آتا دیکھ کر رک گیا۔ انھیں بھی تو کسی سواری کا انتظار کرنا ہو گا۔

سفید ساڑی والی لڑکی کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ اس کے جوڑے میں سرخ گلاب کی دو کلیاں لگی ہوئی تھیں اور ماتھے پر سرخ کم کم کی بندیا چمک رہی تھی۔ وہ سب بے تکلفی سے تلگو میں باتیں کر رہی تھیں۔ لڑکی تھوڑی دور جا کر چند منٹ رکی اور پلٹ آئی۔

"آپ شاید کسی سواری کے انتظار میں ہیں---؟" اس نے اردو میں مسافر سے پوچھا۔

"جی ہاں مجھے پداگوڑہ جانا ہے' مگر ابھی تک کوئی سواری نہیں ملی۔"

"لیکن سواری تو آپ کو اس وقت نہیں ملے گی۔ بس چھ بجے چھوٹ جاتی ہے۔ ہم لوگ پداگوڑہ روڈ تک جائیں گے۔ آیئے سب کے ساتھ راستہ آسانی سے کٹ جائے گا۔

مسافر کے قدم خود بخود اس کے ہمراہ اٹھنے لگے اور ایک نا معلوم خوف کا احساس اس پر چھانے لگا۔ ممکن ہے وہ کسی ڈاکو کی ٹولی سے تعلق رکھتی ہو۔ یوں ہی سافروں کو گھیر گھار کر لے جاتی ہو اور ان دڑانیوں کا تو پیشہ ہی لوٹ مار ہوتا ہے۔

تیزی سے بڑھنے والے اندھیرے نے اسے خوف زدہ کر دیا اور وہ ڈر کو دور کرنے کے لیے کوئی اور بات سوچنے لگا۔

مسافر پوری طرح تلگو نہیں بول سکتا تھا اس لیے وہ ان کی باتوں میں حصہ لینے کی بجائے جنگل میں پھیلی ہوئی انجانے پھولوں کی خوشبو سونگھنے لگا۔ آس پاس کدو اور ترکاریوں کے کھیت تھے۔ جن کے اوپر پیلے اور سفید پھولوں کی چادریں سی پھیلی ہوئی تھیں۔ کھیتوں کی منڈیروں پر جنگلی پھولوں کے خاردار پودے لگے ہوئے تھے۔ چلتے چلتے لڑکی نے ایک سفید پھول توڑا اور اپنے نکلتے سورج کی طرح بندھے ہوئے جوڑے میں ٹانگ دیا۔ اب وہ پھول اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں کتنا خوبصورت اور ممتاز نظر آرہا تھا--- مسافر نے بھی تقلید میں ایک پھول توڑا۔ اس کا ہاتھ پہلے لڑکی کی جانب بڑھا' پھر اپنے میز کی جانب--- اس نے پھول کو ایک مینڈک پر اچھال دیا جو اچانک لڑکی کے پیروں میں جا کر الجھا---

لڑکی نے پیچھے پلٹ کر مسافر کو دیکھا تو اس نے جلدی سے دونوں ہاتھوں کی آڑ بنا کر سگریٹ سلگانا شروع کر دیا۔

وہ پھر اپنے ساتھیوں سے زور دار بحث میں مصروف ہو گئی۔

مسافر نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی اور قریب جا کر ایک وڑانی سے نیم اردو نیم تلگو میں پوچھا:

"یکڑ کی پو تنؤ اماں۔۔۔؟" (کہاں جا رہی ہو ماں؟)۔

"ہم لوگ سندر نگرم جا رہے ہیں۔" ۔۔۔ ایک دم وہ سب چپ ہو گئیں جیسے کوئی خاص بات یاد آ گئی ہو۔

"کیا وہاں کوئی خاص کام ہے۔۔۔؟" مسافر نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہاں ان کے مردوں کو مار ڈالا گیا ہے۔" سفید ساڑی والی لڑکی نے دھیمی آواز میں کہا۔

پھر دوسری بولی: "انھوں نے جاگیر دار کے بنگلے میں مفت کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پٹواری نے دھمکیاں دیں کہ فصلیں چھین لیں گے۔ سرکار میں خبر کر دی جائے گی کہ یہ لوگ کیمونسٹوں سے مل گئے ہیں۔ تو میرے لڑکے کو غصہ آ گیا۔ اس نے پٹواری کے سر پر۔۔۔" وہ ڈر کے یوں چپ ہو گئی جیسے کوئی مجرم اچانک اپنے آپ کو پولیس کے حلقے میں گھرا ہوا دیکھے۔ اوہ تیسری نے سلسلہ کلام جاری رکھنے کی کوشش کی:۔

"پٹواری بے ہوش ہو کر گر پڑا اور مدد کو جاگیر دار کے آدمی آ گئے۔ ہمارے لوگوں نے ان کا مقابلہ بھی پھاوڑوں سے کیا۔۔۔ آخر۔۔۔" وہ تھک کر سانس لینے کو رکی، جیسے یہ کہانی سناتے سناتے صدیاں بیت گئی ہوں۔

"آخر وہ سب مار ڈالے گئے۔ اس کا شوہر۔ میرا بیٹا۔ اس کا دیور اور اس کے دو بیٹے۔"

پھر وہ عورت بھی خاموش ہو گئی۔ دور آبادی میں بھونکنے والے کتے بھی خاموش ہو گئے۔ جنگل کو شوریدہ سر ہوائیں بھی خاموش ہو گئیں۔ وڑانیوں کے پاؤں میں بجنے والے کانسی کے کڑے اور مسافر کے ساتھ ساتھ چلنے والے بہت سے قدم بھی، جو بظاہر اٹھ اٹھ کر آگے بڑھ رہے تھے، ساکت نظر آ رہے تھے۔ بس ایک سوالیہ علامت نگاہوں کے سامنے ابھری اور دور تک پھیل گئی۔

"پھر--- اب تم لوگ کیوں جا رہے ہو---؟" مسافر نے پوچھا۔

"یوں ہی۔ انہیں مٹی میں ملانے۔ اور کر ہی کیا سکتے ہیں---" بوڑھی ماں بولی۔

"ایسا تو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ قریب ہی کے گاؤں میں ایک بار میرا بڑا لڑکا کام کر رہا تھا۔ زمین پتھریلی تھی اور کسی طرح نہیں کھودی جا سکتی تھی' انجنیئر نے کہہ دیا کہ جب تک کوئی چٹان کے اندر گھس کر ڈائنامیٹ نہ لگائے گا عمارت نہ بن سکے گی۔ سب مزدوروں نے انکار کر دیا مگر میرے بیٹے کو دھوکہ دے کر ٹھیکیدار نے اتار دیا۔ تھوڑی دیر میں چٹان کے ٹکڑے ہوئے اور میرے بیٹے کے ہاتھ پاؤں دور دور کی پہاڑیوں تک اڑ کر گئے تھے۔"

"پھر کیا ہوا---؟" وہ عالی شان ہوٹل ابھی تک وہاں ہے---"

"یہ تو بہت ہی عام بات ہے۔" سفید ساڑی والی لڑکی بولی۔ "ایسا تو جب تک ہوتا رہے گا جب تک ان چٹانوں کو وہاں سے نہیں ہٹایا جائے گا۔"

بہت نا انصافی ہوتی ہے اس طبقے کے ساتھ---" مسافر نے بھی کچھ کہنا چاہا۔

"اچھا---؟ ہا ہا ہا---" لڑکی اس کی ادھوری بات چھین کر اتنی زور زور سے ہنسی کہ چاروں طرف آتش بازی کے انار سے سلگ اٹھے۔

"آپ اسی ملک کے باشندے ہیں! تعجب ہے آپ نے آج پہلی بار یہ ناانصافی کی کہانی سنی ہے۔ آپ کبھی وقار آباد کی رومنٹیاک زمین پر پکنک منانے نہیں گئے۔ کبھی قدیم عظمت اور آرٹ کو سراہنے اجنتا کے گاؤں میں نہیں ٹھہرے۔ کبھی کیرالا اور مہاراشٹر کے دیہاتوں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا---؟" وہ بظاہر معمولی سی لڑکی بڑھتے بڑھتے مسافر سے اونچی ہو گئی۔ اس نے لڑکی کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ اسے کوئی جواب ملا ہی نہیں۔

چاروں طرف تاریکی مسلط ہو چکی تھی اور ان کے آگے دوڑنے والی پگڈنڈی اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ اتنی کہ ہاتھ بڑھا کر آسمان پر کہیں کہیں چمکنے والے تاروں کو چھوا جا سکتا تھا۔

گہرے اندھیرے نے راستے کو بے حد محدود بنا دیا تھا۔ کبھی کبھی درختوں پر کوئی چڑیا دوسری چڑیا سے لڑ کر خاموش بیٹھتی یا پھر جھینگر ان کے پیروں سے پسنے والے سنگریزوں کا شور سن کر خاموش ہو جاتے۔ مسافر نے کنارے کے قریب جا کر نیچے دیکھنا چاہا تو لڑکی زور سے بولی:-

"ایسا مت کہیے۔ نیچے میلوں لمی خندقیں ہیں۔ اگر کوئی لڑھک جائے تو ہڈی پسلی کا پتہ نہ چلے۔ یہاں پر اکثر حادثے ہو جاتے ہیں۔

وہ پھر بے دلی سے چلنے لگا۔

آپ تھک گئے شاید---؟ لڑکی نے رک کر پوچھا۔ کیونکہ وہ کوشش کے بوجود قافلے سے پیچھے رہ جاتا تھا۔

"لایئے آپ کا ہینڈ بیگ میں تھام لوں۔" مسافر منع کرتا رہا مگر اس نے بیگ لے کر ساتھ والی ایک عورت کو دے دیا اور خود پیچھے آکر مسافر کے ہمراہ چلنے لگی۔

لڑکی کا ناک نقشہ معمولی سا تھا اور اب تو تاریکی نے اس کے گندمی رنگ کو بھی چھپا دیا تھا۔ مگر پھر بھی اس کا تندرست جسم' سنہری آواز' بے تکلف ہنسی اور سب سے بڑھ کر ایک عورت کے قرب کے احساس کو وہ فراموش نہ کر سکا۔ اس نے ابھی ختم ہونے والی باتیں بالکل بھلا دیں اور لڑکی کے متعلق سوچنے لگا۔ کوئی خوبصورت سی کہانی بننے لگا۔

اس نے چاہا کہ لڑکی کا ہاتھ پکڑ لے۔ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے قریب کر لے اور اس کی آنکھوں پر جھک کر پوچھے--- "بتاؤ تمہارا نام کیا ہے---؟ اندھیری راتوں میں مسافروں کو راستہ بتانے والی راہ نما۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم دونوں یوں ہی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے' ہمیشہ ان پھولوں بھرے کھیتوں میں گھومتے رہیں۔ اس اندھیرے میں کھو جائیں اور بالکل بھول جائیں کہ ہم کہاں جا رہے تھے۔ کہاں سے آئے تھے۔ ہمارے ساتھ چلنے والے لوگ کہاں گئے۔"

پھر وہ اپنا نام بتائے جو بے حد خوبصورت ہو' انتہائی درخشاں' جیسے گہرے سیاہ آسمان پر چمکتا ہوا کوئی سنہرہ تارہ۔ یا اس کی صندلی پیشانی پر سرخ کم کم کر بندیا--- پھر اس سرخ نشان کو چومنے کی خواہش نے اسے بے قرار کر دیا اور جب اس نے لڑکی کے قریب جا کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو وہ آگے بڑھ کر اپنی ساتھی عورتوں سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اب وہ لوگ آبادی کے قریب سے گزر رہے تھے۔ ہر گھر کے سامنے کتے بھونک کر ان کے یہاں آنے کی وجہ' نام و مقام دریافت کرتے اور پھر گالیاں دے دے کر اپنے گھر کی حدود سے دور پہنچا کر لوٹ آتے۔ جگہ جگہ لڑکیاں پیتل کے تھالوں میں پھول' کھلونے اور بتاشے رکھے آس پاس چراغوں کا ہالہ بنائے اردگرد ناچ رہی تھیں۔ دور سے یہ منظر بڑے خوبصورت دکھائی دیتے۔ جیسے آکاش کے تارے زمین پر اتر آئے ہوں۔ چراغوں کے گول

دائروں میں چمکتے ہوئے پھولوں کے سنہرے تھال جھلملاتے اور لڑکیاں ایک ہی زاویے سے ایک ساتھ ہاتھوں کو حرکت دیتیں۔ دسہرہ سے پہلے یہ ناچ رنگ کی محفلیں آندھرا کا مخصوص تیوہار ہوتی ہیں۔ لڑکی نے مسافر کو سمجھایا تھا۔

چلتے چلتے وہ لوگ ایک کھیت کی منڈیر پھلانگ کر ایک جھونپڑی میں جانے لگے، جس کے اندر ہلکی سی روشنی کی دھند تھی۔ وہ سب اندر گھس گئیں اور مسافر باہر کھڑا ایک ایک کر کے ابھرنے والے تاروں کو گننے لگا۔ پاس ہی چند اور جھونپڑیاں تھیں۔ ایک بھینس اور ایک بچھڑا بندھا ہوا تھا۔ جھونپڑی کے اوپر املی کا ایک گھنا پیڑ اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا تھا اور فضا میں گوبر کی بو رچ گئی تھی۔

"وہ کم بخت جو اپنے آپ کو یہاں اتنا غریب بتاتا تھا۔ پورا بھید لے کر فرار ہو گیا۔" اندر کوئی بوڑھا مرد تلگو میں کہہ رہا تھا۔

"ہا ہا ہا---" لڑکی کا مخصوص قہقہہ یوں گونجا جیسے چاندی کی گھنٹیاں بھوے سے ٹکرا گئی ہوں۔

"مگر دادا تم نے یہ نہیں سوچا کہ اب پرکاشو اس گاؤں میں آ چکی ہے۔ اس کی ساری سازش کا جال میرے بیگ میں محفوظ ہے۔ صبح کو وہ جس لاری سے آئیں گے--"

پھر وہ آہستہ آہستہ سرگوشیاں کرنے لگی۔

"اور رام---؟" ایک نئی نسوانی آواز گونجی۔ "نہیں پرکاشو تم ہمارے لیے اتنی بڑی قربانی نہ دو۔ اس میں رام کی جان کا بھی خطرہ ہے۔"

"خطرہ کیسا---؟" وہ طنز سے بولی۔ "تم لوگ ابھی تک خطروں سے ڈرتے ہو اور ان کے آنے کے بعد تمھاری جانوں کو بھی تو خطرہ ہے۔ اب تم بے فکر سو جاؤ دادا میں سب ٹھیک کر لوں گی۔"

وہ سب باہر نکل آئیں اور پھر اپنے راستے پر چلنے لگیں۔ مسافر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"آپ پداگوڑہ کیوں جا رہے ہیں---؟" لڑکی نے اس خاموشی سے بوریت محسوس کی۔

"میں وہاں اپنی ملازمت کا چارج لینے جا رہا ہوں۔ کل ایک ریٹائرڈ انسپکٹر سے مجھے اس کی پچپن سال کی سروس کا جائزہ لینا ہے۔"

"آپ پداگوڑہ کے انسپکٹر صاحب ہیں۔" وہ کسی قدر پریشان ہو گئی۔

"اور تم کہاں جا رہی ہو۔ کس کے پاس؟" اور پھر خود ہی اپنے سوالوں کو پیچھے چھوڑ کر اس نے پوچھا۔۔۔ "تمھارا نام کیا ہے۔۔۔؟"

ایک دم اتنے بہت سے سوالوں کو سن کر وہ ہنس پڑی۔

"میرا نام پرکاش۔ پرکاشو۔"

"پرکاشو۔۔۔" مسافر نے سیٹی بجا کر کہا۔ "تمھیں اس طرح تاریک راستوں پر چلتے ڈر نہیں لگتا۔۔۔؟" مسافر نے اپنی' ایک مرد کی موجودگی کا احساس دلانا چاہا۔

مگر پرکاشو پھر فضا میں اپنی ہنسی کا اجالا بکھیر کر بولی :۔

"ڈر۔۔۔؟ ڈر کیا چیز ہوتا ہے۔ میں نے آج تک اسے محسوس نہیں کیا۔ اور پھر میں تنہا تو نہیں ہوں۔ میرے ساتھ بہت سے لوگ ہیں جو نہیں جانتے ڈر کیا چیز ہے' تھکن کیسی ہوتی ہے۔ کون سا کام ہے جو نہیں ہو سکتا۔"

اپنی بات کا اتنا خشک اور غیر متعلق سا جواب سن کر وہ مایوس سا ہو گیا۔ یہ لڑکیوں کا فلسفہ بگھارنا اسے ہمیشہ زہر لگتا۔

"وہ دور روشنیاں نظر آ رہی ہیں نا۔" لڑکی نے بتایا۔

وہیں ہمارا گاؤں ہے۔ بہت خوبصورت گاؤں تھا وہ۔ اب تو روز روز کی لڑائیوں سے بالکل اجڑ گیا ہے۔ رام کہتا تھا تمھارے گاؤں کی طرح کا میٹھا پانی دنیا میں کہیں نہیں ہوتا۔ وہاں کی مٹی بڑی زرخیز ہے۔ کیلے اور سیتا پھل کے باغ ہیں اور جب سنکیسر کے پھول کھلتے ہیں تو پورے گاؤں میں روشنی ہو جاتی ہے۔ مگر آج کل سارے باغ مرجھا گئے ہیں۔ اب ہمارا گاؤں بڑا اداس ہو گیا ہے۔"

"تم جو اس گاؤں میں نہیں ہو۔۔۔" وہ دونوں ہنس پڑے۔

"اب تم اپنے گاؤں نہیں جا رہی ہو۔۔۔"

"نہیں' میں اپنی سسرال جا رہی ہوں۔"

مسافر کو یوں لگا جیسے اس کے تعمیر کیے ہوئے جذبات کے قلعے اتنی زور سے ٹوٹ کر گرے ہیں کہ شور سن کر پرکاشو کا چیخ پڑنا یقینی ہے۔

"سسرال۔۔۔؟"

"ہاں وہاں میرا پتی لاریاں چلایا کرتا ہے۔ پہلے میں ہر دوسرے تیسرے مہینے اس سے

ملنے آتی تھی۔ مگر پچھلی بار ایک جلسے میں لاٹھی چارج ہو جانے میں زخمی ہو گئی اور ایک گاؤں کے ہاسپٹل میں تین مہینے تک پڑی رہی۔ اب آج آخری بار اس سے ملنے جا رہی ہوں کیونکہ وہ ایک بہت دور کے گاؤں جانے والا ہے۔"

"کہاں رہتا ہے وہ---؟ مسافر نے یوں پوچھا جیسے اپنے رقیب سے انتقام لینے وہاں ضرور جائے گا۔

"واہ کیوں بتاؤں میں۔ انسپکٹری کا جائزہ لیتے وقت اس کا پتہ پوچھنا چاہتے ہو---؟"

ٹھیک ہے--- مسافر کو یاد آیا۔ شہر سے یہاں روانہ ہوتے وقت اسے اپنی ملازمت کے متعلق بہت سی ضروری ہدایتیں دی گئی تھیں۔ اس نے اپنی نوکری کا حال بتا کر سخت غلطی کی تھی۔ اگر وہ اتنی جلد بازی سے کام نہ لیتا تو کل رام کے مرنے کے بعد پرکاشو کو آسانی سے حاصل کر سکتا تھا--- وہ دونوں یوں ہی تاریک وادیوں میں گھومتے۔ اس طرح پداگوڑہ کی یہ تکلیف دہ تنہائی کسی حد تک دور ہو جاتی۔

اب کیا ہو سکتا تھا۔ دن بھر وہ کچہری میں بیٹھا جھوٹے مقدموں کی رپورٹیں بنایا کرے گا۔ لاریوں میں بیٹھ کر ادھر ادھر کے دیہاتیوں کو پکڑتا پھرے گا۔ ان ماؤں سے رشوت لے گا جن کے بچے مر چکے ہیں، جن کی آنکھوں کی جوت جاتی رہی ہے۔

"وہ دیکھیے--- دور جو بستی کی لالٹین نظر آ رہی ہے---" پرکاشو نے انگلی اٹھا کر بتایا۔ "بس اسی جانب چلے جائیے۔ پداگوڑہ وہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔ پولیس کچہری قریب ہی ہے۔ آپ کو ڈھونڈنا نہیں پڑے گی۔" آگے بڑھ کر دوسری عورتیں کھڑی ہو گئیں۔

کھیتوں کی حفاظت کرنے والے کتے بھونک رہے تھے اور دور روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔

"اب میں جاتی ہوں۔" پرکاشو نے بے تکلفی سے ہاتھ بڑھایا تو مسافر کی ٹھنڈی انگلیوں میں اس کا دل دھڑک رہا تھا اور وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ حلق میں پھندے سے لگ رہے تھے۔

"ہم پھر کبھی ملیں گے۔ میں اپنے ساتھ چلنے والوں کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ اور پھر آپ ٹھہرے پداگوڑہ کے انسپکٹر صاحب۔" اس نے مسافر کا سوٹ کیس تھماتے ہوئے کہا۔

" آپ جہاں جا رہے ہیں وہاں بھی زندگی بیدار ہو رہی ہے۔ وہاں بھی آپ کو کوئی

بیگم' وملا' نورا یا پرکاشو ضرور ملے گی---" وہ آگے بڑھ گئی۔

مسافر کے ہاتھ اپنے سگریٹ کیس کو ڈھونڈنے لگے۔

اندھیرے کو چیرتی ہوئی وہ لڑکی آگے بڑھ گئی جہاں اس کا پتی انتظار کر رہا ہو گا۔ جہاں وہ اپنے وجود کے اجالے سے ہر خوف و ہراس کو دور کرنے کی طاقت رکھتی ہے اور مسافر اس راستے پر چل دیا جو ایک سو ایک روپے کی انسپکٹری کی طرف جاتا تھا۔ جس کے لیے وہ میلوں دور سے کھنچا چلا آیا تھا--- لال ٹین کے نیچے پروانوں کا ہجوم تھا جو دائیے بنا کر چکر کاٹ رہے تھے اور اندھیرے کو گہرا کر رہے تھے۔ کچھ بیل گاڑیاں اناج سے بھری رام گھاٹ اسٹیشن کو جا رہی تھیں۔ ایک عورت سر پر چارے کا گٹھا اور بغل میں امباڑے کا ساگ دبائے گزر گئی۔ دور کسی کتے نے بھونک کر اس کا استقبال کرنا چاہا--- مسافر نے گھوم کر ایک گلی میں دیکھا۔

ایک اودی جامن کی طرح چمکتی ہوئی لڑکی کھڑی تھی۔ سرخ موٹی ساری اور چاندی کی بالیاں پہنے۔ اس نے کتے کو چمکار کر بلایا۔ جب مسافر اس کی جانب دیکھنے لگا تو وہ ٹھوڑی پر انگلی رکھے اسے اتنی دلچسپی سے دیکھ کر مسکرائی جیسے آج اس نے پہلی بار اپنے گاؤں میں کسی مرد کو پینٹ شرٹ پہنے دیکھا ہو۔ اس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک دیکھ کر مسافر کو شبہ ہوا کہ یہ ملگجا سا اجالا لال ٹین کی بجائے اس کی آنکھوں سے پھوٹ رہا ہے۔ ان دیہاتیوں کی لڑکیوں نے پانی آنکھوں میں اتنی بجلیاں کیوں بھر لی ہیں---؟ وہ غیرارادی طور پر اس کے قریب چلا گیا۔ اتنا قریب کہ مجبوراً" کتا دم ہلا کر خاموش ہو گیا۔ مگر وہ یوں ہی مسکراتی رہی۔ مسافر لڑکی کی ٹھوڑی پکڑ کے پوچھا:

"کچہری کا پتہ بتا سکتی ہو---؟"

وہ نہ شرمائی نہ جھجکی--- مسافر کو یہ بات بہت پسند آئی۔ ورنہ شہر کی لڑکیوں کیجانب انگلی بھی اٹھاؤ تو یوں چیختی ہیں جیسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو۔ ذرا دلچسپی سے دیکھو تو پیر کا سینڈل ہاتھ میں تھام لیتی ہیں۔ اسے یہ سارا قصور تہذیب و تمدن کا نظر آیا۔ ہم لوگ تہذیب کو ترقی دیتے دیتے اتنی دور جا پڑے ہیں کہ اب عورت' عورت نہیں میٹھی گلاب جامن بن کر رہ گئی ہے اور مرد ایک وحشی درندہ ہے جو بھوکا کتا بن کر رہ گیا ہے۔ کاش ایک بار پھر تہذیب و تمدن کے اجارہ دار' مہذب سوسائٹی کے بورژوا نمائندے گاؤں آئیں۔ پدا گوڑہ آ کے دیکھیں۔ جہاں پرکاش اندھیری راتوں میں مردوں کو منزل دکھاتی ہے

اور لڑکیوں کی بیضوی ٹھوڑی اگر چھو لو تو وہ چیخ کر گالیاں نہیں دیتیں۔ اپنے شوہر اور بھائیوں کو مدد کے لیے نہیں پکارتیں بلکہ اپنی آنکھوں کا نشہ پلا کر پیدل چلنے والے مسافروں کی تھکن اتار دیتی ہیں۔

"کہاں جا رہے ہو تم---؟" وہ محویت سے چونکی۔

"نہ معلوم کہاں جاؤں گا۔ دنیا میں کون اپنی منزل کا پتہ بتا سکتا ہے۔ اس محور کا پتہ جس کی کشش اسے کھینچ کر کہیں پھینک دیتی ہے۔"

پھر اسے خیال آیا دیہاتی لڑکیوں کے سامنے فلسفے سے کام نہیں چلتا۔ ان سے تو بس سیدھی سادی سی باتیں پوچھنا چاہئیں مثلاً":-

"تمہارے کھیت کے گوبھی اچھے ہوتے ہیں یا پچھی کے---؟ کھیت کے---؟"

"تم دن بھر ان کھیتوں میں کام کرکے کتنا کما لیتی ہو---؟" مسافر نے پوچھا۔

"تمہارا نام پرکاش ہے یا پرکاشو--- تم بھی مسافروں کو منزل پر پہنچایا کرتی ہو---؟"

اور اس نے اپنی طویل کہانی وہیں کھڑے کھڑے سنا دی۔

اس کا نام پرنیا تھا۔ پہلے اس کے کھیت تھے، بیل تھے، مگر اس کے باپ کی شادی پر لیے ہوئے قرض کا بوجھ اتنا بڑھ گیا کہ ان کے کھیت اور بیل ساہوکار نے چھین لیے اور وہ لوگ اپنے ہی کھیتوں پر مزدوری کرنے لگے۔ پھر اس کی ماں مر گئی اور کریا کرم کے لیے سارے خاندان کو ہاتھ پاؤں ساہوکار کے پاس گروی رکھنا پڑے۔ اس کا بھائی قرض اتارتے اتارتے شہر بھاگ گیا۔ پھر یہ خبر آئی کہ مزدوروں کے کسی جلسے میں وہ مارا گیا۔ اب وہ اپنے باپ کی نگرانی کرتی ہے۔

مسافر نے اس کی داستان توجہ سے نہ سنی۔ کیونکہ گاؤں کی ہر لڑکی کی یہی کہانی ہوتی ہے۔

لڑکی بولی: "آؤ مسافر، تم پردیسی ہو۔ آج رات میرے مہمان رہو۔ چلو اچھا ہوا کہ تم آگئے، ورنہ میں بہت پریشان تھی۔"

پورنیا آگے آگے جانے لگی۔ اس کے پیروں میں کامنی کے کڑے تھے۔ مسافر کے قدم بھی اس کے پیروں کے نشان پر اٹھتے گئے۔ کتے نے لپک کر اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر کی نشان دہی کی اور اندر گھس کر بھونکنے لگا--- دروازے پر پہنچ کر مسافر کے قدم رک گئے۔

یہ گاؤں کی ایک لڑکی کا گھر تھا۔ نہ جانے پورنیا کا باپ اپنی لڑکی کے ساتھ ایک اجنبی مرد کو دیکھ کر کیا کہے۔ ممکن ہے ڈانٹ کر باہر نکال دے۔ چیخ چیخ کر سارے گاؤں کو اکٹھا کرلے اور یوں گاؤں میں قدم رکھتے ہی اس کی انسپکٹری کی بلند پوزیشن خراب ہوجائے۔

پورنیا نے کونے میں رکھی ہوئی ٹوکری اٹھا کر سر پر رکھی اور مڑ کے بولی۔

"تم بابا کے پاس اندر بیٹھو میں ابھی آتی ہو۔"

"کون ہے---؟" اندر دھوئیں بھری کوٹھری سے کھانسی میں ملی جلی آواز آئی اور مسافر سہم گیا۔

"یہ پردیسی بابو صاحب ہیں بابا۔ آج رات یہاں رہیں گے۔" پورنیا نے اطمینان سے کہا۔

وہ ڈرتا جھجکتا اندر داخل ہوا۔

کونے میں ایک دھواں اگلتا چراغ رکھا تھا۔ جس کی کمزور روشنی میں ایک بڈھا چولہے کے سامنے بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ چولہے میں گیلی لکڑیوں کا دھواں بھا گیا تھا۔ چند مٹی کی ہانڈیاں اور کچھ میلی کچیلی گٹھڑیاں ادھر ادھر پڑی تھیں۔ ایک کونے میں چیتھڑوں میں لپٹا ایک ننھا سا بچہ سو رہا تھا۔

"آؤ بیٹھ جاؤ صاحب۔" مگر پینٹ شرٹ میں جکڑے ہوئے مسافر کو اکڑوں بیٹھنے میں بڑی تکلیف ہوئی۔ مسلسل چلنے کی وجہ سے اس کے پیروں میں درد ہو رہا تھا۔

"تم سے پارو نے کتنے روپے لیے ہیں---؟" وہ پگلی ہمیشہ یوں ہی مفت خوروں کو لے آتی ہے۔ اس لیے پوچھ رہا ہوں۔" بوڑھے نے بے نور آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

"کیسے روپے بابا؟" میں تو یہاں کا انسپکٹر ہو کے آیا ہوں۔ تمہارے گاؤں میں۔ وہ سمجھا بابا اپنے مکان اور کھانے کا معاوضہ پیشگی طلب کر رہا ہے۔ بے چارے دیہاتی اب اپنی مفلسی کے سبب مہمانوں کی مفت خاطر تواضع بھی نہیں کرسکتے۔

"چاہے آپ کوئی لاٹ صاحب ہوں بابو" بوڑھا چڑ کر بولا۔ "ایک رات کے بھی دس روپے دینا ہوں گے۔ پورے دس روپے۔ یہاں خیرات نہیں بٹتی۔ دس روپے دیئے بغیر تم پورنیا کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔"

"مسافر کے دل پر کسی نے دس فائر کر دیئے۔ یہ پورنیا نہیں ہے۔ یہ پورنیا دس

روپے کے لیے ہرگز نہیں بک سکتی۔ یہ پاک اور معصوم پورنیا--- یہ کسی دیہاتی کی جھونپڑی کیسے ہوسکتی ہے، جہاں کی سادگی اور معصومیت کی قسم کھائی جاتی ہے، جہاں کے باپ اپنی آن پر جان قربان کردینا معمولی بات سمجھتے ہیں۔

اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"تم اندھے ہو بابا، مگر اپنی روح میں اندھیرا نہ بھرو--- کیوں اپنے وجود سے دھرتی کو گندہ کر رہے ہو--- تم مر کیوں نہیں جاتے۔ اپنی بیٹی کی قیمت چکانے سے پہلے تمہاری زبان سڑ کیوں نہ گئی۔"

بوڑھا بڑے طنز سے ہنسا۔

"ہونہہ--- میں مر جاؤں تاکہ تم بغیر کسی قیمت کے پورنیا کو لوٹتے رہو۔ اپنے وجود سے دھرتی کو میں گندہ کرتا ہوں یا تم۔ جب تک گاؤں کے انسپکٹر، پٹیل، جمعدار اور تحصیل دار ہماری عزت کو تاکیں گے ہم یوں ہی اپنی عزت کی قیمت چکائیں گے--- مگر اب وہ وقت دور نہیں رہا۔ چاہے میری اندھی آنکھیں نہ دیکھ سکیں، مگر ایک دن ہم اپنی عزت کی کوڑی کوڑی وصول کرلیں گے۔ بیٹھ جاؤ مسافر۔

"تمہیں میری باتیں بری لگ رہی ہیں نا۔ کبھی میں بھی یوں ہی سوچا کرتا تھا۔ یوں ہی اپنی عزت کو سینے سے لگائے مر جانا چاہتا تھا، مگر تمہارے ایک بھائی نے جو شہر سے اکڑتا ہوا آیا تھا میری معصوم بچی کو گناہ کے دروازے پر کھڑا کردیا۔ اس سے بدلہ لینے کے لیے میں نے اپنی ساری زندگی تجھے دی۔ اپنی آنکھوں کی جیوتی کھو دی۔ اپنا جوان بیٹا کھو دیا۔"

"اور اب اپنی بیٹی کے جسم کا سودا کر کے کھاتے ہو۔" مسافر نے پوچھا۔

"ہاں--- بھوک سے اندھا ہونے کے بعد انسان یہ نہیں سوچتا کہ روٹی کہاں سے آئے۔ وہ تمہاری طرح بڑی بڑی باتوں میں نہیں الجھتا صاحب۔ تم اس گاؤں میں نئے نئے آئے ہو۔ ابھی تمہیں معلوم نہیں کہ یہاں کے اندھے باپ کون سی روشنی کی آس میں جیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو بازار میں کھڑا کردیا ہے۔"

مسافر نے اپنی کل پونجی نکال کر بڈھے کے سامنے پھینک دی۔ اسی وقت پورنیا اندر آئی اور غصہ میں بھرے مسافر کو دیکھ کر ایک کونے میں کھڑی ہوگئی۔ جب مسافر باہر جانے لگا تو اس نے روکا۔ "کھانا تو کھاتے جاؤ پردیسی۔"

مسافر نے جاتے ہوئے سنا۔ بڈھا کہہ رہا تھا۔ "کیوں روک رہی ہے ری، جانے

دے۔ اب ان روپوں کو ہمیں آج ہی بھیج دینا چاہیے۔"

رات کو بارہ بجے جب تمام مرحلوں سے گزر کے، آفس کے اندر ایک سیلی سیلی سی کوٹھری میں اسے لیٹنے کا ٹھکانہ ملا تو وہ اپنی ڈائری لکھنے بیٹھ گیا۔

"یہ پدا گوڑہ ہے۔"

"جہاں صرف پورنماشی کی پرکاشیں بستی ہیں۔ جن کے بیٹوں کے ٹکڑے پہاڑیوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ جن کے بھائی زمیندار کے تشدد کے لاٹھیوں سے مرچکے ہیں، جن کے شوہر گہری خندقوں کے لیے اپنے آپ کو پیش کررہے ہیں، جن کے گاؤں کی بہار اجڑ چکی ہے، پھول مرجھا گئے ہیں، جلتے دیپ بجھ چکے ہیں۔

"اور وہ تاریک راستوں پر بے خوف گھوم رہی ہیں۔ بھولے بھٹکے راہ گیروں کو راستہ دکھا رہی ہیں۔ وہ اپنے محبوب، بھائی اور شوہر کو بھول چکی ہیں۔ یہ پدا گوڑہ بڑا ہی عجیب گاؤں ہے۔ یہاں کے باپ اندھے ہوچکے ہیں۔ مگر انہیں ایک روشن صبح کا انتظار ہے۔ انہوں نے اپنی عزت کا نیلام کردیا ہے۔ ایک بہت بڑی بازی جیتنے کے لیے۔"

دور کہیں شور کی آواز سن کر مسافر نے لکھنا بند کردیا اور باہر نکل آیا۔ ڈیوٹی والے سپاہی بینچوں پر پڑے سو رہے تھے اور بہت سے لوگ اس جانب بھاگ رہے تھے۔ اتنے میں پورنیا کا باپ لاٹھی ٹیکتا ادھر سے گزرا۔ مسافر نے آگے بڑھ کے اس سے جھگڑے کی وجہ پوچھی تو وہ پھر ہنسنے لگا۔

"لو بھئی گاؤں میں جھگڑا ہو رہا ہے اور انسپکٹر صاحب ہم سے وجہ پوچھ رہے ہیں۔"

پھر بڈھے نے اسے بتایا کہ وہ گاؤں کے تحصیل دار کا گھر ہے اور وہاں ہر وقت گاؤں کے کسان کسی نہ کسی جرم کی پاداش میں گھسیٹے جاتے ہیں۔ آج کسی کسان کی بیوی اچانک مرگئی ہے، مگر تحصیل دار کے کارندے مصر ہیں کہ اس کی موت میں کسان کا بھی ہاتھ ہے۔ اگر وہ انہیں کچھ نہیں دے گا تو پولیس کو اطلاع دی جائے گی۔

بڈھے نے اسے آگے لیے جاتے ہوئے کہا:

"انسپکٹر صاحب یہ گاؤں کی زندگی ہے۔ جہاں نہ کوئی اپنی موت مرسکتا ہے نہ زندہ رہ سکتا ہے، زندگی بھر وہ اپنے خون کا خراج ان لوگوں کی دوزخ میں انڈیلتی رہی اور مرنے کے بعد بھی ان کی جیب گرم کیے بغیر چھٹکارا نہیں ہے۔ آپ کو بھی ایسے ہتھکنڈے آتے ہوں گے۔۔۔؟"

مسافر کوئی جواب نہ دے سکا۔

رات بھر وہ بڑی بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اور صبح کے اندھیرے میں نکل کر گاؤں کی طرف چل دیا۔

مشرق کی جانب نور کا دھندلا نشان ابھر رہا تھا۔ گھر میں چکیاں چلنے کی آوازیں شروع ہوگئی تھیں۔ فضا میں گھنٹیوں' مرغیوں اور چڑیوں کا شور رچا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کوئی آدمی کسی گلی سے نکل کر کھیتوں کی جانب چلا جاتا اور کوئی بچہ نیند بھری آواز میں رونے لگتا یا کامنی کے گھڑے اور مٹکیاں مانجھنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔

ایک پرانے کھنڈر کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا۔ دھندلکے میں درخت کی آڑ لیے ایک عورت اور مرد کھڑے تھے۔

"رات تو تمہارے ہاں کوئی نہیں آیا' پھر یہ روپے کہاں سے آئے---؟" مرد نے پوچھا۔

"تمہیں کیا--- بھگوان نے رحم کیا ہے۔ اب تم جلدی سے جا کے یہ روپے پرکاشو کو دے دینا۔ مگر کبھی اسے خبر نہ ہونے پائے کہ یہ روپیہ ایک بیسوا بھیجتی ہے۔" مسافر نے پورنیا کی آواز پہچان لی۔

"مگر تم اپنے آپ کو بیچ کر اتنے روپے کیوں بھیجتی ہو۔ یہ تو بہت بری بات ہے۔"

"یہ سب تو نہیں جانتا مادیگا---" اس نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

"گاؤں کی ہزار لڑکیوں کی عزت لٹنے سے پہلے اگر ایک بیسوا خود کو یہ کاروبار کرلے تو کیا برا ہے۔ میں چاہتی ہوں یہ. ظلم مجھ پر ختم ہوجائیں' میری بیٹی کی کوملتا کی طرف کوئی دیکھ نہ سکے۔ اب تو جا--- لوگ آنے لگے ہیں۔"

سفید چادر اوڑھے پورنیا اس کے قریب سے گزری تو مسافر اسے ڈرا کے ہنسنے لگا۔

"ڈر گئیں---؟"

"نہیں میں اتنی سی بات سے نہیں ڈرتی---" وہ اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے بولی۔

"رات تم نے مجھے کچہری کا راستہ کیوں نہ بتایا---"

"میں راستہ بتانے والی نہیں' راستہ بھٹکانے والی ہوں بابو جی' میں نہیں جانتی آپ کا راستہ کون سا ہے---" شاید پورنیا کو مسافر کا رات والا غصہ یاد آگیا۔

مسافر نے قریب جا کر اسے کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"مگر پرکاشو نے کہا تھا تم بھی راستہ بتا سکتی ہو۔ تم بھی منزل کی نشان دہی کر سکتی ہو۔ کیونکہ پداگوڑہ کی عورتیں وہ شمعیں ہیں جو خود سلگ کر دوسروں کو زندہ رکھتی ہیں۔ وہ چراغ ہیں جو دن کے اجالے تک راہ نمائی کرتا ہے۔ تم وہ روشنی کا مینار ہو پورنیا جو بھولے بھٹکے ملاحوں کو سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔"

اس نے پورنیا کو اور قریب کرنا چاہا مگر وہ ہاتھ چھڑا کے دور ہٹ گئی۔

"آپ کو پرکاشو نے بھی تو بتایا ہوگا کہ وہ روشنی کا مینار ابھی نگاہوں سے اوجھل ہے اور راستہ میں خطرناک بھنور منہ کھولے کھڑے ہیں اور اس نے میرے سپرد کتنے کام کیے ہیں۔"

وہ آگے بڑھ گئی۔۔۔ مسافر نے شکست خوردہ انداز میں سگریٹ سلگایا اور سوچنے لگا۔۔۔ اسے کس طرف جانا ہے۔۔۔؟

○

پنچوں کی رائے

اگر سورج نکلنے کے بعد آپ صبح ہونے کا یقین کرلیتے ہوں تو دوسری بات ہے' ویسے دھمو چمار کو تو آج دن نکلنے کا یقین ہی نہیں آرہا تھا' کیونکہ جب تک درگاہ سے واپسی میں شبراتن خالہ اسے نماز کے لیے نہ جگا جائیں' پچھلے پانچ برسوں میں وہ کبھی نہ اٹھا تھا۔

یہ بات اتنی ضروری تھی کہ اگر شبراتن خالہ اسے نہ اٹھایا کریں تو ضرور نظام شمسی پر کسی خرابی کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔ پھر ذرا کی ذرا وہ دم لینے دکان کے پٹرے سے لگی تسبیح پڑھنے لگتیں تو دھمو لحاف سے منہ نکالے بغیر ہی اپنی ٹانگ والے ناسور کی کیفیت' کل کی آمدنی کا حال' اور سالے جمعدار کی زیادتی بھی انہیں سنا دیا کرتا تھا۔

زیارت ایسی کون سی اللہ میاں کے پچھواڑے تھی۔ دراصل شبراتن خالہ اس دکھیا کی خاطر ہی رک جایا کرتی تھیں۔ اور تسبیح پر کوئی درود تھوری پڑھا جاتا۔ اس وقت وہ دھمو جوانا مرگ کے لیے دعا مانگا کرتیں۔

ویسے تو وہ ایک گھنٹے سے لوہار والی دکان کی چوکھٹ کا تکیہ بنائے' پھٹی گدڑی میں پڑا جاگ رہا تھا۔ رات سے ناسور میں وہ آگ پھنکی تھی کہ معلوم ہوتا کسی نے کباب کی طرح سیخ پر چڑھا کے انگاروں پر رکھ دیا ہے۔ اس مارا ماری میں خواجہ میراثی کا کتا اس کے سر پر پیشاب کرگیا تو عشاء کی نماز بھی ماری گئی۔ یہ سب باتیں شبراتن خالہ کو سنائے بغیر وہ کیسے اٹھ سکتا تھا۔۔؟

نون مرچ بیچنے والے لالہ نے بہت دیر ہوئی پوجا کے بعد دکان کھول کر جھاڑو دینا شروع کردی تھی۔ اخبار والا لڑکا آج بھی ڈپٹن کے گھر پیسوں کا تقاضا کرکے گیا تھا۔ صفائی کرنے والا بھنگی گندگی کو موریوں سے نکال کے کبھی کا سڑک پر پھیلا چکا تھا' اور دو چار دکانوں کے کواڑ کھڑ کھڑا رہے تھے' مگر گھسی ہوئی سلیم شاہی جوتیوں کی وہ مخصوص سٹر پٹر ابھی تک سنائی نہ دی تھی' جس کے بعد ایک سوکھا مارا مہربان ہاتھ اس کا کاندھا پکڑ کے جھنجوڑ ڈالتا۔

"اللہ مارے نماز نکلی جارہی ہے۔ اٹھ۔۔۔"

شبراتن خالہ خواجہ کی ماں کی طرح گالیاں کبھی نہ بکتی تھی' مگر جس پر حد سے زیادہ تاؤ آتا اسے کوسے ضرور دیا کرتی۔ پھر ہمیشہ کی سڑن' دیوانی' دکان دار اس کی ہر اچھی بھلی

بات کو بے وقوفی کے خانے میں ڈال دیتے تھے۔ میر صاحب اور قاضی صاحب کے ہاں بیویاں ایک دوسری کو مثال دیتیں :---

"اوی بیوی، کیا شبراتن سیدانی بنی ہو۔ ذرا میں ہنس دیں، ذرا میں رو دیں۔"

یوں اس کی زندگی میں ہنسی کی بالکل گنجائش نہ تھی، لیکن محض اس ڈر سے کہ آپ خفا نہ ہوجائیں وہ ہر دم ہنسنے کو تیار رہتی۔ اس گراموفون کی طرح جس پر آپ چاہے میر انیس کے نوحے بجائیں یا چارلی کے گیت۔

سامنے ہی پرانے نیم تلے ان کا کھنڈر نما ٹوٹا پھوٹا مکان ہے، مگر اس ٹوٹے دروازے پر محلے کے ہر آدمی کو دن میں سو بار جانا پڑتا۔ آدھی رات کو کسی کے پیٹ میں درد اٹھے تو سونف کا عرق یہیں سے ملتا۔ کسی کی بیوی کے بچہ ہو رہا ہو تو دائی اور نرس بن کر شبراتن کو ہی دوڑنا پڑتا۔ کسی کے بچے بھوکے ہوں تو وہی روٹیوں پر دال رکھ کے چپکے سے دے آتی تھی۔ کسی کے ہاں موت ہوجائے تو سب سے پہلے تسلی دینے وہی دوڑتی تھی۔ دکان داروں کے ہر وقت کام، جو ان کی پھوہڑ بیویاں نہ کرپاتیں، شبراتن کو ہی کرنا پڑتے تھے۔ دوسروں کے دکھ دیکھ کر آپ آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لیں، مگر شبراتن سے تو نہ دیکھا جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جب تکلیف ہو تو ہمدردی کے دو میٹھے بول کتنے ضروری ہوتے ہیں۔ اس پر بھی کسی دن ہنڈیا میں ڈالنے کو کسی دکان دار سے ادھار نمک مانگتی تو نہ ملتا۔

"ہے بڑی چالاک بڑھیا۔ انگلی پکڑ کے پہنچہ پکڑنا چاہتی ہے۔"

ادھر نوشے میاں سنتے تو الٹا اسی کو چیخنے چلانے بیٹھ جاتے :---

"تم ہی بے وقوف ہو، جو سب کے لیے مرتی پھرتی ہو۔ پاگل ہے نا تو۔"

"اللہ کی مار پڑے، جو اب کسی کے گھر جاؤں۔"

وہ محض اس لیے ارادہ کرتی کہ لوگ اسے بے وقوف نہ سمجھ لیں، مگر صبح ہوتے ہی پھر وہی جلے پاؤں کی بلی بنی گھر گھر جھانکتی پھر رہی ہے۔ وہ کیا کرے، یہ اللہ مارے محلے والے اسے چین بھی لینے دیں۔ یوں کہنے کو اللہ رکھے جوان نوشے میاں کی موجودگی میں کسی کی آس پر جینے کی کیا ضرورت تھی، مگر اس کی دکان تو کسی دیو کا منہ تھی کہ بھرے چلے جاؤ غائب ہوتا جاتا۔

زندگی کی اس پھٹیچر گاڑی کو گھسیٹنے کے لیے بھی دن بھر اسے سوت کاتنا پڑتا، چکی چلانا پڑتی، انگیوں، کرتیوں کی سلائی کرتی۔ پھر نوشے میاں کی تجارت بڑھانے کے لیے، افن کی

اولاد کے لیے' دھمو چمار کی آمدنی کے لیے آئے دن زیارتوں کے چلے کھینچنا' روزے رکھنا اور نفلیں پڑھنا بھی ان کی مصروفیت میں شامل تھا۔

مگر اوپر والے بزرگوں سے بھی اس کی جٹھانی نے ضرور کچھ لگائی بجھائی کی تھی' جو وہاں بھی کوئی اس کی فریادوں پر کان نہ دھرتا۔

زندگی مرا گدھا ہوگئی تھی' جسے گھسیٹتے گھسیٹتے اس کے پیروں میں رعشہ آگیا تھا۔ اس پر بھی وہ جدھر سے گزرتی تالیاں بجانے والے حرامی لونڈے اس کے پیچھے پیچھے گھومتے۔

"جوان لڑکا ہے' خود ہاتھ پاؤں کیوں نہیں ہلاتا' جو تم خون پسینہ ایک کرکے اپنی ساری کمائی لٹائے دیتی ہو۔" اس کی بھاوج اپنا قیمتی مشورہ پیش کرتی۔

"میری مانو تو اپنے پیسے میرے پاس جمع کر جایا کرو۔"

"مگر نوشے کی پھوپھی کہتی ہیں اب کون سی دنیا کے لیے جمع کرتی ہو۔ جو کچھ ہے دکان میں لگاؤ تو کچھ تجارت بڑھے۔" وہ سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیتی۔

"اونہہ' جو دل میں آئے سو کرو۔" بھاوج غصہ میں بھنا کے چلی جاتی۔

"میری مانتیں تو آج گھر میں کرگھا لگا کے نوشے ڈھیروں کماتا۔"

ٹھیک بھی تھا۔ اللہ میاں نے اس کام میں بڑی برکت دی ہے جو باپ دادے کرتے آئے ہوں' مگر آئے دن سینما دیکھ دیکھ کر تو نوشے میاں صرف جنٹلمین بننا چاہتے تھے۔

کچھی سے لہرائے ہوئے جسم پر کفن کی طرح پتلون چڑھائے' آڑی مانگ کاڑھے' بہروپیا' سے لگتے' مارے فیشن کے جولاہا کہلانا بھی کسر شان تھا۔

آج ٹوٹی کھٹیا پر لیٹی شبراتن کو ساری اگلی پچھلی باتیں یاد آرہی تھیں۔ یادوں کے جنگل میں آگ سی لگ گئی تھی' اور وہ برادری کے خوف سے زخمی فاختہ کی مانند کانپ رہی تھی۔ اس کا جیٹھ رحمت اللہ تو جانے کیا قیامت ڈھائے گا۔ اور بھاوج جانے برادری بلوائے یا کیا کرے۔

تیز بخار کی تکلیف بھول کر وہ ڈر کے مارے مری جارہی تھی۔ اتنی پریشانی تو زندگی میں کبھی نہ اٹھانا پڑی تھی۔ جب نوشے میاں کے باپو کو ڈھائی گھڑی کی موت آئی' جب زندگی کالی رات بن کر چھا گئی' جب اچھی بی اشتیاق میاں کے ساتھ بھاگی اور نوشے کو خواجہ میراثی نے شراب پلانا سکھائی تھی۔

قیامت کا روز جزا اس کے سامنے آن پہنچا' اور وہ ایسی ڈرپوک کہ رحمت اور بھاوج

کے خوف سے شکایت کا حرف زبان پر لاتے ہوئے بھی سہمی جارہی تھی۔ وہ تو کہو زندگی بھر سوکھے ٹکڑے چباتے چباتے دانت ٹوٹے کنگھے کی طرح کبھی کے جھڑ چکے تھے' ورنہ ڈر کے مارے ضرور بج اٹھتے۔

فرش پر گھٹنوں میں منہ چھپائے بیٹھے ہوئے نوشے میاں کی پیٹھ بھی پلنگ سے چھو کر لرز رہی تھی۔ ادھر شبراتن باہر نہ نکلیں تو سورج نے اپنا منہ تھوڑی چھپا لیا۔ ذرا ہی دیر بعد جب مئی کی تیز دھوپ دھمو کو بھٹے کی طرح بھوننے لگی تو شبراتن خالہ کا انتظار دوبھر ہوگیا۔ اوپر سے لوہار نے دکان کھول کر سر پر ہتھوڑے برسانا شروع کردیئے۔

آٹا تولتے میں بھولا بنیے نے سوچا کہ شبراتن آئے تو چاول کی نئی بوریوں میں کنکروں کی آمیزش کروائے گا۔ شبراتن کو گلی میں دیکھتے ہی گڑ دھانی اور پھیکی کھلیں مانگنے والے بچے کچھ دیر ان کے کواڑ بجاتے رہے' پھر نیم تلے جا کر ڈنڈا ڈولی اور کبڈی کھیلنے میں مصروف ہوگئے۔

صبح ہی صبح جلیبیاں بیچنے والے خیرو حلوائی نے بھی شبراتن کے کواڑوں میں منہ اڑا کے کئی آوازیں لگائیں۔ رات پھر مالک مکان نے اس کا سامان نکال کے سڑک پر پھینک دیا تھا۔ دل کو تسلی کے علاوہ رتی امداد بھی اسے یہیں سے ملتی تھی۔ ڈپٹن کے ہاں بھی صبح ہی صبح کوئی مہمان آگئے اور کام کے لیے انہوں نے شبراتن کو بلوا بھیجا' مگر ان کا دروازہ تو شبراتن کے نصیبوں کی طرح بند پڑا تھا۔

دن چڑھے خواجہ میراثی کی ماں حسب عادت نامعلوم چیزوں کو گالیاں دیتی کواڑ پھینکنے نکلی تو بچوں کی پلٹن نے یہ خبر سنائی۔ پھر تو اس کی گالیوں کے بہاؤ کو ایک راستہ مل گیا۔ کوڑے کا ٹین وہیں پھینک اس نے دھڑا دھڑ کواڑ پیٹ ڈالے۔

"مت تو نہیں کٹ گئی تیری' نوشے کی ماں۔ اللہ قسم سویرے دروازہ بند دیکھ کر رحمت کے فرشتے لوٹ جاتے ہیں——" اندر جا کر دیکھا تو شبراتن کو ہینسیوں بخار چڑھا تھا۔ روتے روتے چندھی آنکھیں سوج کر بالکل ہی بند ہوگئی تھیں۔ پورا دوپٹہ ناک اور تھوک سے گیلا ہو رہا تھا۔

"رونے کی کیا بات ہے بہن۔ اللہ ایک در بند کرتا ہے' ستر در کھل جاتے ہیں۔"

خواجہ کی ماں سارا معاملہ سمجھ گئی۔ اسی کی صلاح پر تو نوشے نے ماں کے پاس زیوروں کی خوشبو سونگھی تھی۔

"تمہیں ہماری قسم اٹھ کے بیٹھ جاؤ۔" اٹھانے کے بہانے وہ شبراتن کی نبضیں ٹٹولنے لگی۔ ایسی ہی سوجن مرتے وقت اس کی ساس کے منہ پر تھی۔

"یہ حرامی محلے والے تو نہ جانے کیا اوندھی سیدھی بکتے پھر رہے ہیں کہ نوشے کسی عورت کو بھگا لایا ہے۔ جو شبراتن کے منہ چھپائے پڑی ہے۔"

ایک لمبی آہ دل میں ایک درد کی لہر جگا گئی اور بوندا باندی کرنے والی آنکھوں سے دھواں دھار آنسو گرنے لگے۔ تو گویا لوگ انتظار ہی میں بیٹھے ہیں۔!

"کہنے والے کی جوان بہنوں کو چور لے بھاگیں۔ انہیں ہیضہ ہو جائے۔" خواجہ کی ماں اپنی دانست میں ہمدردی کے پھائے رکھے چلی جارہی تھی۔

مگر ڈھائی گھڑی کی موت سے شبراتن کو بڑا ڈر لگتا تھا۔ جس دن سے اس کا میاں یوں منٹوں میں چٹ پٹ ہوا' اس نے کسی کو دل سے نہ کوسا۔ ان ہی باتوں سے تو لوگ اسے پاگل کہتے تھے۔ لوگ اس کے رونے پر اعتراض کرتے تھے' ہنسنے پر اعتراض کرتے۔ اس کے ٹھوکر کھانے پر اعتراض کرتے اور بچ بچ کر چلنے پر بھی' مگر اس کے باوجود کسی نے اسے پاگل خانے نہ پہنچایا اور وہ کوا ہکنی بنی کبھی ادھر دوڑتی' کبھی ادھر۔

وہ ہر وقت کھانستا' چھینکتا' مرجھلا انسان ہی تھا جو اپنے خاندان کی ہر فکر اپنے اوپر لادے رہتا۔ ہونٹ لٹکائے' اونٹ کی طرح کوبڑ نکالے دن رات گھلا کرتا۔ جس دن وہ مرا' تب شبراتن نے جانا کہ وہ جی بھر کے مارنے کے بعد سارے گھر سے چھپا کے دودھ جلیبیاں کھلانے والا میاں ہی نہیں' بلکہ ایک چھپر تھا جس کے نیچے بیٹھی شراتن دنیا کی ہر بلا سے محفوظ تھی۔

بچپن ہی سے لوگوں کے ہاں برتن دھونے اور نھوں کو کھلانے کی نوکریاں کیں' اوپر سے سوتیلی ماں وہ چار چوٹ کی مار اور تابڑ توڑ فاقے دیتی تھی کہ زندگی کانٹوں بھری جھاڑی لگتی۔ جتنا نکلنے کی کوشش کرو اتنی ہی الجھتی جاتی۔ کبھی بھولے بھٹکے ہمجولیوں سے شکایت کرنے بیٹھی تو باپ نے بھی وہ مار دی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

مگر بیاہ ہوتے ہی سکھ کا سورج نکل آیا۔ یہاں میکے والے فاقے تھے نہ ہر وقت کی ہیا۔ آنگن میں تین تین کرگھے چلتے تھے۔ نوشے کے باپو گھر کے علاوہ دکان پر بھی بیٹھتے تھے۔ کیا کرتے کنبہ ہی اتنا بڑا تھا۔

رحمت اللہ نے کبھی کام نہ کیا تو اب چھوٹے بھائی کی موجودگی میں کیوں ہاتھ ہلاتا!

ساری نکٹی چپٹی بہنوں کو سونے چاندی میں لپٹا کر اسی کو نپٹانا پڑا۔ تب کہیں اس کے بیاہ کی باری آئی۔

ناک میں بلاق، گلے میں ہنسلی اور پاؤں میں چاندی کے جھانجھن پہنے وہ ہر وقت آنگن میں چھم چھم کرتی پھرتی، مگر جیٹھ جٹھانی کی لاج سے دو ہاتھ لمبا گھونگٹ ہر وقت منہ پر لہرایا کرتا تھا۔ چاہے گائے دوہ رہی ہو، باجرے کی روٹی پکائے یا نوشے کو دودھ پلائے۔ یوں جٹھانی کو بھی اس سے کیا بیر تھا، مگر یہ بھی نہ چاہتی تھی کہ پیر کی جوتی سر پہ چڑھ جائے۔ سو وہ ہر وقت دیور کے کان بھرا کرتی۔

"تمہاری بہو تو اچھی بی کو ایسا مارتی ہے کہ اللہ توبہ۔ ہمارا خون ہے، ہم سے تو نہ دیکھا جائے گا۔ بھیا تم اپنا گھر الگ کرلو۔" وہ جانتی تھی کہ رمضانی کو الگ گھر کرنے سے کتنی نفرت ہے۔ خیر کبھی کبھار دو چار مکے اور لاتیں کھانا بھی اللہ میاں نے ہر بیوی پر فرض کیا ہے، مگر پاس پڑوس کی عورتیں یہی کہتیں۔ "بس مرد کے کان ہوتے ہیں، آنکھیں نہیں ہوتیں۔"

مگر شبراتن اسے کچھ سمجھانے جاتی تو دن بھر کی کوفت کا بدلہ وہ مار پیٹ سے لینے لگا۔ وہ جو کچھ کماتا بھابھی کی گود میں ڈال دیتا تھا۔ کیا مجال جو بڑے بھائی کی موجودگی میں اس دالان کی طرف دیکھے جدھر شبراتن بیٹھی ہو۔ کبھی نوشے یا اچھی بی کو سب کے سامنے پیار نہ کیا۔ ایک بار مرنے والا نوچندی کے میلے سے اس کے لیے مسی لے آیا تو اس کی جٹھانی نے سارے محلے میں وہ پڑیا نچائی: "قیامتی وقت آگیا ہے، اتنی بے حیائی کہ بیوی کے لیے چھپ چھپ کر چیزیں آتی ہیں۔"

اس کے بعد ہزار بار رمضانی نے قسمیں دے دے کر اس کی فرمائش پوچھی۔ مگر وہ خوف کے مارے نہ بتا سکی۔ لوگ ہزاروں عیب کرتے پھرتے ہیں، مگر یوں تالیاں کسی کے پیچھے نہیں بجا کرتیں۔

بعض اوقات چھوٹی دیورانی کو اس پر ترس آتا۔

"تمہیں تو لوگوں نے پاگل بنا دیا ہے۔ بھابھی۔ اپنا اگلا پچھلا کیوں نہیں سوچتیں---؟"

اپنا اگلا پچھلا تو اس دن سوچنا پڑا، جب دو چار ابکائیوں کے بعد سب کا کھیون ہار منہ بسور کے رہ گیا۔ ابھی جنازہ بھی نہ اٹھنے پایا تھا کہ اس کی جٹھانی حاضرین کے سامنے گھر کا

سامان بانٹنے بیٹھ گئی۔ رحمت اللہ نے کفن نکالنے کے بہانے اس کی جیب سے دکان کی کنجیاں نکال لیں۔ اس کی بھاوج ہر عورت سے شبراتن کی بپتا کہتی پھر رہی تھی:۔

"میں تو اپنے سینے سے لگا کے رکھتی' مگر شریف عورت کی تو ڈولی جا کر سسرال سے ڈولا ہی نکلا کرتا ہے۔" آخر اپنے بچوں کی یتیمی پر خوش ہونے والوں سے وہ لڑ پڑی:۔

"اللہ نہ کرے جو میرے بچے بے آسرا ہوں۔ جب تک میں زندہ ہوں انہیں کوئی یتیم نہ کہے۔"

گویا اپنے عزیزوں کی مدد لینا اسے پسند ہی نہ تھا' تو یہاں کسی کی دولت کو دھکے لگ رہے تھے۔ رحمت اللہ کو تو یہ بات سن کر اتنا دکھ ہوا کہ اپنی بیوی کو لے کر دوسرے گھر میں اٹھ گیا۔ دیورانی کو پہلے ہی ساجھے کی ہنڈیا پسند نہ تھی۔ چاروں طرف کی لعنت پھٹکار میں وہ میاں کا غم بھول گئی۔

کر کے پچھتانا اس کی قسمت میں لکھا تھا۔ سو وہ گنہگاروں کی طرح ندامت لادے سہمی سہمی گئی اور رحمت اللہ کے قدموں میں دوپٹہ ڈال دیا۔

"ہماری دکان کی تو ذرا سی آمدنی ہے۔" اس کی جٹھانی نے خواہ مخواہ آس دلانا اچھا نہ سمجھا۔

"کیوں نہیں جی۔ ہمارے باپ دادے کی اولاد ہیں۔" اس کے جیٹھ نے اپنی ذمہ داری محسوس کی۔

"خبردار جو تم نے کبھی بچوں کو بھوکا رکھا یا برا سلوک کیا۔"

چلو بنے نے گڑ نہ دیا گڑ کی سی بات تو کی۔ اس دن سے اس کا چھوٹا دیور ہر آٹھویں دن بڑی باقاعدگی سے آکر ان پیسوں کا حساب لینے لگا۔ جو وہ چکی پیس کر اور سوت کات کر اکٹھے کرتی تھی۔ اس کی چھوٹی بھاوج ہر روز کچھ نہ کچھ ادھار مانگ کر لے جاتی۔ بڑا بھائی ہر روز جب تک اس کی خیریت نہ پوچھ لیتا روٹی نہ کھاتا۔ آندھی جائے' مینہ آئے' وہ ہر روز شام کو سوپ کی چھتری سر پر رکھے آتا' پھر بیوی کی دوا کے لیے یا سائیکل کا ٹائر بدلوانے کے لیے دو چار آنے ادھار مانگ کر جیب میں ڈالتا ہوا چلا جاتا۔

رات رات بھر مٹی کے دیئے سے آنکھیں پھوڑیں۔ تب کہیں نوشے میاں آٹھویں جماعت میں آپائے۔ مگر ایک دن دیور نے بھر مٹھی فیس دیتے دیکھ لیا تو لاکھوں سنائیں۔

"ہمارے خاندان میں کسی نے پڑھا ہے جو یہ نواب زادے پڑھیں گے۔ ڈوب مرنے

کی بات ہے کہ ہماری بھاوج سلائی کرکے جی رہی ہے۔"

اس نے بھی سوچا کہ ڈپٹن کے اشتیاق میاں کو دیکھ لو۔ بی۔ اے، ایم‘ اے۔ ایم‘ جانے کیا کیا منوں ڈگریاں علی گڑھ سے اکٹھی کرکے لائے ہیں۔ مگر دن رات گھر میں پڑے کتابیں پڑھے جاتے ہیں۔

اگلے دن سے نوشے میاں اسکول جانے کی بجائے خیراتی کی دکان پر سائیکلوں میں ہوا بھرنے لگے۔ دو مہینے بھی چین سے نہ گزرنے پائے تھے کہ کسی نے جاکر رحمت اللہ سے لگائی:۔

"تجھے شرم نہ آئی ہماری موجودگی میں نوشے کو نوکری کرواتے۔ ہائے قیامت کے دن اپنے بھائی کو کیا منہ دکھاؤ گا۔۔۔؟"

پھر وہ نوشے کو اپنی دکان پر لے گئے تاکہ آٹا دال تولنے کے بہانے کچھ سیکھ جائے۔ یہی عمر تو سیکھنے سمجھنے کی ہوتی ہے۔ دن بھر دکان میں بیٹھنے والے خواجہ میراثی نے نوشے میاں کو اپنا شاگرد بنا لیا۔ مدت سے بمبئی جاکر دھندا کرنے کی آرزو پھر جاگ اٹھی۔ اس نے نوشے کو فلمی ہیرو بننے پر پکا کرلیا۔ مگر ہیرو بننے کے لیے تو انسان کو ہر فن میں طاق ہونا چاہیے۔ سو نوشے میاں اس پریکٹس میں نہ جانے محلے کی کتنی لڑکیوں کے باپوں سے پٹ چکے تھے۔ آئے دن حوالات کے چکر کاٹنا ہوتے۔ ادھر پولیس کو اللہ واسطے کا بیر ہوگیا تھا کہ شہر میں کہیں چوری ہو جائے مگر شبراتن کے گھر کی تلاشی لی جاتی۔

اچھی بی کا خیال نہ ہوتا تو یہ سب دیکھنے کے لیے وہ زندہ ہی کیوں رہتی۔ مرنے والا تو بس لڑکیوں پر جان دیتا تھا۔ اچھی بی پیدا ہوئی تو یوں لگا جیسے گھر میں چراغ جل اٹھا ہو۔

"آج لوگ اچھی بی کی خوبصورتی کو جلتا چراغ کہتے ہیں‘ انہیں کیا معلوم اس شمع کو بچانے کے لیے اس کے نے کتنی آندھیوں‘ کتنے طوفانوں سے مقابلہ کیا۔ پندرہ برس کی اس زندگی کا ایک ایک لمحہ وہ سکہ تھا جس سے اچھی بی کی قیمت ادا کی تھی۔ اس طویل عرصے کی یہ کھائیاں‘ مہینوں گھنٹوں اور منٹوں سے پاٹی تھیں۔ ویسے ہی کون سی فکریں کم تھیں جو اچھی بی کی جوانی مصیبت کے نئے پہاڑ لے آئی۔ اچھی بی کے متعلق رائے عامہ بہت ہی خراب تھی۔ کرتے کا ہاتھ پکڑ لو‘ مگر کہتے کی زبان شبراتن کیسے پکڑتی۔۔۔؟

وہ تو ہے ہی ہمیشہ کی دیدہ پھٹی۔ تیرہ برس کی جوان کنواری محلے کے لڑکوں کے ساتھ پتنگ بازی کررہی ہے۔ گولیاں کھیل رہی ہے۔ نوشے کے دوستوں سے کبڈی ہورہی ہے۔

جو شبراتن سے کہنے جاؤ تو اپنی بیٹی کی یتیمی کا دکھڑا لے بیٹھتیں۔

ایک دن کھیل کھیل میں اشتیاق نے ڈانٹا تو کتیا کی طرح ان کی کلائی سے لپٹ گئی۔ پھر ڈپٹن نے سارا محلّہ سر پر اٹھا لیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اشتیاق میاں نے خود ہی معاملہ دبا دیا۔ مگر نوشے نے اسے اتنا مارا کہ دروازے سے باہر نہ جاسکتی تھی۔ لیکن اچھی بی کی حرکتوں پر کہاں تک طرح دی جاتی!

دن بھر محلے کے ہر لڑکے سے جوتم بیزار ہوتی یا چھت پر چڑھی پتنگیں لوٹ رہی ہے۔

اشتیاق میاں چھت پر پڑھنے بیٹھے ہوں تو ان کا منہ چڑا رہی ہے۔

پھر ایک دن محلے والے باقاعدہ وفد بنا کر شبراتن خالہ کے پاس گئے۔

"اپنی لڑکی کو روکو نوشے کی ماں۔"

مگر شبراتن کو اپنی لڑکی کی وہ کل ہی نہ ملتی تھی جسے دائیں بائیں گھمانے سے لڑکیوں کو روکا جاتا ہے۔ ضرور اچھی بی میں کسی کل کی کمی رہ گئی تھی۔ یوں وہ دن رات شبراتن کو جلانے کی ترکیبیں بھی نہ سوچتی۔ بلکہ شبراتن نصیبوں جلی کو تو کبھی ایسا موقعہ ہی نہ ملتا جب مائیں کئی کئی گھنٹے لڑکیوں کو چیخ چلا کے جی خوش کرتی ہیں۔

گھر ہمیشہ لپا پتا' کھانا ہمیشہ وقت سے پہلے تیار' سبق سنو تو فر فر یاد' سینے پرونے میں تو محلے کی ہر سگھڑ لڑکی کو کئی بار مات دے چکی تھی۔ سوئیٹر کا جو نیا نمونہ دیکھا جھٹ سیکھ لیا۔ محلے کی کون سی بیوی تھی جس نے اچھی بی کے ہاتھ کا کڑھا دوپٹہ نہ اوڑھا ہو' کون سا مرد تھا جس کے تکیے پر اس نے For get me not نہ کاڑھا ہو۔ کبھی شبراتن کپڑوں کی سلائی کے لیے پڑوس میں چلی جاتی تو لوگ انگلیاں اٹھاتے:۔

"جوان لونڈیا کو اکیلا کیوں چھوڑ دیتی ہو؟"

"اوئی مت کٹ گئی ہے تیری شبراتن بوا' سیانی لڑکی کو گھر گھر لیے پھرتی ہے۔"

اچھی بی کی خوبصورتی سے سب ہی شریف بیبیاں گھبراتی تھیں۔

"آج کل تو بس پڑھی لکھی لڑکیوں کی مانگ ہے۔" ڈپٹن نے اسے نیک مشورہ دیا۔

جہاں ہزار خرچ وہاں یہ بھی سہی۔ وہ رات کو دو گھنٹے جاگ کر پاپڑ بیلنے لگی۔ آٹھ آنے مہینہ دے کر اچھی بی کو میونسپلٹی کے اسکول بھیجنا شروع کیا تو ایک سال میں دو جماعتیں پھلانگتی وہ ساری ہم جماعت لڑکیوں سے آگے نکل گئی۔

"حرافہ ہے۔۔" دوسری مائیں دیکھ کر جلتیں۔ "صورت پر دیکھو کیسے ٹھیکرے برسنے لگے ہیں۔"

"ایک دن رحمت اللہ نے اسکول کی لاری میں کسی لڑکی کو ہنستے سن لیا تو آکر خوب شور مچایا۔ "جانتی ہو مسلمانوں کی عورتوں کو پڑھانا سخت کفر ہے' قیامت کے دن اس شخص کو اسی درے لگیں گے جو۔۔۔"

"کون سے شہزادے کا انتظار ہے۔ اس کا بیاہ کیوں نہیں کرتیں۔" جٹھانی نے یوں کہا جیسے شبراتن کو اس بات کی فکر ہی نہ ہو۔

اپنی چوڑیاں' ہنسلی اور بچھوے اچھی بی کے وقت پر نکالنے کو ہی زمین میں گاڑے تھے' مگر زمین کے نیچے کا حال لوگ کیا جانیں۔ اچھی بی کے چہرے پر تو یتیمی کا سائن بورڈ لٹک رہا تھا۔ باری باری وہ اپنے سارے کرتا دھرتاؤں کے پاس گئی' مگر وہاں خود ہی سب اپنی لڑکیوں کو ترکاری کی طرح سامنے ڈالے گاہکوں کا انتظار کررہے تھے۔ "اللہ سے کہو' وہی سب کی بنائے گا۔"

ابھی زیارت جاتے ہوئے پورے گیارہ دن بھی نہ ہوئے تھے کہ نہ جانے کس فرشتے نے اللہ میاں تک غلط سلط رپورٹ کر ڈالی۔

بھئی اللہ میاں کی مرضی بغیر تو ڈپٹن بھی چوں نیں کر پاتیں' پھر اچھی بی نے یہ مرحلہ کیسے طے کر ڈالا۔۔۔؟

یہ سب کیسے ہوا ___ شبراتن کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔ اور تو اور خیرو کی دکان پر بیٹھنے والے چھوٹے پہلوان اور خواجہ میراثی بھی سن کر سکتے میں آگئے۔

صرف افن تھی جو قسمیں کھا کے بتاتی تھی کہ اچھی بی نے اسے تین دن پہلے ہی بتا دیا تھا' مگر ایسی ناممکن شرط رکھی تھی کہ وہ کسی سے نہ کہہ سکی۔

اس کی ساری سیلیاں اپنے جھوٹے سچے رومانس سنا کر اچھی بی سے مشورے لیا کرتی تھیں' مگر وہ ایسی چالاک کہ کبھی اپنا راز کسی پر ظاہر نہ کیا۔

پھر ایک دن وہ کلاس سے باہر نکلی تو دوپٹہ سر پہ ڈال کے سنایا۔

"افن پیاری' اب میرا بیاہ ہو رہا ہے۔"

"اے ہے۔۔۔" افن کو یوں لگا جیسے کسی نے اچانک گھڑا بھر ٹھنڈا پانی اس پر انڈیل دیا ہو۔ کچھ ہو بھئی یوں مردوں کی طرح اپنا نام لیتے تو آج تک کسی کو نہ سنا تھا۔

"کس کے ساتھ---؟" افن پوچھتے ہوئے بھی شرمائی جا رہی تھی--

"اشتیاق کے ساتھ---" اس نے آنکھیں بند کر کے بڑے سرور سے کہا اور افن کا ہاتھ پکڑ کے کھٹے اناروں کی طرف لے گئی۔ افن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ ایم۔ اے پاس نکھٹو سہی، مگر ڈپٹن کا لڑکا ہے۔ شبراتن تو ان کے ہاں روٹی پکاتی ہے۔

"وہ تو نوکر ہی نہیں ہے۔" افن نے ترس کھانے کے انداز میں جل کر کہا۔

"مگر میں نوکری سے تھوڑا بیاہ کروں گی۔"

"تو ڈپٹن راضی ہو جائیں گی!"

"کیا ان کے بغیر نکاح نہ ہو گا---؟" دل ہی دل میں یہ خبر سارے محلے میں بانٹنے کے منصوبے بناتی افن جانے لگی۔

"تم نے لیلیٰ مجنوں کا قصہ پڑھا ہے افن---؟"

"نہیں تو---" افن جان بوجھ کر جھوٹ بولی۔ بچاری اپنے آپ کو بہت بنتی ہیں۔ جیسے جانتی ہی نہیں کہ وہ قصہ پڑھ کر ہی تو افن لیلیٰ سے زیادہ ستم سہ رہی ہے۔

"خیر لیلیٰ بھی تمہاری طرح تھی' اس لیے میں لیلیٰ بننا نہیں چاہتی۔"

"ہوش میں رہو" اچانک افن بگڑ بیٹھی۔ "بڑی بچاری ناولیں پڑھ پڑھ کر میری مثال دینے چلی ہیں' جو اماں سن لیں تو---؟"

"تو کیا ہو گا---!" آج اچھی بی کی ہر کل بگڑی ہوئی تھی۔

"ٹھہرو---" اس نے افن کا راستہ روک لیا۔ "پرسوں تک یہ بات کسی نہ کہنا۔"

افن سوچنے لگی یہ کیسے ممکن ہے۔

"یاد رکھو' اگر کسی کے کان میں بھنک پڑی تو تمہیں بھی نہ چھوڑوں گی۔"

افن کو یوں لگا جیسے اس کی جان اچھی بی کی مٹھی میں چلی گئی ہو۔ دونوں جہان ہارے انسان کی طرح وہ گھر کی جانب بڑھی۔

وہ دن اور آج کا دن' ڈپٹن نے شہروں شہروں کے وکیل کیے' نوشے کو گرفتار کروا دیا۔ اپنے لڑکے پر چوری کا الزام لگائے اور اغوا کے بھی۔ مگر سنا ہے اچھی بی الہ آباد میں ٹھاٹ کر رہی ہے۔ اس کے بچوں کے لیے اشتیاق نے آیائیں رکھیں ہیں اور شبراتن کے زیور منہ چھپائے زمین کے نیچے دبے رہے۔ شبراتن نے چاہا کہ وہ بھی گڑھا کھود کر زیوروں کی طرح دفن ہو جائے مگر موت کے فرشتے بھی شاید اس کی بکواس کو ہنس کے ٹال جایا

کرتے تھے۔

کوئی پوچھے کہ بھیا بیاہ کرنا تھا سو کسی طرح ہوگیا۔ شبراتن دکھیا کیا کرے۔

مگر برادری اس کی بد نصیبی پر نوحہ خوانی کیسے نہ کرتی۔ ایک بار گھر میں ایسا کہرام مچا کہ اچھی بی کی موت بھی اتنے دھوم دھڑکے سے نہ ہوتی۔ ٹوٹی جوتیاں گھسیٹتی وہ اپنے بھائیوں اور دیوروں کے پاس یوں معافی مانگتی پھری جیسے اشتیاق میاں کے ساتھ وہی بھاگی تھی۔ الہ آباد سے منگا کر اچھی بی کا نکاح نامہ بھی دکھا دیا مگر رحمت اللہ کے نزدیک تو یہ نکاح ہوا ہی نہیں جب تک وہ اجازت نہ دیتا۔

برادری اچھوتوں کی طرح اس کے سایے سے بچنے لگی۔

شبراتن نے آئندہ ہر کام برادری کی مرضی پر کرنے کی شرط منظور کرلی۔ نوشے میاں پانی پئیں گے تو بڑوں کی مرضی سے۔ اس کے دیور نے نوشے کو تجارت کا مشورہ دیا' اس نے منظور کرلیا۔ اس کے جیٹھ نے بھولا بننے سے شبراتن کی ضمانت پر دو سو روپے قرض لیے' شبراتن نے دلوا دیے۔ بلاقی نے گھر کی چیزیں بیچ کر شراب پینے کی لت اپنے بھتیجے کو لگائی مگر وہ بیچ میں بولنے والی کون——!

بلاقی اکثر نوشے کی حرکتوں پر افسوس کا اظہار کرتا:

"اللہ قسم بھابی رات وہ جوئے میں دس روپے ہار گیا۔"

"جیتنے والا کون تھا——؟"

"تم سمجھتی ہو میں اسے لوٹتا ہوں۔" حقہ چھوڑ کے وہ اٹھ بیٹھا۔

"پھر کبھی میرا نام لیا تو برادری سے باہر کروا دوں گا۔ ہاں نا تو———"

سہم کر وہ خاموش ہو جاتی۔

"دنیا کی عورتیں بیوہ ہوتی ہیں' مگر یوں کوئی نہیں سٹھیا جاتی۔" اس کی جٹھانی اپنی پڑوسنوں کو سناتی۔

"اور کیا۔ جو دنیا کے خلاف چلے گا یوں ہی ٹھوکر کھا کے گرے گا۔"

وہ کپڑے کی گڑیا تھی' جسے کھیلنے والے بچے جس پہلو چاہتے بٹھا دیتے' جب چاہتے اٹھا کر پھینک دیتے۔

ایسے ہی کسی وقت جب وہ اچھی بی کی جان کو رو رہی تھی کہ کہیں خواجہ کی ماں نے سن لیا۔

شبراتن ڈھیروں زیور گاڑے بیٹھی ہے۔ دوسرے دن نوشے میاں کو تین سو روپے کی اتنی سخت ضرورت آپڑی جس کے بغیر ان کی جان نکلی جارہی تھی۔ وہ چھت کی ٹوٹی منڈیر پر جا بیٹھے۔ ”دیتی ہے تین سو روپے کہ میں گر کر مرجاؤں۔“

یہ آگ لگے زیور اس۔ اپنے کفن کے لیے تھوڑی گاڑے تھے جو نوشے کو مرنے دیتی۔ کھانے کمانے کو دکان ہی بہت ہے۔

مگر دکان کے ساتھ زیور بھی رات کو جواریوں کے سپرد کرکے وہ نشے میں دھت گھر میں آکر لیٹ گیا--- رات سے وہ مرنے کی ہزاروں ترکیبوں پر غور کرچکی تھی۔

مکار تھا یہ مؤا نوشے--- ٹوٹی منڈیر پر چڑھ کر اس نے سوچا۔ یہاں سے گر کے تو کسی کو چٹکی بھر موت بھی نہ آئے گی۔

رات بھر وہ پلنگ پر لیٹی تھر تھر کانپے گئی۔ صبح ہوتے ہی سوال جواب کرنے والے منکر نکیر آموجود ہوں گے--- وہی ہوا۔ خواجہ کی ماں جا بھی نہ پائی تھی کہ رحمت کے فرشتے آنے شروع ہوگئے۔

”لو' ہم سے چھپا کے خزانے گاڑے بیٹھی تھی۔ اچھا ہوا حق داروں کا حق بھی کسی کو راس آیا ہے۔“

اس کی جٹھانی حسب معمول اپنی حق تلفی پر آنسو بہانے لگی۔

”اس کی ماں نے لاڈ پیار میں بڑھایا ہی نہیں ورنہ لڑکا یوں ہاتھ سے نہ جاتا۔“

رحمت اللہ اس صدمہ جانکاہ سے نڈھال' سر پکڑے' چھپر تلے جا بیٹھا۔

”ہونہہ--- ہم سے مقابلہ کرنے چلے تھے' دکان ہی لٹوا بیٹھے۔“ خواجہ مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔ نوشے صبح سے ماں کی پٹی سے لگا گھٹنوں میں منہ چھپائے یوں بیٹھا جیسے کانوں میں تیل ڈال لیا ہو۔

”سارا کیا دھرا بھابھی کا ہے۔ بھیا یہ اب ہم سے نا بھری جائے گی۔“ اس کی دیورانی نے مزید کلیاں پھندنے ٹانکنے چاہے۔“

”ہاں جی اب برادری کو بلائے بغیر کام نہ چلے گا۔“ بلاقی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”ہائے میری ماں--- اچانک نوشے میاں نے مرثیے کا پہلا مصرعہ اپنی اونچی آواز میں بلند کیا' اور سب لپک کر شبراتن پر ٹوٹ پڑے۔ ایک دم کئی درجن ہاتھوں نے مل کر

اس کی نبض ڈھونڈی۔ دھپا دھپ دحمو کے دل کی حالت دیکھی گئی۔

اس کی جٹھانی اپنی اولیں محبت کا ثبوت دینے کی خاطر دوڑی گئی اور آنگن میں سے مٹھی بھر خاک اٹھا کر سر میں جھونک لی۔ دو چار عورتوں نے اس کی دیکھا دیکھی مرثیے کا دوسرا مصرعہ با جماعت پڑھا۔ محلے والیاں ابھی سر میں سر ملا کر تیار ہی ہو رہی تھیں کہ بلاقی نے دانت پیس کر کہا:-

"نہ جانے اپنی حماقت سے کیا کر بیٹھی ہے۔"

"آخر ہوا کیا---!>

مجھے تو اختلاج لگتا ہے۔ شربت انار پلاؤ۔"

بلاقی کی بیوی جو شبراتن کی اچھائیوں کو زور زور سے یاد دلا کر رونے والیوں کی رہبری کرنا چاہتی تھی، مایوسی کے ساتھ چپ ہو گئی۔ اس کی موت پر آنسو بہانا بھی حماقت ہے۔ اس نے جھنجلا کر سوچا۔

"جی نہیں صرف کمزوری ہے۔ معلوم ہوتا ہے رات سے روٹی نہیں کھائی۔"

"اے واہ۔ اچھے چلے نیم حکیم۔ ارے میاں کئی دن سے اٹھتے بیٹھتے ٹانگیں پکڑتی تھیں۔ گٹھیا ہے گٹھیا۔ اور گٹھیا کی میرے پاس ایک آزمودہ دوا ہے۔ ذرا نوشے میاں ایک روپیہ دینا ابھی لایا۔" بلاقی لپائیں جھپائیں جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

"اگر شبراتن خالہ کو تپ دق نہ ہو تو میرا نام خواجہ مت رکھنا۔" خواجہ خم ٹھونک کر سامنے آیا۔

"آج کل تو اسی مرض کی وبا پھیلی ہے۔"

"تم مجھے دو روپے دو نوشے میاں، میں ابھی ہارٹ فیل کی دوا لاتا ہوں۔ انھیں تو عین مین وہی مرض ہے۔"

"میری مانو تو اب یٰسین شریف پڑھو۔" اس کی جٹھانی اب اس قصے کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ مارنا تو روز روز کی کائیں کائیں۔

دماغ کے کھنڈروں میں خوف ناک لڑائیاں لڑی جا رہی تھیں---وہ لکڑی میں پھنسا ہوا آرا تھا، جسے کبھی ادھر کھینچا جاتا کبھی ادھر۔

اچانک برادری کے پنچوں نے اسے گھیر لیا۔ چیخ مار کر وہ بھاگی تو حشر کے میدان میں جا نکلی۔ اس کے آگے پیچھے چلنے والے فرشتے دیدے نکال نکال کر ڈرانے لگے۔

"اگر ہمارے خلاف خدا سے کچھ کہا تو--- ہاں یاد رکھنا۔" انھوں نے اپنے بند مکوں کی دھمکی دی۔

سہم کر شبراتن نے آنکھیں کھول دیں۔

"کیا ہوا---! کیا تکلیف ہے تمھیں---؟" سب نے چیخ چیخ کر اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"جو پنچ کہیں---جو تم کہو---"

دونوں ہاتھ جوڑ کے وہ خوف سے کانپنے لگا۔

اس کا دل پانی کی گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

○
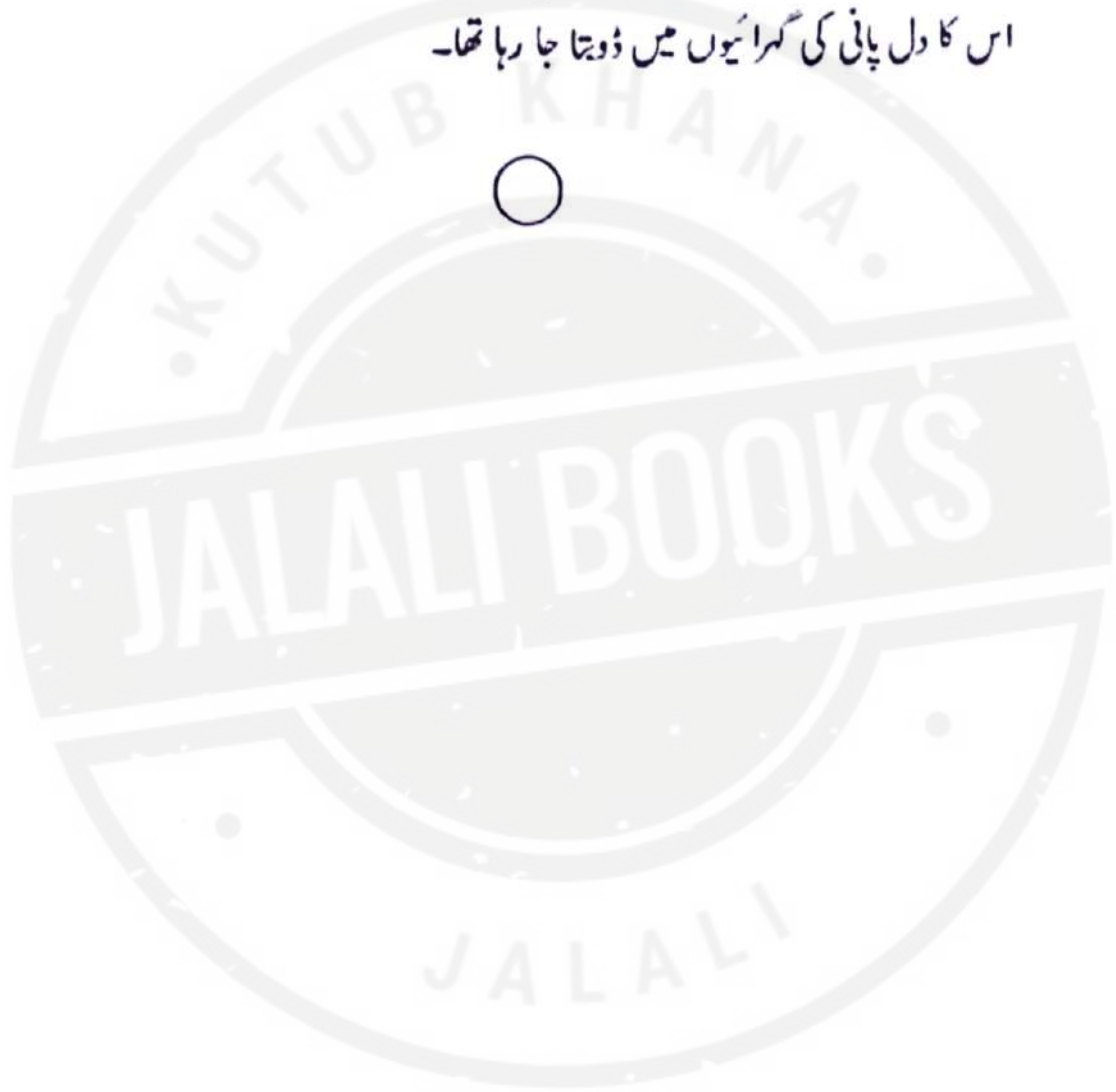
فصل گل جو یاد آئی

(Monologue)

اے لو چھوٹی بجیا' پورب کی طرف سے پھر کالی گھٹا اٹھی۔

بادل پھر زور سے گرجے اور ہوا کی ٹھنڈی نمی میرے گرم گالوں کو چھو گئی۔

الٰہی خیر--- آج پھر چھاجوں مینہ برسے گا۔ آج پھر بادل زور سے گرجیں گے۔ جیسے کوئی نئے کپڑے پھاڑ پھاڑ کے پھینک رہا ہو۔ بادل ہمیں تاک تاک کے پھوار کی پچکاریاں چھوڑیں گے۔

"ہائے اللہ! مجھے تو بڑی گدگدی ہوتی ہے چھوٹی بجیا۔ سچ مچ' بھئی مینہ کو دیکھ کر کیسے کیسے بے ہودہ سے خیال آتے ہیں!

کبھی ہم سب لڑکیاں ایسی جیسوں جیسوں پھوار سے بھیگتی آنگن میں دوڑتی پھرتی تھیں۔ تم چاہے کچھ کہو۔ مگر یہ ٹھنڈی بوندیں میرے جسم پر پڑتیں تو یوں لگتا جیسے کوئی شرارت سے برف کی ڈلیاں اچھال رہا ہے۔ یوں ہی ہمیں کام لگ جایا کرتا تھا۔ جیسے ڈھیروں کام آنگن میں پڑا ہے۔ جیسے گھر کا سارا سامان بس انگنائی میں پڑا ہے' جس کی اٹھا دھری کیے بغیر اندر جا بھی نہ سکیں گے۔ خالہ جان اور اماں بادل دیکھتے ہی اندر جا کر دلائیاں اور مرزائیاں ڈھونڈنے لگتیں تو ہم سب باہر نکل آتے۔

"اے خالہ جان' ننھے کی چھالیاں اور کرتے تو یہیں پڑے رہ گئے۔"

"اوئی ممانی بیگم یہ پلنگ اٹھوائیے ورنہ بھیگ جائے گا۔"

"ادھر مینہ کو زور پکڑتا دیکھ کر اماں دالان سے چلائے جاتیں۔ ہمیں بھیگتا دیکھ کر کوسنے دیتیں۔ مگر ہم یوں ہی مظلوم بنے آنگن میں دوڑتے پھرتے۔ جانو اپنی چلتی تو ذرا بھی بھیگنے سے گھبراتے ہوں' مگر بھیگتا ہوا سامان بھی کیسے باہر چھوڑ دیں۔

یوں ہی جیسے کہنی کی چوٹ پر کبھی ہنسی آتی ہے' کبھی رونا۔ جی جان سے رنگے ہوئے دوپٹے کی دھنک کا رنگ چھٹ کر جسم کو لگ جاتا تھا۔ بھیگے دوپٹے کو نچوڑتے وقت جی چاہتا کسی سے خوب لڑیں۔

جانے کیا بات ہے چھوٹی بجیا' جب بادل گھر گھر کے آتے ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے یادوں کا مینہ برس رہا ہے۔

میں گھنٹوں دالان میں کھڑی ابھرتے مٹتے حبابوں میں جانے کیا کرتی ہوں۔ جب بادل

گرجتے ہیں تو تمہیں یوں نہیں لگتا جیسے ہمارے دل میں بھی ایسی ہی چکا چوند ہوگئی ہے۔ اسی لمحہ کی روشنی میں کیا کیا نظر نہیں آتا۔۔۔!

ایک بار ایسی ہی برکھا رت تھی۔ ہم سب بیچ والے کمرے میں بیٹھے کھبے ماموں سے بادشاہ کی کہانی سن رہے تھے۔ تم نے تو وہ کہانی سنی ہوگی؟ جس میں ایک بادشاہ نے ایک درویش سے ایک مراد مانگی تھی اور درویش نے دعا دی کہ صبح اٹھ کر بادساہ جس چیز کو چھوئے گا وہ سونا ہو جائے گی۔ بادشاہ نے صبح اٹھ کر سب سے پہلے تو اپنے بستر کو چھوا جو سونا بن گیا۔ پھر کپڑے چھوئے اور آخر میں اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کو پیار کیا' جس کے لیے وہ سونے کا محل بنوانا چاہتا تھا۔ پھر وہ لڑکی بھی سونا بن گئی۔

چھوٹی بجیا' میرا تو سمجھو دل بند ہوگیا۔ کھبے ماموں نے سنایا تھا کہ اس لڑکی کو ایک شاعر چاہتا تھا اور شاعر۔ کہتا تھا: جس رات وہ لڑکی چھت پر نظر نہ آئی وہ مر جائے گا۔

اس رات مجھے بالکل نیند نہ آئی۔ بار بار یوں لگتا جیسے موسلادھار مینہ میں ایک آدمی چھت کے نیچے کھڑا ہے۔ جیسے یہ بجلی کی چمک نہیں' شاعر کے ہاتھ کا چراغ ہے۔ جسے تھامے وہ زمین و آسمان پر اس لڑکی کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔

دوسرے دن ہم سب چھوٹی .فیہ کی منڈیروں پر بیٹھے جامنیں کھا رہے تھے تو میں نے اسلم بھائی کو یہ کہانی سنائی تھی۔ کچھ دیر تو جامنیں ہاتھ میں پکڑے وہ سوچتے رہے' شاید وہ بھی میری طرح شاعر کی مصیبت کا حل ڈھونڈ رہے ہوں۔ بڑی دیر تک ہم دونوں گم سم بیٹھے رہے۔

ہمارے سروں پر پھیلے ہوئے پیڑ سے پٹا پٹ جامنوں کا مینہ برس رہا تھا اور راحت اپیا سب کو لے کر امروں میں جھولے ڈال رہی تھیں۔

پھر اسلم بھائی میرے خوف پر زور سے ہنسے تھے اور منڈیر پھلانگتے ہوئے کہا:

"بھگوان کی مورتی بھی سونے کی ہوتی ہے۔ بس شاعر اس کی پوجا کرے گا۔"

اور میں سہم گئی۔ جانے کیوں چھوٹی بجیا' میرا دل دوسروں کی ذرا ذرا سی باتوں پر کڑھتا ہے۔ بھگوان کے داس کا انتظار تو رشی منی کرسکتے ہیں۔ کیا شاعروں کے دل میں بھی اتنا صبر ہوتا ہے۔

تم میرے پاس آجاؤ بجیا' برسات کی راتوں میں بھی کبھی نیند آتی ہے۔

جب وہ گاؤں چلے جائیں اور منی سو رہی ہو تو میں رات بھر جاگتی ہوں۔ منی جو

اکیلی ہوتی ہے۔

یوں خیال آتا ہے جیسے گھر میں بہت سے چور گھس آئے ہیں اور میرے زیوروں کا وہ کالا صندوق نکالے لیے جارہے ہیں جو میری ساس نے اندر والی کوٹھڑی میں گاڑ رکھا ہے۔

زور سے کہنے کی بات نہیں مگر اس اندر والی کوٹھڑی میں سونے چاندی کے سات صندوق گڑے ہیں۔ ایک میرے جہیز کا' ایک میری ساس کے جہیز کا' ایک ان کی ساس کے جہیز کا' ایک ان کی ــــــ

کہتے ہیں میری ساس کی جو ساس تھیں' انہوں نے کنجوسی کے مارے کبھی گھر میں چراغ نہ جلایا۔ گوشت نہ چکھا۔ کبھی مٹھائی نہ کھائی تھی۔ جب وہ مریں تو ان کی کوٹھڑی میں پچاس ساٹھ تو ٹوٹے مٹی کے برتن نکلے جنہیں پھینکنے کو ان کا جی نہ چاہتا تھا۔

ایک بار بھری برسات کی رات تھی۔ میری ساس عشاء کی نماز پڑھ کے جو اٹھیں تو کوٹھڑی کے سامنے ایک کالا ناگ پھن اٹھائے نظر آیا۔ مگر وہ بالکل نہ ڈریں۔ وہ جانتی تھیں کہ کوٹھڑی کی مایا پر سات کالے ناگ بیٹھے دولت کی حفاظت کررہے ہیں۔ جب وہ سانپ اندر چلا گیا تو میری ساس نے اپنے بیٹے سے کہہ کر نیاز بنوائی۔ کوٹھری میں چراغ جلائے اور اپنی ساسوں سے وعدہ کیا کہ ان کی دولت محفوظ رکھی جائے گی۔

اوئی! میں نے سنا تو یوں لگا بجیا' جیسے میری کلائیوں میں توڑے نہیں سنپولیے لپٹے ہوئے ہیں۔ میرے گلے میں شوجی کی طرح سانپ لہرا رہے ہیں۔ میں نے اپنی ساس کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ میرے زیور اتار لیں۔ میں نے راتوں کو خواب میں دیکھا' جیسے میرے بدن کو ہزاروں سانپ بچھو ڈس رہے ہیں۔ میں بھی عورت کی بجائے ناگن بن گئی ہوں۔ اپنے زیوروں کے اوپر پھن اٹھائے بیٹھی ہوں اور ایک شاعر میری آرتی اتار رہا ہے۔ میرے آگے بیٹھا بھجن گا رہا ہے۔ خوف کے مارے میری آنکھ کھل گئی۔ منی کے ابا نے لاکھ ڈرنے کی وجہ پوچھی مگر میں یہی کہتی رہی: "اللہ آپ ہٹ جایئے۔ کہیں میں آپ کو بھی نہ ڈس لوں۔"

ذرا آنکھ لگتی تو پھر خواب میں پہنچ جاتی۔ چاروں طرف زیور زیور بکھر جاتے۔ سونے کے پہاڑ' سونے کے پیڑ اور سونے کے بادل۔ پھر میں خود بھی سونا بن جاتی۔ میری چیخ سن کر وہ بھی سہم جاتے تھے۔ صبح کچہری جاتے وقت اپنی ماں سے میری شکایت کرنے لگے:۔

"دنیا کی بیویاں دولت دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔ ہماری بیگم صاحبہ کو دولت سے ڈر لگتا ہے۔"

یہ بات جب رو رو کر میری ساس نے گاؤں والوں کو سنائی تو لوگ نئے چاند کی طرح مجھ پر انگلیاں اٹھانے لگے۔ میں نہا کر گیلے بالوں سے قرآن شریف پڑھنے بیٹھ جاتی تھی۔ گھنٹوں سجدے میں پڑی دعا مانگا کرتی کہ باری اللہ کہیں وہ بھی کسی درویش سے ایک مراد نہ مانگ لائیں۔

مگر توبہ کرو چھوٹی بجیا' میری تو کبھی ایک دعا قبول نہ ہوئی۔ اللہ جانے لوگوں کو کیسا گر آتا ہے جو اللہ ان کی سن لیتا ہے--- ار ہاں--- توبہ ہے میری۔ سچ مچ یہ کفر ہی تو ہے۔ میں تو اللہ قسم کبھی ایسا کفر نہیں بکتی۔ وہ سب کی سنتا ہے۔ وہ میری بھی سنتا ہے۔ اب یہ کیا ضروری ہے کہ دعا منہ سے نکلتے ہی پوری ہو جائے۔

جب مینہ برس رہا ہو تو مجھے بڑے ویسے خیال آیا کرتے ہیں۔ دادی ٹھیک کہتی ہیں کہ اندھیری راتوں میں تو دلوں میں شیطان گھس جایا کرتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں گنہگار بندی شیطان موئے سے کیسے بچوں! اس موذی نے مجھے بہت ستایا ہے۔ اللہ قسم ہم بے زار ہو گئے ہیں۔

تمہیں وہ رات یاد ہے چھوٹی بجیا' جب حسو کی برات دیکھنے سب جنے چھتوں پر چڑھے تھے۔ میں تو براتیں دیکھنے کی ہمیشہ سے دوانی تھی۔ آدھی رات کو برات نکلی تو اکیلی چھت پر دوڑتی۔

جب چھوٹی سی تھی تو چپکے سے ڈولی کا پردہ اٹھا کر دلہن کو دیکھتی تھی۔ جنے کیوں مجھے دلہن کو دیکھ کر خوشی بھی ہوتی اور خوف بھی۔ وہ جو کالی دھوبن تھی' اس کی لونڈیا سسرال جاتے وقت کیسی پھوٹ پھوٹ کے روتی تھی۔ پچھاڑیں کھاتی پھرتی۔ پھر اس کا میاں ہاتھ پکڑ کے گھسیٹتا ہوا اسے لے جاتا اور وہ سر میں خاک اور اوپچتی' روتی دھوتی چلی جاتی تھی۔

پھر وہ کون سی بہو ہے جو اپنی سسرال مٹنے کی دعا نہیں مانگا کرتی۔ وہ کون سی لڑکی ہے جس کے خوابوں میں سسرال نہیں جھانکا کرتی---!

اے ہے میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی--- تو اس رات حسو کی برات دیکھنے سب چھت پر دوڑے تھے۔ سوائے میرے جسے حسو کا دولہا پسند نہیں آیا تھا' اور اسلم بھائی کے' جو دل و جان سے امتحان کی تیاریوں میں چمٹے ہوئے تھے۔ مجھے اکیلا دیکھ کر انہوں نے

پوچھا تھا:۔

"زہرہ برات دیکھنے نہیں گئیں؟"

"نہیں بھیا' مجھے حسو کا دولہا اچھا نہیں لگا۔"

"اچھا بھئی تو تمہیں کیسا دولہا اچھا لگے گا؟"

"مجھے تو پڑھے لکھے دولہے پسند ہیں۔ جیسا بڑی آپا کا مراد آباد سے آیا تھا۔ یہ تو گاؤں کا گنوار ہے۔ نرا جاہل لٹھ سا۔"

"اچھا بھئی تو تمہارا دولہا پڑھا لکھا ہی ہو گا۔ ورنہ تم برات واپس کر دینا۔"

ہائے مر جاؤں میں۔ میرا مطلب یہ تھوڑی تھا۔ مگر اسلم بھائی مطلب نکالنے میں بڑے کائیاں ہیں۔ کبھی جو سیدھی بات کو سیدھا رہنے دیں۔ ہمیشہ غلط سلط فرض کر کے اپنی زندگی کو ستیا ناس مارا ہے انہوں نے۔ واہی تباہی بکنے کا تو شوق ہے۔ ایک دن پڑھتے پڑھتے جانے کیا شعر انہوں نے مجھے سنایا۔ قسم لے لو چھوٹی بجیا' جو میری سمجھ میں خاک بھی آیا ہو۔ بس میں نے یوں ہی کہہ دیا کہ اللہ اسلم بھائی مجھ سے ایسی باتیں مت کریے گا۔

اے لو وہ تو اترانے لگے۔ جانے کون کہہ رہا تھا کہ دلی کی سڑکوں پر گھومتے پھرتے ہیں' کبھی گھر نہیں آتے۔ برا حال بنا رکھا ہے اپنا۔ خیر نہ آیا کریں گھر۔ مجھے کیا۔۔۔؟

یہاں اپنی جان کو ہزاروں کام لگے رہتے تھے۔ تمہارا کیا تھا' آپا کی طرح مزے سے اپنی سسرال چلی گئی تھیں۔ کبھی مہینوں میں خط لکھتیں کہ گھر میں جی پڑا ہے' مگر آتیں تو دو دن بھی یوں نکلتیں جانو جلتے توے پر ٹکی ہو۔

"اے چھوٹی بجیا' تمہارا جانے کیسے جی لگتا ہو گا سسرال میں ایسی گزری ہو جب میں نے خواب میں گھر نہیں دیکھا۔

کبھی چھوٹی ۔ ۔ ۔ میں بیر بہوٹیاں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ تم نے کڑھائی چڑھائی ہے اور بچے پوریاں لے لے کر بھاگ رہے ہیں۔ کبھی آنکھوں پر پٹی باندھے آنگن میں گھومتی ہوں اور سب میرے ہاتھوں سے نکل کر دور چھپ جاتے ہیں۔

کبھی لگتا ہے اپنا مٹھو اب پنجرے کو چھوڑ کر حسو کے نیم پر جا بیٹھا ہے اور میں خوشی کے مارے دوانی ہوئی جا رہی ہوں۔ میرا بڑا جی ہوتا تھا کہ مٹھو اڑ کر کہیں چلا جائے۔ کتنی بار پنجرہ کھول کر میں نے اسے باہر نکالا' مگر وہ کانپنے لگتا۔ جیسے اڑنا بھول گیا ہو۔ گھٹنوں پر کھولے ہمک ہمک کر رہ جاتا اور پھر جلدی سے پنجرے میں گھس کے یوں چاروں طرف

گھومنے لگتا جیسے باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈ رہا ہو۔ کبھی دیکھتی تم دلہن بنی ممانی بیگم کے کمرے میں بیٹھی ہو اور اپنی سہیلیوں کے سنگ ہنسے جا رہی ہو۔

چاہے تم کتنا ہی چھپاؤ مگر تم اپنے بیاہ کے وقت جی سے تو نہ روئی تھیں۔ میں سمجھتی تھی سب ایسا ہی کرتے ہیں' مگر میرے آنسو تو تھمنے کا نام نہ لیتے تھے۔ جیسے فتو بہشتی کی چھت ہے کہ بچوں نے اودھم مچا کے کڑیاں ہلا دی ہیں اور پانی رستا رہتا ہے۔ میرے اندر بھی بھری برسات کی جھڑی لگی تھی۔ بجلیاں کوندتی پھرتیں۔ مینہ کے زور سے جنے کتنے کچے گھروندے گر گئے۔ نہ جانے کتنے باغیچے اجڑ گئے۔ مجھے ہر وقت روتا دیکھ کر راحت اپا کو ایک دن بڑا غصہ آیا تھا۔

"چیونٹیاں تو پیروں تلے روندی ہی جاتی ہیں۔"

میں نے بڑی امید بھری نظروں سے راحت اپا کی طرف دیکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر تو سب ہی لڑکیوں کو رشک آتا تھا۔ جی چاہتا ہم بھی ان کی طرح ایم۔ اے پاس کرکے ٹھاٹ سے نوکری کریں۔ پھر کسی کی کیا مجال کہ بات بات پر ٹوکے۔ مزے سے وہ ہر جگہ گھوما کرتیں۔ بڑی بوڑھیوں کی ہر بات میں دخل دینے کی حق دار۔

مگر اس دن وہ بھی میرے ساتھ رونے بیٹھ گئی تھیں۔ ایک سال کے بعد میں نے سنا کہ راحت اپا کا بیاہ ان ہی زمیندار خالو سے ہوگیا جنہیں راحت اپا ہر وقت بنایا کرتی تھیں۔ پھر میں نے سوچا چھوٹی بجیا کہ ہم لوگ بھی عقل میں مٹھو سے کون سے بڑھے ہوئے ہیں۔

ہم بھی کھلی جگہ چھوڑ کے پنجرے میں گھسے راستہ ڈھونڈا کرتے ہیں۔ پھر راحت اپا کے بہتے آنسوؤں میں میرے آنسوؤں کی دھار مل گئی تھی۔

روؤں نہ تو کیا کروں بجیا؟ ایسے ایسے تو بے شمار دوپٹے میرے آنسوؤں سے بھیگ چکے۔ میرے دل کی گھٹا تو جتنی برستی ہے اتنی ہی امنڈتی ہے۔

مجھے اچھا کہنے والا بھی کوئی دنیا میں ہے! اماں ہیں تو ان کی ناک میں نے جھکائی۔ میاں کو خوش میں نہ رکھ سکی۔ ساس کو شکایت کہ دنیا کی سب سے بڑی کام چور میں ہوں۔ اور تو اور تم بھی مجھ ہی کو الزام دینے بیٹھ گئیں۔

کبھی لگاتار چھ مہینے تک صبح اٹھ کر چکی پیسنا پڑے تو جانو میرے جی کا دکھ۔ سات بھینسوں کی دیکھ بھال کرنا اور پانچ سیر آٹے کی روٹی پکانا اور برادری کی ہر عورت سے کئی کئی

دن لڑتا۔ یہ ارمان ہی رہا کہ کبھی دل کی پیاس کا غرارہ پہن کر جی کی پیاس بجھاؤں۔ گھر آتی تو میرے زیور دیکھ کر دولہا بھائی رشک کرتے۔

"اگر غالب کبھی زہرہ کو دیکھ لیتے تو عیش کا ٹھیکدار تجمل حسین خاں کو نہ ٹھہراتے۔"

پھر تو میرا جی چاہتا کلیجہ پھاڑ کے اپنے عیش کا ماتم کروں۔ دولہا بھائی سے کہوں کہ شکر بھیجئے جو غالب نے مجھے نہ دیکھا' ورنہ ان کا قلم تو پہلے ہی خوں چکاں ہو چکا تھا۔ اب وہ میرا مرثیہ لکھنے کو کہاں سے جگر لاتے۔

ہائے کنوار پنے میں کیا کیا پہن لیا۔ لوٹ پھیر کے کبھی اماں نے لٹھے کا غرارہ بھی بنوا دیا تو برا منہ بنا رہے ہیں۔ کبھی پھاڑنے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ اماں کبھی پیار سے کبھی غصے سے ڈانٹ رہی ہیں:۔

"لڑکیوں کا جی کیا---! جو دیا پہن لیا۔ یہ مردوں کے نخرے کیسے---؟"

کیا سچ مچ چھوٹی بجیا لڑکیوں کا جی نہیں ہوتا--- اگر ہوتا بھی ہے تو وہ لڑکیاں بڑی بدنصیب ہیں جو اپنے جی کو مار ڈالنے کی بجائے لیے لیے پھرتی ہیں۔ میرے دل میں تو ایک چھوڑ ہزار قبریں گن لو۔ مجال کیا جو میں نے اپنے جی کو مار ڈالا۔

بھاڑ میں جائے یہ بوچھا اور مینہ' تم میری سنو بجیا۔۔

آج برسوں بعد ملی ہو تو یہ بوندوں اور بادلوں کی باتیں کیا کریں۔ ایک تو منی بیمار۔ پھر وہ گاؤں میں تحصیل وصول کر رہے ہوں گے۔ تم جانو آج کل کے کسان کیسے منہ زور ہو گئے ہیں۔ کئی تو ان کی جان سے دور' ان کی جان کے پیچھے پڑے ہیں۔ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں تو میرا دل دھڑکا کرتا ہے۔

ہاں تو وہ بڑے چمکدار دن تھے' جب تم نے اماں پر زور دے کر اسلم بھائی کا رشتہ منظور کر لیا تھا اور میرے دل کی گھٹاؤں پر اچانک دھنک کھل اٹھی تھی۔

"لڑکیاں تو آٹے کا چراغ ہوتی ہیں۔ باہر رکھو کوا لے جائے۔ اندر رکھو چوہا کھائے' انہیں تو جلدی سے ٹھکانے لگانا ہی اچھا ہے۔" دادی نے بادل ناخواستہ اپنی رضامندی ظاہر کی تھی۔

میں پہروں بیٹھ کر سوچتی کہ جھوٹے ہیں یہ مولوی جو کہتے ہیں کہ خدا سے لو لگاؤ تو سنے گا۔ مگر مجھے تو اس زمانے میں آج کی طرح خدا یاد نہ آتا تھا۔

پھر سنا کہ ادھر پارے والے لوگ دادی کے پیچھے پڑے ہیں۔ منوں تو بھینسیں بندھی

ہیں۔ ان کے آنگن میں' پھر خاندانی زمیندار' ڈھیروں سونے کی اینٹیں زمین میں گڑی ہیں۔

بس ابا کی تو رال ٹپک پڑی۔ ان کی مدت سے آرزو تھی کہ ایک لڑکی شہر کے مفلس لڑکوں کو دینے کی بجائے گاؤں میں دیں۔ سونے میں پیلی ہو۔ اصل دل کا چین تو وہیں ملتا ہے۔ جانے تمہیں اور آپا کو کیا ہوگیا تھا۔ ہاں میں ہاں ملائے جاتیں۔

"سچ ہے ابا۔ ہم نے پردیس میں سونا اٹھایا تو مٹی ہوگیا۔"

تمہارا سونا مٹی بنا یا نہیں بجیا' مگر میں تو خاک ہوگئی تھی۔ باورچی خانے میں دادی کا جوشاندہ بناتے وقت میں نے زمین پر ایک خط لکھا تھا —— جانے کسے ——؟ اس خط میں آنسو بھی تھے اور خوشامد بھی۔ میں نے کتنی دھمکیاں دی تھیں۔ اور جب دل کی بھڑاس نکال چکی تو اسے پاؤں سے مٹاتے وقت میں نے سوچا' پگلی تو اڑ کے کون سے پیڑ پر بیٹھے گی۔

ہم کیا جانیں ہم کون ہیں۔ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ ہماری گردنوں میں نظر نہ آنے والے دھاگے بندھے ہیں اور پردے کے پیچھے چھپے ہوئے ہاتھ کبھی ان دھاگوں کو اوپر کھینچتے ہیں' کبھی نیچے گرا دیتے ہیں۔ ہم تو آٹے کا چراغ ہیں جو کسی نہ کسی کی خوراک بنیں گے۔ میں نے بھی تو اپنی گڑیا کا بیاہ سدا اپنی مرضی سے کیا۔

اب اللہ نے چاہا تو ایک دن میں اپنی منی کا بیاہ کروں گی۔ دیکھنا میری لاڈو کا بیاہ کس دھوم سے ہوگا۔ ایسا دلہا لاؤں گی کہ اجالا ہوجائے ——

کیسی باتیں کرتی ہو چھوٹی بجیا ——! اللہ نہ کرے جو منی کا دلہا میں اپنی مرضی سے لاؤں۔ اس بات پر منی کے ابو بھی بڑا تہیہ دکھاتے ہیں۔ انہیں یہ بات پسند نہیں کہ منی کا دلہا ان کی مرضی کے خلاف آئے۔

"آخر تمہارا بیاہ ہوا۔ تمہاری ماں کا —— ان کی ماں کا۔ پھر منی میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔"

اب ان کے منہ کون لگے۔ ویسے ہی گاؤں بھر میں زبان دراز تو مشہور ہی ہوں۔ پھر کولہو نہ کپاس' جولاہوں میں لٹھم لٹھا۔ ابھی سے اس بات پر کیا لڑے جاؤں ——!

مگر بھئی مجھے تو اپنی منی بہت ہی خاص نظر آتی ہے۔ تم ہی ایمان داری سے بتاؤ تم نے پہلے کبھی اتنی خوبصورت بچی دیکھی تھی' اور اتنی ہوشیار ہے کہ کبھی نہ ستایا۔ باپ کہتے ہیں ان پر گئی ہے۔ مجھے تو نہیں لگتی۔ تمہیں منی کو دیکھ کر کبھی اس کے باپ کا خیال آتا ہے ——؟

مجھے تو اپنی بیٹی سیر بین لگتی ہے۔ آنکھوں سے لگاؤ تو دنیا بھر کی اگلی پچھلی باتیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔

سب سے پہلے تو مجھے وہ رات نظر آتی ہے جب تم نے مجھے دلہن بنایا تھا۔ نہ جانے کیا کیا زیور تھے کہ میرے کان وزن سے ٹوٹے جا رہے تھے اور گردن بوجھ کے مارے جھک گئی تھی۔ کئی بار جی چاہا کہ یہ سب بوجھ جھٹک کر کھڑی ہو جاؤں۔ پھر سوچا کہ میں تو سونے کی مورت ہوں۔ پوجا کی دیوی۔ کسی نے مجھ سے کہا کہ اس وقت جو دعا مانگو قبول ہو گی اور میں نے ایک ہی دعا مانگی۔

"الٰہی لوگوں کے دلوں میں اتنا صبر بھر دے کہ وہ انتظار سے جی نہ چھوڑیں۔"

پھر جانے کیا کیا ہوا۔۔۔ کئی دنوں کے بعد مجھے ہوش آئے تو اوپر پارے والوں کے ہاں بڑی لبڑ دھوں دھوں مچی تھی۔۔۔ اور میں گھبرا گئی۔۔۔ کیا یہاں بھی آگ لگ گئی۔۔۔!

یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اوپر پارے میں جو مرد سب سے بلند آواز میں گالیاں بکے وہ سب سے زیادہ بہادر ہے۔ جو عورت لڑنے میں سب سے آگے ہو وہ سب سے زیادہ عقلمند۔ جو بہو گونگی ہو وہ سب سے زیادہ سگھڑ۔

مجھے بھی سگھڑ بہو بننے کا بڑا چاؤ تھا۔ تمہیں یقین نہ آئے گا چھوٹی بجیا کہ مہینوں تو میں نے اس آدمی کی صورت بھی اچھی طرح نہ دیکھی جس کے ساتھ میں نے اس پل صراط کو پار کرنے کا اقرار کیا تھا جو میری زندگی بھی بنا اور موت بھی۔ اسے شاعری آتی تھی نہ الٹی سیدھی کہانیاں۔ اگر اسلم بھائی اس سے بھی غالب کے کسی شعر کا مطلب پوچھ لیتے تو وہ شاید ہیں ہیں کر کے رہ جاتا۔

بھری برسات میں اسے فصلوں کی فکر کھائے جاتی۔ میں نے کئی بار چاہا کہ کبھی اپنے من کی فصلوں پر بھی تو نگاہ ڈالو۔ میری تو ساری فصلوں پر پالا گرا چھوٹی بجیا۔ میرے کھلیان پر دن دہاڑے ڈاکہ پڑا اور دائیں چلنے سے پہلے آگ لگ گئی۔

میں تو وہ بھوری بھینس بھی نہ تھی جسے چھپر تلے بندھے دیکھ کر میری ساس اور اس کا بیٹا خوشی کے مارے نہال ہوتے ہیں۔ مجھ سے اچھا تو میرا جہیز تھا جس پر وہ دونوں گاؤں میں اکڑ کے چلتے ہیں۔

بیگم نیک دوپہروں میں بیٹھی میں اپنے دل میں اٹھنے والی آندھیوں کو روکا کرتی تھی۔ لو کے جھکڑ کوڑوں کی طرح میرے دل پر لگتے اور گاؤں کی لڑکیاں کچھ مسرت' کچھ

رشک اور کچھ شک لیے میرے پاس آبیٹھتیں۔ نئی دلہنوں سے یوں ہی لڑکیوں کو دلچسپی ہوا کرتی ہے۔ پھر میں شہر کی دلہن تھی' جس کی ہر بات انوکھی تھی' ہر جنبش قابل اعتراض۔ مجھ سے نئے نئے قسم کے کپڑے سلوائے جاتے۔ شہر کے انوکھے قاعدے قرینے پوچھے جاتے۔ رشتوں کے سارے دیور اپنی آنکھوں میں دلچسپی اور حسد سمیٹے میرے پاس آبیٹھتے۔ سنبھل سنبھل کر مہذب مذاق کیئے جاتے۔ شہر کی نئی نئی باتیں پوچھی جاتیں۔ اپنے ہاں کے سب سے زیادہ تعجب خیز قصے سنائے جاتے۔ یہی کہ آج سے دس برس پہلے اس گاؤں میں ایک فقیر نے ایسی دعا دی اور اتنی اچھی فصل ہوئی کہ لوگوں نے اپنی لڑکیوں کے بیاہ بھی کر دیئے جو پیدا ہونے والی تھیں' اور اچھن چچا نے اپنی لڑکی کے جہیز میں ملع کیے ہوئے کنگن دیئے تھے' اور ندی کے کنارے والے برگد پر سات جن رہتے ہیں۔ میری نند کی لڑکی چھمو گاؤں کے اسکول ماسٹر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ لوگ اسے دہلی سے پکڑ کے لائے تھے۔ یہ بات میری نند نے اپنے فرشتوں سے بھی چھپائے رکھی تھی اور یہ بات ڈولی سے اترتے ہی ہر عورت نے میرے کان میں سب سے پہلے سنانا چاہی تھی۔

باہر دالان میں بیٹھی عورتیں میری ساس سے کہتی تھیں:۔

"جیسا نصیبا تمہاری بہو کا ہے اللہ ہر لڑکی کا کرے۔" اور مجھے سب لڑکیوں پر رحم آتا تھا۔

اے چھوٹی بجیا' میرے دماغ کا کچھ علاج کرو بھئی۔ کسی پیر سے تعویذ لکھوا لاؤ۔ نہیں تو یہ بیتے دنوں کی یادیں مجھے پاگل بنا کر چھوڑیں گی۔

میری نظروں میں گرمیوں کی وہ پیاسی نڈھال سی رات گھوم رہی ہے۔ تپتی ہوئی سفید چاندنی بیوہ کے دوپٹے کی طرح بھیانک لگ رہی ہے۔ کوٹھے کے اوپر سب کے پلنگ بچھے ہیں۔ چوکی پر رکھی ہوئی کوری صراحیوں کے گلے میں موتیا کے گجرے لپٹے ہوئے ہیں اور در و دیوار سے گرم بھاپیں نکل رہی ہیں۔ سب پلنگوں پر لیٹے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ پنکھوں پر ٹھنڈا پانی چھڑک رہے ہیں۔ پھر خالہ بیگم کے ہاتھ سے پنکھا نیچے گر پڑتا ہے اور چونک کر وہ دوبارہ اٹھا لیتی ہیں۔ صرف راحت اپیا تھیں۔ جو لال ٹین دھیمی کر کے' کھلی کتاب سینے پر اوندھائے چاند کو گھورے جا رہی ہیں۔اور ایک میں ہوں کہ کبھی اس کروٹ لیٹ کر مسجد کے ٹوٹے مینار دیکھ رہی ہوں' کبھی اس کروٹ لیٹ کر حسو کا نیم اور اور نواب شاہ کا ٹوٹا کھنڈر دیکھ کر ڈر رہی ہوں۔ بار بار نیچے ہونے والی ممانی بیگم اور کھبے ماموں کی

لڑائی میں دھیان بٹ جاتا ہے۔ کیسی وحشت ناک رات تھی۔ نہ جانے کتنے تارے لمبی ہائے کی طرح ٹوٹ کر گرے۔ دادی نے چونک کر لاحول پڑھی اور سر ڈھانپ لیا۔

اللہ میاں کے ہاں سے نکالی ہوئی بد روحیں اب نواب شاہ کے کھنڈر میں گھسنا شروع ہوئیں۔ نیم کے پتے خوف سے کانپنے لگے اور میں چیخ مار کے راحت اپا کے پاس جا بیٹھی۔ اسی دن انہوں نے مجھے اپنی کتاب میں سے ایک انگریزی قصہ سنا کر بہلایا تھا۔

اب مجھے پورا تھوڑی یاد رہا ہے۔ بس کچھ یوں تھا کہ ایک میاں اپنی بیوی کو بہت دکھ دیتا تھا' مگر بیوی نے جی جان سے اپنے بچے کو پالا۔ اس کا لڑکا بڑا ہو کے بہت ہونہار نکلا۔ ماں کا سکھ ڈھونڈنے کے لیے اس نے ہر مصیبت اٹھائی۔ پھر کالے پانی چلا گیا تاکہ اب اس کے ملک کی مائیں زیادہ دکھ نہ اٹھائیں۔ راحت اپا نے یہی کہا تھا۔

یہ قصہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ چلو اب دنیا میں کہیں تو مائیں مسکراتی ہوں گی۔

راحت اپا کے پاس لیٹے لیٹے مجھے ایک اور پرانی بات یاد آئی تھی۔ بہت بھولی سی ۔۔۔ میں ننھی سی ہوں اور اماں مجھے پٹک کر ممانی بیگم کو بچانے دوڑی ہیں' کیونکہ کھبے ماموں کے سالن میں انہوں نے نمک بہت تیز کردیا تھا اور اس مارا ماری میں ایک ننھے سے بچے کی چیخیں سنائی دینے لگی تھیں۔ یہ بچہ جو شاید وقت سے پہلے آگیا تھا کہ اپنی ماں کو بچا سکے۔ اور لڑکے کی خوشخبری سن کر کھبے ماموں کا موڈ ایک دم بدل گیا تھا۔ یوں جیسے چھوٹے ماموں کا دہلی سے منی آرڈر آگیا ہو۔

مجھے کچھ دھیان سا ہے کہ شاید یہ کہانی دادی نے سنائی تھی یا راحت اپا نے۔ ممکن ہے میں نے خود ہی دیکھی ہو۔ ماں کی فریاد سن کر آنے والا بچہ کون تھا۔۔۔! راحت اپا کی کہانی والا یا کوئی اور کچھ یاد نہیں رہا۔ شاید میرا وہم ہو۔ شاید اب ایسے بچے ہر جگہ پیدا ہورہے ہوں۔ کون جانے۔۔۔!

مجھے تو بڑے ویسے خواب نظر آتے ہیں بجیا۔ وہ چیزیں دکھائی دیتی ہیں جنہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا' کبھی نہیں چھوا۔ کوٹھڑی کی مایا نے میرے اوپر کوئی ٹونا کردیا ہے۔ ضرور میرے اوپر کوئی بھاری نظر ہے۔

کبھی خواب میں دیکھتی ہوں کہ سامنے الجھے تاروں کی طرح ریل کی پٹریاں پھیلی ہوئی ہیں اور میں ان پر دوڑی جارہی ہوں۔ پتہ نہیں مجھے خواب میں اتنا دوڑنے کا کیوں ارمان ہے۔۔!

پھر کالے بادلوں کی طرح خوف ناک انجن مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ میں بیچ میں کھڑی ٹکر ٹکر انہیں بڑھتے دیکھتی ہوں۔

پھر دیکھوں تو دروازے کی آڑ میں کھڑی ڈاکیے سے منی آرڈر وصول کر رہی ہوں۔ ہرے ہرے نوٹ چاروں طرف بکھر جاتے ہیں۔

خواب میں بڑی پیاری پیاری صورتیں نظر آتی ہیں۔ کہ جیسے میں ہوں اور آنگن میں بیٹھی مٹھو کو بولنا سکھا رہی ہوں۔ دالان میں بھائی جان کسی بے بات کی بات پر بھابی کو ڈانٹ رہے ہیں' اور بھابھی کے آنسو فوارے کی طرح اچھل اچھل کر سارے آنگن میں بہنے لگے ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں سیلاب نہ آجائے۔ میں خوف سے چیختی ہوں:۔

"بس کرو بھیا۔"

ذرا میں دیکھو تو بغیا کی طرف بھاگی جا رہی ہوں اور اسلم بھائی پیچھا کر رہے ہیں۔

پھر دیکھو تو الجھا ریشم سلجھائے جا رہی ہوں' سلجھائے جا رہی ہوں۔ بتاؤ تو چھوٹی بجیا' اس کی تعبیر کیا ہوگی۔۔!

میں تو یہ خواب دیکھ کر بہت کڑھتی ہوں۔ اللہ قسم آنکھ کھلتی ہے تو تکیہ آنسوؤں سے بھیگا ہوتا ہے۔ اندھیری راتوں میں یادیں یوں چمک چمک جاتی ہیں جیسے گھٹا ٹوپ اندھیاری میں کوئی چراغ لیے گھوم رہا ہو۔ چاروں طرف مندروں کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوتی ہیں تو رکنے کا نام نہیں لیتیں۔ میں گھبرا کے بھاگنا چاہتی ہوں' سانپ کی طرح کسی سوراخ میں چھپنا چاہتی ہوں' مگر اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی۔ میں جو کالی ناگن نہیں سونے کی مورت ہوں۔

چھوٹی بجیا' ذرا میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھو۔ کیسا انجن کی طرح دھک دھک چل رہا ہے! تم سمجھتی ہو میں ان جھوٹے خوابوں سے ڈر جاؤں گی۔۔۔! اللہ نہ کرے جو میں خوابوں کے سہارے زندہ رہوں۔ اگر میں ہر وقت خواب دیکھے جاؤں تو سات بھینسوں کا دودھ کو دوہے' منی کی دیکھ بھال کون کرے' ساس کے پیر کون دابے؟

منی کے ابو کا غصہ تو تم جانتی ہو۔ ذرا روٹی کچی رہ جائے تو رکابی اٹھا کے میرے منہ پر مارتے ہیں۔ یہ دیکھو داہنے گال پر چوٹ کا نشان۔

ایک بار وہ غصہ میں منی کو مارنے بھی دوڑے تھے۔ لیکن میں بیچ میں آگئی۔ میں نے کہا تم اپنی لاٹھی کا سارا زور بس مجھ پر ختم کردو مگر خبردار جو میری بچی پر کسی مار کا نشان

ڈالا۔ ہاں نا تو--- بس چھوٹی بجیا' وہ میرا غصہ دیکھ کر شرمندہ ہوگئے۔

اللہ قسم منی کی جانب کوئی ٹیڑھی نظر ڈالے تو اس کے دیدے نکال کے پھینک دوں۔ میں تو اس کے راستے کے سارے انجن ہٹا دوں گی۔ اس کی راہ میں جگ جگ دیپ جلاؤں گی۔ تم دیکھنا میری منی کے ٹھاٹ۔

پیچھے پلٹ کے دیکھتی ہوں تو وقت کی ریت پر دور تک میرے قدموں کے نشان چلے گئے ہیں۔ میں جانے کیا چیز ڈھونڈتی اتنی دور آگئی ہوں---!

اے لو مینہ نے پھر زور باندھا' بچاری ننھی سی بے بساط بوندوں کو ہواؤں کے جھکڑ دھکے دے رہے ہیں اور بادل یوں گرج رہے ہیں جیسے بھائی جان بھابی کو ڈانٹ رہے ہوں۔

چھوٹی بجیا' کبھی برسات پر بڑھاپا کیوں نہیں آتا! ہر سال دھنک اتنی خوبصورت کیسے نکلتی ہے؟ یہ ساون کی ہریالی' سچے موتیوں کی طرح چمکتی ہوئی بوندیں' اودی اودی گھٹاؤں میں بجلی کی جگر مگر' یہ سب ہمیشہ یوں ہی رہیں گی--- مگر میں میں جو ہر سال آسمان پر مسکرانے والی دھنک نہیں ہوں' ایک دن دادی کی طرح ان سب چیزوں سے بے زار ہو جاؤں گی۔ مجھے اس رینگتے ہوئے وقت سے بڑا ڈر لگتا ہے بجیا۔ ہزاروں کنکھجوروں کی طرح وقت کے پنجے پھیلے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ایک دن میں کچھ نہیں رہوں گی۔ اوپر تلے آنے والے دن رات' ہر سال گرجنے والی بجلیاں مجھ پر ٹوٹ پڑیں گی۔ مجھے نگل جائیں گی-- ہائے پھر کیا ہوگا!

سچ مچ میں نگوڑی اللہ جانے کیا چاہتی ہوں---!

خیر' اگر میں مر بھی جاؤں تو کیا یہ ممکن نہیں ہوسکے گا کہ میں کسی اچھی سی جگہ دفن کی جاؤں' کسی اونچی سی جگہ یا کسی ایسی زمین پر جہاں میں کسی عورت کی سسکیاں نہ سن سکوں۔ میرے آس پاس کسی جوان لڑکی کی قبر نہ ہو۔

بولو چھوٹی بجیا' تم اتنا تو کرسکو گی نا---؟

○

چھٹکارا

صورت سے ایسے بچارے لگتے، یوں جیسے میرانیس کا کوئی مرثیہ مجسم ہوگیا ہو۔
منحنی سا قد، سوپ سی داڑھی، اور بجھی بجھی سی آنکھیں جن میں ہر وقت بھوک سلگا کرتی۔

دو روپے مہینے کے لیے تین میل دور سے روز پیدل چل کر آتے تو بیٹھتے ہی تنفس درست کیے بغیر پوچھتے:۔

"آج تم نے کیا کھایا---؟" بات کرتے وقت ان کے منہ سے تھوک کے فوارے سے چھوٹتے۔

"جی ___ جی وہ---" ہر روز آموختے کے ساتھ دن بھر کی کھائی ہوئی چیزیں یاد رکھنا بھی عمو کے فرائض میں داخل تھا۔

"اوں--- مسور کی کھچڑی--- نہیں وہ کالی دال والی۔"

"اوڑد کی کھچڑی---؟" وہ کھچڑی کا بڑا سا نوالہ نگل کر دہراتے۔

"اگر بڑھیا والا گھی ہو اوڑ ساتھ ہی پوڈینے کی چٹنی، دہی وغیرہ، تو ہے اوڑد کی کھچڑی کا مزا۔ یہ کیا کہ کٹوڑی بھر گھی سے کھچڑی کھالی۔"

اونہہ، کہاں کا کٹوری بھر گھی۔ اماں کا بس نہ چلتا کہ وہی شیشی میں گھی بند کر کے سامنے رکھنے والا سسٹم چلاتیں۔ ڈالڈا کی کٹوری میں سے دوسرا چمچہ بھی بھرو تو دادی کی دولت کو دھکے لگنے لگتے۔

"کبھی میں بھی اوڑد کی کھچری بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ گرما گرم کھچڑی اور یہ بہت ساری۔ بس جناب خوب مزے سے اڑاتے تھے۔" وہ بہت دیر تک جھوٹ موٹ کے نوالے بنا بنا کر منہ تک لے جاتے رہے، اور تھوک کی پھوار سے بچنے کے لیے عمو سرکتے سرکتے چوکی کے کونے پر جا ٹکی۔ پھر آئس فروٹ والے کی آواز پر پڑھائی کی رفتار ذرا دھیمی پڑی اور مونچھ کا سرا منہ سے نکال کر سوکھا مارا ہاتھ فضا میں بلند ہوتا۔

" ت___ ت سے کیا---؟"

"اوں--- آئس فروٹ--- نہیں تربوز---" جلدی سے کتاب کا فوٹو ڈھونڈ کر وہ پہچان جاتی۔

"شاباش، جلدی جلدی پڑھو۔"

"ت سے تربوز--- ہاں کوئی پھیکا سیٹھا نہیں۔ خوب بڑا۔ اندر سے لال بیر بہوٹی۔ خوب میٹھا میٹھا تربوز کا رس ہونٹوں سے چاٹتے ہوئے وہ چھری ڈھونڈنے لگتے--- "میٹری صوڑت کیا دیکھ ڑہی ہو۔ میں تربوز تھوڑی کھا ڑہا ہوں۔"

جب سے عمو مٹکیا سے پیٹ پر تنگ ہمیا باندھنے لگی تھی، چھوٹی خالہ کو چڑانے کے لیے صرف اس کے ماسٹر صاحب مل گئے تھے۔

"وہی مثل ہے کہ مرتے جائیں، ملہاریں گائیں۔ ایسی غریبی میں سیکڑوں کھانوں کے مزے یاد ہیں۔"

"جتنی دیر بیٹھتا ہے بس کھانوں کی باتیں لے لو۔" کوئی اور بڑھاوا دیتا۔

گھر میں جو چیز بچ جاتی عمو کے ماسٹر کے لیے رکھ دی جاتی۔ "اے واہ، میں اپنے ماسٹر کو باسی کھیر کیوں کھلاؤں گی۔ لے کے سب پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اچھن کے ماسٹر کو کھلا دینا۔" عمو ضد کرتی۔

"اے ہٹ--- ہمارے ماسٹر صاحب کا نام بھی لینے لگیں بچاری۔" نیا نیکر پہن کر اچھن جیبوں میں ہاتھ ڈالے مرغ کی طرح اکڑنے لگتا۔

"ہمارے تو انگریزی ماسٹر ہیں۔ اس دن بھری گلاب جامنوں کی پلیٹ واپس کردی تھی انہوں نے۔ بھول گئیں---؟"

گلاب جامنوں کی وہ پلیٹ اچھن کی ماسٹر کی بڑائی کا سرٹیفکیٹ ہو گئی تھی۔ مگر عمو کے عربی قسم کے والے ماسٹر نے آج تک کوئی چیز واپس کرکے اپنا ریکارڈ خراب نہیں کیا تھا۔

"خدا سے ڈرو بچو---" دادی تسبیح رکھ کر وعظ شروع کردیتیں:۔

"دکھیا غریب آدمی ہے۔ کبھی اس کے ہاں بھی سب کچھ تھا، مگر اس منحوس کے پیدا ہوتے ہی لاکھ کا گھر خاک ہوگیا۔ آج کل لوگ مسجد کے ملاؤں کو ایسی کون سی دولت بخش دیتے ہیں جو اپنی بیوی بچوں کا پیٹ بھرے۔"

دادی ماسٹر صاحب کی پوری تاریخ سے واقف تھیں۔ وہ تو ان کے پیدا ہوتے ہی ماں نے اپنا بوریا بستر سمیت کر جو اللہ میاں کے گھر کی راہ لی تو بھوکے رہنے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ پھر کبھی پیٹ نہ بھر سکا۔ تیری میری ماؤں نے اپنے بچوں کا صدقہ سمجھ کر دو چار دودھ کی دھاریں ٹپکا دیں۔ پھر سوتیلی ماں نے دن بھر کام کے عوض دو روٹی روز کا راتب

مقرر کردیا' مگر آئے دن کی شرارتوں اور جرموں میں اضافہ دیکھ کر ایک روٹی ایک وقت باندھ دی۔ جس دن باپ کے مرنے پر محلے والوں نے پگڑی باندھ کے باپ کی پیش امامی انہیں سونپی تو انہوں نے سمجھا کھانے پینے کا زمانہ اب آیا ہے۔

پندرہ روپے تنخواہ' پھر مسجد میں چراغوں کے لیے آئے ہوئے پیسے۔ نیاز نذر' فاتحہ کا کھانا اور جمعرات کی خیرات الگ رہی۔ سب مل کر اتنا تو ہو ہی جاتا ہے کہ انسان جی بھر کے کھا سکے۔ نہ جانے کب سے گرم گرم اوڑد کی کھچڑی کے خواب کو بس تعبیر شرمندہ ہی کرنے والی تھی کہ ان کی سوتیلی ماں قبر میں جاتے جاتے بھی انہیں بھوکا رکھنے کا سامان کرتی گئی۔

جتنا وہ بیوی کو نگلنے کی کوشش کرتے ان کے کھانے میں حصہ داروں کی تعداد بڑھتی رہی۔

وہی بنی ہوئی روٹیاں اور بنی ہوئی دال' جس میں دو چار ازلی نیت خراب دوبارہ حصہ لینے بیٹھ جاتے۔ اس پر بھی بیوی ہر وقت بھوک کا رونا روئے جاتی۔

مگر دادی سے سب متفق نہ ہو سکے۔

غریب تو ہزاروں ہوتے ہیں' مگر یوں کسی پر ازلی بھوک سوار نہیں ہوتی' اور عمر ڈھلنے لگے تو یوں بھی انسان کی اشتہا کم ہوجاتی ہے۔ آئس فروٹ والے کی آواز پر منہ میں پانی نہیں بھرتا۔ لذیذ چیزوں کا ذکر آئے تو یوں آنکھیں چمک چمک کر نہیں بجھ جاتیں' مگر اس کے باوجود ماسٹر صاحب بڑے سخت مزاج تھے یا پھر عمو سے ہی جنم جنم کا بیر تھا۔ ان سے پوچھا چھڑانے کو عمو نے ان کے ظلم و ستم کی داستانیں گھڑ گھڑ کے سنائیں اور سب کے سامنے ایک لفظ پڑھ کے نہ دیا' مگر یہ سب باتیں ان کی نالائقی اور کوڑھ مغزی کے سر تھوپی گئیں۔

"اسے تو دن رات میراثنوں کی لونڈیاں چاہیں گڑیوں کا بیاہ رچانے کو۔ یا پھر سڑکوں پر لڑکوں کو ساتھ دھینگا مشتی کرتی پھرے گی۔" رشو آپا جل کر کہتیں اور اس کی تہہ میں چھپا ہوا انتقام عمو صاف سمجھ جاتی۔ ان کی چھٹیاں لے کر قاسم بھائی کے پاس جانے سے جو انکار کر دیا کرتا تھا۔

"اجی یہ ڈنڈوں اور پتھروں کے زور پر بھی بچے کہیں پڑھائے جاتے ہیں۔" بھائی جان ذرا اپنی ترقی پسندی دکھانے پر آتے تو سارا گھرانا ان کے پیچھے پڑ جاتا۔

"بس رہنے دو اپنی قابلیت۔ تم جو بی۔ اے میں آئے تو شاید ماسٹروں نے پیار کرکے پڑھایا تھا۔" دادی کو غصہ آ جاتا تھا۔

جس دن الہ آباد کے امرودوں اور قائم گنج کے بیروں کا ذکر سنتے سنتے ان کا دماغ ماؤف ہوجاتا تو غصہ میں تن بھنا کے ماسٹر صاحب اماں کو دروازے کی آڑ میں بلوا لیتے۔

"اجی! عامو بٹیا اپنا سبق یاد ہی نہیں رکھتیں۔ شاید ان کی صحت اچھی نہیں رہتی اوڑ ابھی کچھ چھوٹی بھی نہیں۔" وہ ڈرتے جاتے کہ اماں کہیں منع ہی نہ کر دیں اور یہ دو روپے کا آسرا بھی جائے۔

"اے واہ۔ رشو نے تو اس عمر میں چار پارے ختم کرلیے تھے۔ مجھے تو مٹی کچھ دبلی بھی نظر نہیں آتی۔ آپ ذرا کان کھینچ دیا کریں۔ (جیسے آج تک ماسٹر صاحب اماں کے حکم کے منتظر تھے اور اس کے کان یوں ہی خرگوش کے کان ہو رہے ہیں۔)

"آپ عامو بٹیا کو رُوز صبح بادام کا حریرہ پلائیے۔ اس سے دماغ تازہ ہوگا۔ یوں کریے کہ دس بادام لے کر---" وہ باقاعدہ ایکشن کے ساتھ حریرہ بنانے کی ترکیب بتانے لگتے۔

"اور پھر گرم گرم انہیں پلائیے۔" تیار شدہ حریرہ کی خیالی پیالی وہ اپنے منہ سے لگاتے ہوئے کہتے۔

ظاہر ہے اس قسم کی ناانصافیوں پر اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی جارہی تھی۔

ماسٹر صاحب کی صورت دیکھ کر اسے جتنا ڈر لگتا اتنا ان کے ڈنڈے کو دیکھ کر بھی نہ لگتا تھا۔ جب شدت اضطراب میں وہ اپنی مونچھیں چبانے لگتے اور ان کی گڑھوں میں بیٹھی ہوئی چچماتی آنکھوں میں دھواں سا سلگنے لگتا تو وہ اپنے گدرائے ہوئے ہاتھوں کو کرتے میں چھپائے سہم جاتی، جیسے کسی دن ماسٹر صاحب اس کے ہاتھ پاؤں اٹھا کر چبانے لگیں گے۔

کئی بار اس کے نرم ہاتھوں کو اپنے سخت سے ٹھونک بجا کر انہوں نے کہا تھا۔

"ہاتھ پاؤں دیکھ تو پھول کڑ کپا ہو رُہے ہیں اوڑ دماغ پڑ جڑبی چڑھتی جاڑہی ہے۔"

دس بجتے ہی عمو پر خوف سوار ہوجاتا۔ کھانا کھاتے میں وہ بار بار یاد کرتی۔

آلو قیمہ--- آلو قیمہ--- پھر تھوک نگل نگل کر اس آلو قیمے کی جگالی یاد کرتی تو وہ اپنی ابکائی روک لیتی۔

"برسات کے دن ہیں اور کمبخت ندیدے پن میں کھائے جاتی ہے۔ اٹھ دستر خوان سے۔"

"صحبت کا اثر ہے۔" بھمن کے فقرے پر ابا تک کو ہنسی آجاتی۔

خیر جی ایک سال کی اور بات ہے۔ اس کا پہلا قاعدہ ختم ہوا نہیں کہ چھٹی ہوئی۔ پھر وہ بھی اچھن بھمن والے ماسٹر سے انگریزی پڑھے گی۔ روزانہ کاندھے پر بستہ لٹکائے ابا کی سائیکل کے سامنے بیٹھ کر شفو کی طرح اسکول جانے لگے گی۔

"کیوں؟ تمہیں اردو تو یہی ماسٹر پڑھائیں گے۔" اچھن خوش ہو کر کہتا۔

"تم کوئی ہماری طرح ابھی سے اسکول تھوڑی جاؤ گی۔"

اس دن تو غم کے مارے وہ ایک گھنٹے تک پاخانہ میں بیٹھی روتی رہی اور اگر دادی کو تپچس نہ ہوتی تو شاید سارا دن باہر نہ نکلتی۔ ان دلہنوں کا سا حال ہوگیا تھا جن کے نصیب میں بوڑھا کھوسٹ دلہا لکھا گیا ہو۔ اب جنم جنم کی بیڑیاں اس کے ساتھ گزارنا ہوں گی۔ جس کے ہاں جاؤ یہی باتیں' جو گھر میں آتا یہی پوچھتا:۔

"کیوں عمو تمہارے ماسٹر صاحب کا پیٹ بھرا یا نہیں---؟"

(وہ تو مجھے کھا کے بھرے گا)' مگر عمو کسی سے نہ کہتی۔ یہاں لگائی بجھائی کرنے والوں کی کمی تھوڑی تھی۔ جو ابھی اچھن جا کر دادی سے لگا دے تو آج شام تک دادی تسبیح پر اس کی نالائقی کا وظیفہ پڑھے جائیں گی۔ جی چاہتا شفو کے بھائی کی طرح ایک دن چھت سے گر کے یوں ہسپتال جائے کہ پھر کبھی نہ لوٹ سکے۔ مارتا تو ہر وقت کی کائیں کائیں---

اس کے پڑھتے وقت اچھن ماسٹر صاحب کے ترسانے کو پوچھتا:۔

"عمو آئس فروٹ کھاؤ گی---؟"

"اچھن ہم تمہیں مار دیں گے۔" وہ بڑی مشکل سے چ کو انگلی سے تھامے بگڑ کے کہتی۔

"کیوں جی ہم نے تمہیں یہی بدتمیزی سکھائی ہے---؟" وہ چانٹا مار کے پوچھتے۔

"جب کوئی کھانے کی تواضع کرے تو شکریہ ادا کر کے کھالیتے ہیں۔"

ادھر دروازے کی آڑ میں کھڑے ہوئے اچھن بھمن کے ساتھ بھائی جان اور رشو آپا تک ہنسنے لگتے۔

پھر تو بھائی جان کو بھی ماسٹر صاحب سے دلچسپی ہوگئی۔ فرصت کے وقت رشو آپا کی سہیلیوں کے ساتھ کارڈز کھیلنے کی بجائے مزے مزے کے کھانوں کی باتیں ہوا کرتیں۔ دنیا بھر کے کھانے جھوٹ موٹ پکا کر کھائے جاتے۔ بھائی جان نے اپنے ہاتھ کی پکائی ہوئی

مخصوص چیزیں کھلانے کا وعدہ کیا تھا جو ماسٹر صاحب روز انہیں یاد دلاتے۔

جس دن اندر سے ماسٹر صاحب کے لیے کوئی بچی کھچی چیز نہ آتی تو اپنی مونچھوں کو چوس چوس کر وہ بیزار ہو جاتے۔ دماغ ایسا غائب کہ عمو کبھی دو پیسے میں دو گھوڑے خرید رہی ہے، کبھی چار پیسے میں آٹھ ہاتھی بیچ رہی ہے۔ بار بار آنگنی میں چگتے ہوئے ننھے چوزوں کو دیکھنے میں محو ہوجاتی، مگر ماسٹر صاحب تصور جاناں میں غرق۔ پتا بھی کھڑکتا تو سجدہ مسرور کے مسجود کو وہ سامنے پاتے۔ ذرا سی آہٹ پر بھوکے کتے کی طرح نتھنے پھڑک پھڑک جاتے۔

"جاؤ اپنی ماں سے ہمارا سلام تو کہہ آؤ۔" وہ بیزار ہو جاتے۔

ادھر اپنی ماں کو دادی کے چست بندش والے فصیح و بلیغ طعنے کا جواب الجواب ہی نہ مل چکتا۔

"ان ماسٹر صاحب کی مت تو نہیں کٹ گئی۔ پیر کو نہ شہید کو، نکٹے دیو کو پہلے۔ روز روز انہیں کیا صبح ہی صبح کھلایا کروں---!"

جی تو چاہتا اماں کے الفاظ ہی لے جا کر منہ پر دے مارے، مگر یہ عورتیں تو ہمیشہ جاہل ٹھہریں، اور اپنے گھر کی پوزیشن بنانا بھی اپنا ہی فرض ہے۔ ابا کے دوست کبھی اماں سے کچھ کہلواتے تب بھی اماں یوں ہی ان کی صورت پر خاک اولچا کرتی تھیں، مگر ابا کوئی بڑا شائستہ سا جواب سوچ کر خود ہی دے آتے تھے۔

"کیوں--- کیا کہا---؟ عمو کو خالی ہاتھ دیکھ کر دل کے ایوانوں میں سلگتی ہوئی ساری شمعیں ایک دم بجھ جاتیں۔

"کچھ نہیں---" وہ بے حد بشاشی سے جواب دیتی۔

"خیر" مگر یاد ڑکھو آج۔ سبق یاد کرائے .غیر نہیں چھوڑوں گا۔"

اس کی پیٹھ پر کڑک کڑک کر ٹوٹنے والی دھمکوں کی بجلی میں تھوک کی پھوار تیز ہوجاتی۔

رفتہ رفتہ محلے کے سب بچوں کو اور کوئی کھیل یاد نہ رہا۔

جسے دیکھو اپنے گھر سے سڑے گلے پھل اور پھپھوندی لگی مٹھائیاں لیے یوں آتا جیسے عمو کے ماسٹر بھی پنجرے میں لٹکتا ہوا طوطا ہوں۔ لوگ طرح طرح کے اسکینڈلز ان کے خلاف پھیلاتے پھرتے۔

"عمو کے ماسٹر پلیٹ یوں صاف کرتے ہیں جیسے ٹینس کا لان۔"

"وہ دنیا کی ہر چیز کھانا پسند کرتے ہیں۔"

"آج تک کبھی انہوں نے پیٹ بھرنے کی حامی نہ بھری۔ ان کا پیٹ تو ایک گہری خندق ہے جس میں گاڑیوں پتھر پھینکو پھر بھی نہ بھرے گا۔"

"میں تو اپنے ماسٹر صاحب کو سڑی جامنیں نہیں کھلاؤں گی۔" عمو چیخ چیخ کر روتی۔

"تم لوگ اپنے ماسٹر کو کیوں نہیں کھلاتے---؟"

"اگر تمہارے ماسٹر نے کھانے سے انکار کردیا تو پھر ہمارے ماسٹر کو کھلا دینا۔"

فیصلہ ہو جاتا، مگر ہوتا وہی جس کا عمو کو پہلے سے یقین تھا۔

بے حد مشکور ہو کر وہ پلیٹ چاٹنے تک پہنچ جاتے تو سب بچے صحن میں جمع ہو کر تالیاں پیٹنے لگتے۔

"اے ہے۔ عمو د۔کھیا ___ ہا ہا---" وہ سب حرامی اپنے اپنے آنٹ باندھ کر اس کی پرچھائیں سے بھی بچتے پھرتے تھے۔ یوں برادری باہر کیے جانے پر اسے اپنے دل کے داغوں میں ہزاروں "سرو چراغ" جلتے نظر آتے تھے۔

اپنی فریاد لے کر وہ اماں اور دادی کے پاس جاتی اور یہاں بھی شنوائی نہ ہوتی تو پھر سپریم کورٹ۔ لیکن ہر وقت چنگھاڑنے اور دھاڑنے والے ابا بھی اس کی بپتا سن کر ہنس پڑتے۔

"بکنے دو انہیں۔" وہ معمولی سی بات سمجھ کر ٹال جاتے۔

"یہ سالے تو نہ خود پڑھیں گے اور نہ دوسروں کو پڑھنے دیں گے۔ ذرا تم اپنی کتاب تو لاؤ۔ دیکھیں کتنے سبق پڑھ لیے۔"

"عمو، خ سے خر بوزہ والا سبق سناؤ---" وہ سب ماسٹر صاحب والے انداز سے تھوک نگل کر کہتے۔

یا اللہ تیرے لاچار بندوں کا انصاف بھی کسی عدالت میں ہے۔ مگر جو دل سے پکارے اس کی تو اللہ میاں بطور خاص سنتے ہیں؟ اس کی درخواست وصول ہوتے ہی قبول کرلی جاتی ہے۔ کیونکہ وہاں نہ تو اچھن بنجمن کے سے فسادی ہیں نہ اماں کے سے عین وقت پر جھانسہ دینے والے وکیل۔ اور نہ ابا کا سا نا انصاف جج۔

ایک دن بھائی جان اور رشو آپا نے اپنے دوستوں کو بھی یہ تماشا دکھانے کی دعوت

دی اور نہ جانے کیا گھاس پھوس کا حلوہ بنا کر ماسٹر صاحب کو کھلا دیا۔

پھر تو انہیں اتنی کھانسی اٹھی۔ اتنی چھینکیں آئیں کہ عمو کا پورا سبق بلغم سے چھپ گیا اور اس کے بال تھوک سے گیلے ہوگئے آخر وہ تیورا کے گر پڑے۔

رشو آپا اور ان کی سہیلیوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔

وہ سہمی ہوئی فاختہ کی طرح ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ جب کبھی بچے ماسٹر صاحب کو چڑا کے بھاگ جاتے تو سزا عمو کو ہی بھگتنا پڑتی۔

آخری کسی نوکر نے دادی کو اطلاع کر دی۔ انہوں نے گرم پانی میں نمک ڈال کے پلایا' اپنی پٹاری میں سے جانے کون کون سی معجونیں اور سفوف کھلائے' تب کہیں ماسٹر صاحب کو ہوش آیا۔

عمو کو تو بالکل ویسی ہی مسرت ہوئی' جو اماں کو اس وقت ہوا کرتی' جب بار بار منع کرنے کے باوجود عمو چھلانگ لگاتے گر پڑتی تھی' مگر اس سے ضد کرنے میں اللہ میاں بھی اماں سے کیا کم تھے۔ کبھی جو اس کی التجاؤں پر کان دھرا ہو' حالانکہ اسے پوری امید تھی کہ اب تو الا بلا کھانے سے توبہ کرہی لیں گے' لیکن اس دن سے اچھن جو چیز لا کر دیتا وہ بڑے اشتیاق سے لے کر رکھ لیتے' پھر اماں کو دروازے کی آڑ میں بلوا کر اس کے بھیجے جانے کی تصدیق کرا لیتے تھے۔

اب کسی کو کیا غرض پڑی تھی کہ جو یوں مہر توڑے کا خاصہ لا کر پیش کرتا۔

ہفتے گزر جاتے---- ماسٹر صاحب کی نگاہیں اندر والے دروازے سے ہٹنے کا نام نہ لیتیں۔ موہن جا---- چار آم لا---- پڑھتے پڑھتے عمو کو موہن کے بہرے پن پر غصہ آنے لگتا۔ بچے اب دوسرے کھیلوں میں پڑ گئے تھے۔ اس دن دادی نے جو ابا سے شکایت کرکے ابا سے رشو آپا اور بھائی جان پر ڈانٹ پڑوائی تو ان کی توجہ بھی بٹ گئی۔

بھرے ساون کی جھڑی لگی تھی۔ سامنے والے میراثیوں کے کچے گھر پکی جامنوں کی طرح ٹپا ٹپ گر رہے تھے۔ مکھیوں کی وہ بہتات جیسے کمبھ کا میلہ ہو رہا ہو۔

اندر والے دالان میں زیادہ سے زیادہ آم کھانے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ اتنے میں کریمن نے آکر سنایا کہ اس وقت مسجد کے دالان میں محلے کے دو آدمیوں کی لاشیں رکھی ہیں اور رات سے اس کی پڑوسن کو بھی ہیضہ ہو گیا ہے۔

"اللہ خیر کرے۔ بڑے زور کی بری بیماری پھیل رہی ہے۔" دادی گھبرا گئیں۔

ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے آم سب نے خوف زدہ ہو کر چھوڑ دیے۔

"زیادہ روٹی کھانے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔؟" اچھن نے خوف اور تعجب کے ملے جلے لہجے میں بھائی جان سے پوچھا۔

"زیادہ کھانے سے ہی تو کالرا ہوتا ہے۔ یہ جو تم لوگ مکھیاں بھنکتی ہوئی مٹھائیاں کھاتے ہو نا! بس یہ کالرا کی جڑ ہیں۔" عمو اس خوفناک بیماری سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئی۔ مگر شام کے وقت اپنے ماسٹر کے ذکر پر وہ گڑیا کو کپڑے بدلاتے میں رک گئی۔

بھائی جان کا خیال تھا اس کے ماسٹر سات آٹھ روٹیوں سے زیادہ نہیں کھا سکتے اور رشو آپا دس روٹیاں کھلانے کے دعوے پر سختی سے اڑی ہوئی تھیں، اور دادا کی برسی کے دن میچ مقرر تھا۔ ہارنے والا فریق "سمسن اینڈ ڈلیلا" دکھائے گا۔

یوں ہی آموختہ یاد کیے بغیر جامنیں کھاتے میں عمو کو یاد آیا کہ آج کل زیادہ کھانے سے کالرا ہو رہا ہے۔ ایک لمحہ کو اس کے سامنے بجلی سی لہرائی اور اس کے نصیبوں کی سیاہی میں چھپ گئی۔

مگر کوشش کرنا انسان کی فطرت ہے، سو اس نے بھی ماسٹر صاحب کو اماں کی طرف سے دعوت نامہ پہنچاتے ہی تیاریاں شروع کر دیں۔

چپکے سے نعمت خانے میں پڑی ہوئی مدتوں کی وہ ٹکیاں اٹھا کر محفوظ کر لیں جن پر مکھیوں کی کئی نسلیں پروان چڑھی تھیں اور اماں انہیں ہمیشہ کوڑے میں پھکوانا بھول جاتی تھیں۔

آج وہ خلاف عادت سب کے ساتھ مل کر سڑی بسی چیزیں جمع کرتی پھر رہی تھی۔ سب کے قہقہوں میں برابر کی شریک ہوتی رہی۔ اسے خود اپنی مسرت پر حیرانی ہو رہی تھی۔ ابھی جو ماسٹر صاحب آجائیں گے تو پھر یہ ہنسی، چوری چھپے ملنے والے محبوب کی طرح نہ جانے کدھر کھسک جائے گی۔

ادھر اچھن ججمن اور رشو آپا، اماں سے چھپ چھپ کر روٹیوں کا اسٹاک کر رہے تھے۔ بھائی جان نے فقیروں کو بانٹتے میں ایک روٹی اڑا لی۔ جیسے ہی دادی نے آنکھیں پونچھنے کے لیے عینک اتاری اچھن دو روٹیوں کے ساتھ چار آم بھی لے بھاگا۔ دو روٹیاں رشو آپا نے پہلے ہی ردی کی ٹوکری میں چھپا رکھی تھیں۔

ماسٹر صاحب چار بجے کے آئے بیٹھے تھے مگر رمضان کی وجہ سے سب کو مغرب کا

انتظار تھا۔

بے زار ہو کر انہوں نے عمو کو یوں اگلا پچھلا سبق یاد دلانے کی ٹھانی کہ سبق کے ساتھ ساتھ عمو کی نگاہوں میں اپنی چھٹی کا ہنگامہ بھی ذرا ذرا گھومنے لگا۔

ہر ملن کی بیلا آگئی اور ان کی آنکھوں میں سچے موتیوں کی جلا بڑھ گئی۔

"آج تو آپ کی ماں نے خوب کھانا بھیجا ہے۔" کھانا دیکھ کر وہ خوشی کے مارے مونچھ کا سرا منہ میں لے جانے والے تھے، مگر روزے میں ابھی چند سیکنڈ کاٹنا ہوں گے۔

"ماسٹر صاحب، آج تکلف سے کام نہیں چلے گا۔" بھائی جان کرسی کھینچ کر یوں بیٹھ گئے کہ بے ایمانی کا ذرا بھی اندیشہ نہ رہے۔

"اللہ تعالیٰ آپ کا اقبال بلند رکھے۔" وہ خلاف توقع آبدیدہ سے ہو گئے۔

رشو آپا نے فکر مند ہو کے بھائی جان کو دیکھا۔ کہیں وہ کھانا سمیٹ کر گھر کو نہ چل دیں۔

"اگر ضرورت ہو تو گھر لے جانے کے لیے اور کھانا منگوا لیجیے گا۔" کھیل بگڑتے دیکھ کر بھائی جان نے اطمینان دلانا چاہا۔

"نہیں، میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" شاید پہلی بار وہ کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔

"میں بیوی بچوں والا ہوں میاں۔ اتنی محنت کرنے پر بھی میرے بیوی بچے آدھا پیٹ کھاتے ہیں اور میں اللہ کے آسرے پر زندہ رہتا ہوں۔ اپنے گھر کی بات کیا بتاؤں صاحبزادے میاں آپ کو، میری بیوی تو یہ سمجھنے لگی ہے جیسے میں واقعی روٹی کھائے بغیر زندہ رہتا ہوں۔" اس وقت میر انیس کا مرثیہ بہت پردرد ہو گیا تھا، جیسے اس کے ساتھ ہزاروں لوگ بین کر رہے ہوں۔

"پھر میں کہاں تک ان سب کا خیال کیے جاؤں ——" ایک بار پھر مونچھ کا سرا منہ میں جاتے جاتے بچ گیا۔

جتنی دیر انہوں نے کھایا۔ بھائی جان بڑی مستعدی سے ٹہلتے رہے۔ جیسے پارلیمان کی نشست کا مقابلہ ہو۔

آٹھویں روٹی کے بعد بار بار ان کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ بچے سرگوشیاں کرنے لگے اور رشو آپا یوں چوکنی ہو گئیں جیسے بھائی جان ان کے ووٹ اپنے بکس میں ڈلوا رہے ہوں۔

"اماں کہہ رہی ہیں آپ تکلف نہ کیجیے گا۔" رشو آپا نئی کمک پہنچاتیں۔

"اگر کچھ بچ جائے تو میں حفاظت سے رکھوا دوں گا۔ صبح کھا لیجیے گا ——" بھائی جان

بھی کیوں بیٹھے بٹھائے اپنے دس بارہ روپے گنوا دیتے۔

ماسٹر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر بیٹھے۔ پانی پی پی کر نوالے حلق سے اتارتے اور بڑی کھینچا تانی کے بعد وہ وقت آیا جب ٹینس کا لان بالکل صاف ہو چکا تھا۔

"آج تو اچھی طرح کھایا۔" وہ بوجھل سی آواز میں بولے' اور پے در پے ڈکاروں کے بعد اللہ کا شکر ادا کرتے چلے گئے۔ عمو کو سخت مایوسی ہوئی۔ یعنی ان کا پیٹ تو پھر بھی نہ بھر سکا۔

پھر تو بھائی جان کی حالت بھی ہارے ہوئے لیڈر کی سی ہوگئی۔ صاف اپنے وعدوں سے مکرنے لگے۔ دوسرں پر الٹے سیدھے بے ایمانی کے الزام۔

"ان کا پیٹ تو بھر چکا تھا' صرف ہوس میں کھا گئے۔" مگر پبلک کہاں بخشنے والی تھی۔۔۔!

دوسرے دن بھائی جان کالج سے واپس آئے تو ان کے خلاف نعروں کا طوفان اٹھ گیا۔ پچھلے سیاہ کارنامے برسر عام لانے کی دھمکیاں دی گئیں۔ بھائی جان بھی عوامی طاقت سے واقف تھے' آج نہیں تو کل پھر ان ہی سے کام آپڑنے کا سخت اندیشہ تھا' اس لیے فلم دکھانے پر راضی ہونا پڑا۔

عمو اس ہو حق سے الگ آموختہ میں جتی بیٹھی تھی۔

دنیا کے لوگ کیسی ہی موجیں اڑاتے پھریں' مگر اس کی قسمت میں تو صرف ہاتھی گھوڑوں کی تجارت لکھی تھی' جنہیں ہزار بار بیچنے پر بھی چین کی نیند نصیب نہ ہوتی۔

اب کوئی دم میں ماسٹر صاحب کی سیاہ داڑھی سیاہ گھٹاؤں کی طرح فضاؤں میں لہراتی نظر آئے گی اور عمو کے بال تھوک کی بوندوں میں بھیگنے لگیں گے۔

"آج تو چار موتیں اور ہوئی ہیں۔ وہ عمو بٹیا کا ماسٹر بھی مرگیا۔" کریمن نے سودے کا حساب اماں کو سمجھانے کے بعد بازار کی نیوز رپورٹ شروع کی۔

"اے ہے۔۔۔ سچ مچ۔۔۔! کیسے مرگیا۔۔۔؟" اماں نے پیسے گنتے میں پوچھا۔

"اونہہ' نیت خراب ہمیشہ کا' نگوڑا جانے کیا کھا پی گیا ہوگا۔"

کتاب پھینک کر سب کے فرمائشی قہقہے میں عمو نے بھی جی بھر کے حصہ لیا۔

ارے اتنی آسانی سے چھٹکارا پانے کی ترکیب اس کی سمجھ میں اب تک کیوں نہ آئی تھی۔۔۔؟

بہاروں کے بیچ

اختلاج کے مریض کی طرح پھڑ پھڑاتے ہوئے دل کا لیمپ بڑی دیر تک نزع میں رہنے کے بعد سہارا لے رہا تھا۔ تیزی سے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں بڈھے نے بڑی دیر سے رکی ہوئی آہوں کا اندھیرا اور ملا دیا --- ایک دم آسمان پر پے در پے کئی دھماکے ہوئے اور بجلی کی چمک نے اندھیرا زیادہ گہرا کر دیا۔

ٹھنڈے پتھروں پر بیٹھی ہوئی سندتا' ان چیخوں کو سننے لگی جو صرف اسی کو سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے کمرے سے باہر خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔ باہر مینہ کی بوندوں میں ساری دنیا کے پردرد نوحے پگھل پگھل کر بہہ رہے تھے۔ اندر لیمپ کی نحیف اداس روشنی کیسی بھیانک لگ رہی تھی۔

بار بار وہ اضطرات میں پاؤں ہلانے لگی تو اس ک لمبی پرچھائیں چھت تک چھو آتی تھی۔

اس کی زندگی میں ایسی راتیں بہت کم آئی تھیں جب اس نے دوسروں کے دکھ کو اتنی شدت سے محسوس کیا ہو۔ اس کے اپنے دکھ ہی کیا کم تھے۔

دماغ میں ادھم مچاتے ہوئے خیالوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے الٹی ہتھیلیوں سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور مڑ کے اونگھتے ہوئے بڈھے کو دیکھنے لگی۔ وہ بالکل ساکت بیٹھا دیوار پر کوئی سنسنی خیز فلم دیکھ رہا تھا۔

"بابا---؟" گہرے سکوت میں سندتا کی دھیمی آواز بھی کمرے میں گونج گئی مگر بڈھے نے پلک بھی نہ جھپکائے۔

"بابا---" وہ تقریباً چیخ پڑی۔ تب بابا نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کیا ہے:۔"

"بابا ___ ہوا کتنے زور سے چل رہی ہے۔ جیسے کوئی طوفان آرہا ہو۔ جیسے یہ بجلی آج پھر ہم سے کچھ چھیننے والی ہے۔ یہ ہوا جب بھی چلتی ہے ہمارے سپنے اڑ جاتے ہیں۔ ہماری امیدیں بکھر جاتی ہیں۔ اس ہوا کو کیسے روکیں بابا---؟ تم بھی تو کچھ بولو۔ کوئی بولتا کیوں نہیں۔ کیا سب مر گئے--- سب تھک گئے---"

وہ چاہتی تھی بڈھا بھی اپنے دل سے ہر امید کو نکال پھینکے صرف ایک بیٹے کی موت

پر اپنے آپ کو دنیا کا سب سے مظلوم اور بے سہارا انسان سمجھنا چھوڑ دے۔ سندتا کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھے۔

وہ اپنی کہانی سنانا چاہتی تھی، جو آج صبح سے اس کے دل میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس کی پر نم آنکھوں میں تھرک رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مچل رہی تھی۔ وہ بڈھے کو بتانا چاہتی تھی کہ کسی آس کے سہارے جینا فضول ہے۔ دنیا میں اب کہیں ہنسی باقی نہیں ہے۔ خوشیوں کی چتا کو سندتا اپنے ہاتھ سے آگ لگا چکی ہے۔ اب کسی کے آنگن میں کلیاں نہیں کھلیں گی کیونکہ آنے والی بہار لٹ چکی ہے۔ مگر بڈھے نے مختصر سا جواب دے دیا:۔۔

"ڈر لگ رہا ہے تو دروازہ بند کر لو دیوی جی۔"

"اونہہ" دروازہ بند کرنے کے بعد تو وہ اور بھی گھبرائے گی۔ دروازہ کھلا ہوا ہو تو جھوٹی تسلی کے کتنے ہی سامان مل جاتے ہیں۔ ادھورے ادھورے خیال اندر گھس آتے، یوں لگتا جیسے کوئی ابھی ننھے ننھے پاؤں رکھتا اندر آئے گا اور اس کی چھاتی سے چمٹ جائے گا۔ وہ ننگے پیروں سے بستر پر چڑھنے کی وجہ سے راج لنگم کو ڈانٹ دے گی۔ ابھی اٹھ کر اسے دودھ گرم کرنا پڑے گا۔ پھر وہ راج لنگم کو سلا کر لحاف اوڑھا دے گی، اور اٹھ کر اپنے شوہر کے پاس چلی آئے گی جو آرام کرسی پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا ہے یا پھر ابھی تک باہر سے واپس نہیں آیا۔

بستر پر بیٹھی نیند کے جھونکوں کو روکے وہ دروازے کو گھور رہی ہے۔

نہ جانے کون دروازے تک آکر کو واپس چلا جاتا ہے۔۔۔ جیسے کسی نے دہلیز پر قدم رکھا۔ گھسی ہوئی ایڑی اور بغیر پالش کو بوٹ بار بار چوکھٹ پر نظر آتا۔

غیر ارادی طور پر اس کی نظریں میز کے نیچے چلی گئیں، جہاں گھسی ہوئی ایڑیوں کے بد رونق جوتے ایک دوسرے پر پڑے ہوئے تھے۔ اس کے قریب ہی ڈبے میں ننھے ننھے سے بے بی شوز رکھے ہوئے تھے۔ اس نے اوپر ٹنگے ہوئے جیکٹ، بنیان، قمیصیں اور کوٹ دیکھے۔ میز پر کتابوں اور کاغذوں کے بے ترتیب ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ آدھ جلی سگریٹ اور جلی ہوئی دیا سلائیاں، چینی اور مٹی کے ٹوٹے پھوٹے کھلونے۔۔۔ آج تک یہ سب چیزیں یوں پڑی ہوئی تھیں۔ سندتا اس کمرے کو بہت کم کھولتی تھی۔

جدھر نظر ڈالو دیواروں پر کوئلے سے، پنسل سے اور رنگین چاک سے غلط سلط لکھا ہوا راج لنگم کا نام نظر آتا تھا۔ "میں راج لنگم ریڈی ہوں۔" "میں اپنی ماں سے کبھی

نہیں روٹھتا" "میں راہی بھٹکنے والا ہوں" "آج میں نے مکئی کا ایک دانا بویا ہے۔ 28 تاریخ راج لنگم ریڈی بقلم خود۔۔۔" اسی نے تلگو میں لکھا تھا

زندگی کتنی غیر اہم ہے۔ کتنی معمولی سی۔ اس مٹی کے پتلے کے مقابلے میں راج لنگم کتنا حقیر تھا' جو ابھی تک اپنی ماں کی گود میں مسکرا رہا ہے۔ اور سندتا کے ہاتھ خالی ہیں۔ اس کا بستر خالی ہے اور اس کی زندگی میں بھیانک خلا' پھیلی ہوئی ہے۔

آنکھیں بند کر کے وہ اپنے اچھلتے ہوئے دل کو تھام کر بیٹھ گئی۔

نہ جانے کیوں وہ صبح اسکول جاتے وقت چوراہے پر ٹھٹک گئی تھی۔ اب کئی دن تک یہ بڈھے بڑھیا اس کے ظاہری آرام کو تہہ و بالا کیے رہیں گے۔

اسکول سے گھر تک کے فاصلے میں اس راستے کی دلچسپیوں سے کوئی سروکار نہ ہوتا۔ اس کا دماغ کبھی اس کے جسم کے ساتھ نہ چلتا تھا۔ مگر آج صبح جب وہ اپنے گھر سے ذرا ہی دور سلطان بازار کے چوراہے پر آئی تو ایک ہجوم کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔

کوئی موٹر نشین ایک عورت کو کچل کے فرار ہو چکا تھا۔ اب سڑک کے کنارے بے ہوش پڑی ہوئی عورت کے پاس بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ جدھر موٹر چلی گئی تھی ادھر منہ کر کے خوب گالیاں دی جا رہی تھیں۔ کچھ پولیس والے بھی دوڑے ہوئے آئے مگر زخمی عورت کے پاس بیٹھے ہوئے' فقیروں کی صورت بڈھے بڑھیا کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے واپس چلے گئے۔

مجمع میں سے کسی تجربہ کار عورت نے سب کی معلومات میں مزید اضافہ کیا کہ اس عورت کے بچہ ہونے والا ہے۔ سندتا اپنی چھتری کو بند کر کے آگے بڑھی اور بے ہوش عورت کی نبض ٹٹولنے لگی۔ اسے کہیں اندرونی چوٹ آئی تھی۔ اس کے سیاہ فام لاغر جسم پر کپڑوں کی دھجیاں بکھر گئی تھیں اور اس کا بڑھا ہوا پیٹ بالکل ننگا تھا۔

زخمی عورت سے زیادہ قابل رحم بڈھے بڑھیا تھے۔ بڈھا تو یوں کانپ رہا تھا جیسے وہی موٹر کے نیچے آ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے مگر چہرے پر ایسی دل ہلا دینے والی بے بسی تھی کہ اپنے ضبط پر ناز کرنے والی سندتا کے دل سے بھی چیخیں اٹھ کر لبوں پر آ گئیں۔ آپ ہی آپ چھلک پڑنے والے آنسو چھپانے کے لیے وہ اپنے بیگ میں گوگلز ڈھونڈنے لگی۔

بڑھیا کے جسم پر بھی کپڑوں کی دھجیاں لپٹی ہوئی تھیں مگر وہ اپنا پھٹا ہوا پلو ڈال کر

بے ہوش عورت کے برہنہ پیٹ کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اسے فوراً ہاسپٹل بھیجو۔ کیس بہت خطرناک ہے---" میڈیکل کالج کے ایک طالب علم نے دور ہی سے ناک پر رومال رکھ کر مشورہ دیا اور لوگ تماشے کو غیر دلچسپ پا کر اپنی اپنی راہ پر چلے گئے۔

پھر سندتا نے دو رکشائیں بلوائیں۔ ایک میں بے ہوش عورت کو ڈال کے بڑھیا کو بٹھایا اور دوسری میں بڈھے کے ساتھ خود بیٹھی۔

بڈھے کے قریب بیٹھ کر اس نے محسوس کیا کہ کبھی وہ بہت تندرست و توانا ہوگا۔ اس کے ہاتھوں کی سختی بتا رہی تھی کہ یہ ہاتھ زمین کے سینے کو چیر کے ہیرا نکالتے ہیں۔ اس کے چہرے کی سختی میں زمانے کے تھپیڑوں کے نشان تھے۔

عورت کو ہاسپٹل میں داخل کرکے سندتا ان دونوں کو گھر لے آئی۔ اپنے جیسے بے آسرا لوگوں سے مل کر' ان کے دکھ درد سن کر' اس کے من کو بڑی شانتی ملتی تھی۔ مگر سندتا کے اصرار پر بھی انہوں نے اپنے متعلق کچھ نہ بتایا۔ بڈھا تو شاید اس صدمے سے دماغی توازن ہی کھو چکا تھا۔ اسے ایک ہی فکر لگی تھی کہ اس کی بہو ہنسی خوشی اس کے پوتے کو جنم دے۔ بڑھیا اپنی مصیبت سناتے ہوئے ڈرتی تھی۔

"ہم بڑی مصیبتوں سے بچ کر شہر آئے ہیں۔ ہم نے کوئی قصور نہیں کیا۔ ہمارے بیٹے نے بھی کوئی خطا نہیں کی تھی۔ نہ معلوم اسے کیوں مار ڈالا۔ کیوں ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا---؟"

آگے پوچھنے کی سندتا نے ضرورت بھی نہ سمجھی۔ وہ خود دن میں ہزار بار اپنے دل سے یہ سوال کرتی تھی۔ ان دنوں بہت سے کسان جان بچانے کے لیے شہر بھاگ آتے تھے۔ مگر شہر کی سڑکوں پر بھیک مانگنے کے اصول سے واقف نہ ہوتے' اس لیے جیل بھیج دیے جاتے۔

ان لوگوں کو دیکھ کر سندتا کا دل ڈوب جاتا تھا۔ رتنم کی قربانی بے کار معلوم ہوتی۔ زندگی بھر سب کا پیٹ بھرنے والے بوڑھے کسانوں کو ایک ایک دانے کے لیے ہاتھ پھیلاتے دیکھ کر اس کی نگاہیں جھک جاتیں۔ آنکھیں چرا کے وہ جلدی سے آگے بڑھ جاتی۔ کون سی امید کے سہارے جینا چاہئے۔ رتنم کے آدرش کو وہ کیسے پورا کر سکتی ہے---؟

انہیں گھر میں بٹھا کر اس نے پیتل کے دو تھالوں میں چاول اور جھینگوں کی کڑھی

نکالی اور اپنے مہمانوں کے سامنے رکھ دی۔ پھر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ انہیں پرنام کرکے اسکول چلی گئی۔

مگر راستے میں اسے احساس ہوا کہ ان ستم رسیدہ لوگوں کے سامنے اسے مسکراتا نہیں چاہئے تھا۔ ان کے دکھی چہروں کو دیکھ کر کسی کے چہرے پر مسکراہٹ کا باقی رہنا کتنے شرم کی بات ہے۔ اگر غور سے دیکھا جاتا تو سندتا کا سارا وجود اس ہمدردی اور خلوص، اس کی فراخ دلی اور ملنسار طبیعت کی ساری خوبیاں اس مسکراہٹ سے جلا پاتی تھیں۔ اور آج بھی جب اپنی پچھلی عادتوں کو وہ بھلا چکی تھی اس کے چہرے کا تبسم زندہ تھا۔

بچپن سے ہی سندتا نے جس سہارے کو پکڑنا چاہا وہ ہاتھوں سے نکل بھاگا۔ اپنی پینتیس سال کی زندگی میں وہ کتنی بار ہاتھ پھیلا کر کسی مضبوط سہارے کو ڈھونڈ چکی تھی۔ بالکل ان بچوں کی طرح جو آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے ساتھیوں کو پکڑنے دوڑتے ہیں۔ مگر ہر بار وہ کسی کھائی میں جا گری، کسی درخت سے ٹکرا گئی، اور وہ سب دور دور کھڑے اس کی بے بسی پر تالیاں بجاتے رہے۔ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں آ آکر نکل گئے۔

پرانی املی کے پیڑ تلے جب وہ اپنی ننھی ننھی سہیلیوں کے ساتھ گڑیا کا بیاہ رچایا کرتی تھی تو ایک ٹین کے ڈبے کا ڈھول بجایا جاتا اور وہ سب کے ساتھ مل کر گاتی تھی:۔

"میرے آنگن میں امیدوں کا پیڑ ہے۔"

اپنی ماں سے سنے ہوئے ادھورے ادھورے سے گیت جنہیں وہ اسی وقت سے سچ سمجھنے لگی تھی۔ کھیل کھیل میں اس نے نہ جانے کتنی امیدوں کے بیج اپنے من آنگن میں بو دیئے تھے۔ مگر ساتویں برس ہی اسے اپنی ماں کی موت پر رونا پڑا۔ جب وہ اپنی چچی کے پاس آگئی تب بھی کسی نے نہ جانا کہ اس کے سپنوں کے پیڑ اس کی عمر سے بھی لمبے ہو رہے ہیں، جنہیں چچی کے ظلم و ستم بھی نہ کاٹ سکے۔ اس وقت وہ اپنی محبت کو کانٹوں بھری پگڈنڈی سمجھتی تھی۔ ان دونوں نے طے کیا تھا کہ مل کر اپنی راہ کے کانٹے صاف کریں گے۔ پھر پانچ سال کی جدوجہد کے بعد چچا نے اس کا ہاتھ رتنم کے ہاتھ میں تھما دیا، جو چچی کے خیال میں بالکل نکھٹو اور آوارہ تھا۔ مگر سندتا کی زندگی کا وہ سچا ساتھی بنا۔ انہیں کبھی اطمینان کی زندگی بسر کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی رتنم سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتا تھا۔ گاؤں گاؤں پھرتا۔ شادی کے بعد انہوں نے بڑی تنگ دستی میں دن گزارے۔ وہ گھنٹوں سندتا کو سمجھاتا

تھا کہ زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے کتنا کام کرنا ہے۔ کبھی وہ دو چار دن گھر میں رہا۔ کسی نوکری کو سال بھر سے زیادہ نہ چلایا۔ اس کی الجھی ہوئی خطرناک باتیں سندتا کے دماغ میں نہ دھنس پاتی تھیں۔ جب وہ ڈرنے لگتی تو رتنم خفا ہو جاتا تھا۔

"پگلی اگر میں آج مر بھی جاؤں تو اس کے لیے تمہیں تیار رہنا چاہئے۔ تمہاری یہ مسکراہٹ زندہ ہے تو میں سات بار جنم لوں گا۔"

جب سندتا تخیل کی وادیوں میں بھٹک رہی تھی گو ایک دن وہ اتنی دور نکل گیا کہ پھر واپس نہ آسکا۔ رتنم کی موت بھی ایک خطا بن گئی اور مہینوں سندتا کو پولیس کی اذیتیں سہنا پڑیں۔ ان تکلیفوں نے سندتا کے چہرے پر شکنیں ڈال دیں' آنکھوں پر عینک آگئی اور قلب نے دھڑکنے کی بجائے بے قابو گھوڑے کی طرح دولتیاں جھاڑنا شروع کردیں۔

مگر اس کی دائمی مسکراہٹ باقی رہی۔ آخری سہارا راج لنگم جو تھا۔ لنگم کو دیکھ کر وہ اپنی شکست کا احساس بھول جاتی تھی۔ وہ ایک معمولی سے اسکول میں نوکر ہوگئی اور زندگی میں پھر ترتیب نظر آنے لگی۔

اس نے اپنے لیے بہت سی دل چسپیاں ڈھونڈ لیں۔ اپنے پڑوسیوں کے دکھ میں شریک ہوتی۔ لڑکیوں کو سینا پرونا سکھاتی۔ بڑی بوڑھیوں کو گیتا کے پاٹ سناتی اور سارے محلے کے بچوں کو آنگن میں جمع کر کے راج لنگم کو بٹھا دیتی تھی۔

"میرے آنگن میں امیدوں کا پیڑ ہے۔"

پہلے تو بچے اسے گاتے دیکھ کر ہنسنے لگتے۔ پھر سب مل کر گاتے اور گانا چھوڑ کر جب سندتا رونا شروع کردیتی تو لنگم کے کھلونے پھینک پھانک کر بچے بھاگ جاتے تھے۔

محلے کا ہر بڑا چھوٹا آدمی اسے چنما (خالہ) پکارتا تھا۔ محلے میں سب اس کی عزت کرتے۔ وہ ہندو اور مسلمانوں سے لے کر بستی کے جھونپڑیوں والوں تک میں مقبول تھی۔ سب کے آڑے وقتوں میں کام آتی۔ ہر ایک کا دکھ درد بٹاتی پھرتی۔

اس کا چھوٹا سا صاف ستھرا گھر ہر وقت عورتوں' مردوں اور بچوں سے بھرا رہتا۔ اس کے محلے میں اس کے بہت سے ہمدرد تھے۔

پھر ایک بار اس کی خوشی کا دشمن کالرا گھر گھر سندتا کو ڈھونڈتا پھرا۔۔۔

اور جب وہ لنگم کی چتا کو آگ دکھا کر آئی تو کسی کو اس کے بچنے کی امید نہ تھی۔ محلے کی عورتیں مہینوں اس کی نبض پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہیں۔ بہت دنوں تک اسے اپنے گھر

کے درودیوار سے دھواں اٹھتا نظر آیا اور چاروں طرف لاشیں جلنے کی بو پھیلی رہی۔

اب اس کے دروازے پر ہر روز لہرانے والے آم کے ہرے پتے سوکھ جاتے تھے۔
آنگن گوبر کے چھڑکاؤ اور چونے کی دھاریوں سے بنائی ہوئی بیل بوٹیوں سے محروم ہوگیا۔
دیوار پر لگی ہوئی اس کے شوہر کے پسندیدہ مصنفوں کی تصویروں پر گرد جم گئی اور آنگن میں لگے ہوئے پھولوں کے پودے مرجھانے لگے۔

اسکول سے واپس آکر وہ اپنا سارا وقت پڑوسیوں کے ہاں گزار آتی یا زبردستی کسی کو اپنے ہاں ٹھہرا لیتی تھی۔ ایک وقت کا پکا ہوا کھانا کئی کئی وقت چلتا۔ شام ہوتے ہی دروازہ بند کرکے وہ اپنے شوہر کی کتابیں پڑھنے لگتی۔ ان کتابوں کی باتوں پر کبھی اسے یقین آتا اور کبھی پریشانیاں زیادہ بڑھ جاتیں۔

آج ان بوڑھوں نے آکر پھر اس کے سکون کو درہم برہم کردیا تھا۔

صبح وہ دیر سے اسکول پہنچی اور پڑھاتے وقت خلاف معمول بچوں کے ساتھ بہت سختی سے پیش آئی۔ امتحانوں کی وجہ سے اسکول میں کام بڑھ گیا تھا۔ جب وہ گھر لوٹ رہی تھی تو سڑکوں پر روشنیاں جاگ چکی تھیں لیکن اس کے دل کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ ہوا میں تیزی تھی اور آسمان کے کناروں سے سیاہ بادل اٹھ رہے تھے۔

گھر میں وہ داخل ہوئی تو بالکل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس کی آہٹ سن کر جلدی سے بڈھے نے اس کا نام پوچھا اور پھر کہیں تاریکی میں ڈوب گیا۔

لیمپ روشن کرنے کے بعد سندتا کی نگاہ سب سے پہلے کھانے کے تھالوں پر گئی، جو ابھی تک ویسے ہی رکھے ہوئے تھے۔ بڈھا ایک کونے میں بیٹھا ابھی تک دیوار پر ہونے والی کوئی کہانی دیکھے جا رہا تھا اور سندتا کے دل میں آسمان کے طوفان سے بھی بڑا طوفان بپھر رہا تھا۔

اس سکوت سے بارش کے شور سے اور بڈھے کی خاموشی سے وہ سہمی جارہی تھی۔
ایک بار بجلی کی کڑک سے سندتا کو ڈرتے دیکھ کر رتنم نے کہا تھا:
"طوفانوں سے مت گھبراؤ سندتا۔ یہ ہماری زندگی میں کوئی نہ کوئی نئی خبر لاتے ہیں۔"

مگر ان طوفانوں میں سندتا پر ہمیشہ بجلی گری۔ پھر آج ان بڈھے بڑھیا کا کیا ہوگا!
ایک نامعلوم خوف اس کے چاروں طرف منڈلا رہا تھا۔

اس سے تو بہتر تھا کہ بڑھیا اپنی بہو کو خیریت پوچھنے ہی نہ جاتی۔ وہ تینوں رات بھر جاگ کر ایک دوسرے کو اپنی کہانی سناتے اور یہ خوف ناک رات اپنی ساری ہولناکیاں لیے کھسیا جاتی۔ پھر کسی نے دروازہ کھولا اور وہ کانپ اٹھی۔

بارش میں بھیگی ہوئی بڑھیا اندر آئی۔ ہڑبڑا کے بابا نے اٹھنے کی کوشش کی اور مایوس ہو کر بڑھیا کی سسکیوں سے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ ان کی بہو مر گئی۔ دانتوں میں ہونٹ دبا کے سندتا نے اپنی چیخیں روک لیں۔ ہلکی سی آہ کے ساتھ بڑھیا کپڑوں سے قطرے ٹپکاتی بیٹھ گئی۔ بابا اب باقاعدہ رونے لگا۔

"تو اس کی لاش کیوں چھوڑ آئی۔ اس کے پاس ہماری زندگی کا سہارا تھا۔ ہمارے کھیتوں کا بیج۔"

"اب انہیں کچھ نہ ملے گا۔" بڑھیا اطمینان سے بولی۔

"سیتا کی امانت تو میں لے آئی ہوں۔" اس نے اپنی پھٹی ہوئی دھوتی کا پلو ہٹایا۔ سرخ گوشت کا لجلجا سا لوتھڑا اس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔

"اوہ---" مسرت سے چیخ مار کے بڈھا بچے کی طرف جھپٹا۔ پھر ایک ننھے بچے کی نازک سی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ سندتا جلدی سے اٹھی اور لیمپ بچے کے نزدیک لے جا کر اسے دیکھنا چاہا مگر بابا نے اپنے ہاتھوں کی آڑ میں اسے چھپا لیا۔

"اسے مت دیکھو۔ کہیں لوگوں کو خبر نہ ہوجائے کہ سیتا ابھی زندہ ہے۔ ہم نہیں ہارے ہیں۔ ہمارے کھیتوں میں پھر بیج پڑے گا۔ پھر فصل اگے گی۔"

بچے کو سینے سے چمٹا کر اس نے بڑے آنند سے آنکھیں بند کرلیں۔

جب سندتا اپنے کمرے میں سونے کو گئی تو اس کی زبان پر خود بخود بچھڑا ہوا گیت آگیا۔

○

ایک انار

اطہر ایم۔اے کر کے علی گڑھ سے آ گیا۔

یہ خبر جس گھر پہنچی چراغ جلتے گئے۔

ڈپٹن نے ہیرے کے کنگن بنک سے نکلوا کر تسنیم کے ہاتھوں میں ڈال دیے۔ ایسی ہی چیزوں سے لوگ لینے دینے کا اندازہ کرتے ہیں۔ راحت کی خالہ نے ہر آنے جانے والے سے کہنا شروع کر دیا کہ ان کا لڑکا پاکستان میں پیش کار ہو گیا ہے۔ اچھی بی کی ماں نے دلہن بیگم سے دوپٹے منگوا بھیجے۔

"اے تکلیف کا ہے کی۔ اچھی بی تو دن بھر میں دوپٹہ کاڑھ پھینکتی ہے۔ اب تک منوں دوپٹے کاڑھ ڈالے۔ ہماری بیٹیوں میں تو انکار کی عادت ہی نہیں۔ سینا پرونا' کاڑھنا' پکانا سبھی کچھ جانتی ہیں۔ بس یہ آج کل والے بے حیائی کے ڈھنگ نہیں سکھائے۔"

"ہماری تو چاند ہے چاند۔" ثروت کی بہن نے اترا کے اطہر کی چھوٹی بہن نادرہ کو سنایا۔ "بالکل میموں جیسے ڈھنگ ہیں اس کے۔ پرسوں خالہ کو دیکھنے وہ فرنگن ڈاکٹرنی آئی تو کہہ رہی تھی یہ تمہاری بہن تو بالکل ہمارے دیس کی لگتی ہے۔ کمبخت کی آنکھوں میں خاک۔"

اور تو اور وہ خر سواروں والے واحد حسین کے ہاں بھی سنا تھا بڑی سرگرمی دکھائی دینے لگی ہے۔ اس خاندان کا نام خر سوار یوں پڑا کہ پیڑھیوں پہلے جب وہ لوگ بریلی آ کر آباد ہوئے گدھوں پر چڑھ کر آئے تھے۔ ویسے کہنے کو تو ڈپٹن کا خاندان بھی شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتا' لیکن وہ لوگ چڑی مار' کہلاتے تھے۔ شہر کے شرفا سے ان کا کوئی جوڑ نہ تھا۔ صرف اس لیے کہ ڈپٹی صاحب کے کوئی لکڑ دادا چڑیوں کا شکار کر کے بیچا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نئے فیشن کی لڑکیاں ڈپٹی صاحب کی کوٹھی یا نوکر چاکر ڈپٹن کا گھر کہہ لیں تو کہہ لیں' مگر دعوت مہمانیوں میں حجام ڈوم چڑی ماروں میں ڈولی لے جاتے۔ خر سواروں میں رشتے ناتے کبھی نہ ہوئے۔

لیکن پاکستان کیا بنا کہ اپنے ساتھ ساری روایتوں' اصولوں کو بیاہ کر لے گیا۔ لڑکے تو یوں غائب ہوئے کہ آنکھ میں سرمہ لگانے کو نہ ملتے۔ خود اطہر کے چچا اپنے لڑکوں سمیت پاکستان چلے گئے تھے اور اب چھوٹی کوٹھی میں شرنارتھی آن بسے تھے۔ خیر اطہر کی ماں دلہن

بیگم کو ایسی کوئی فکر نہ تھی۔ کیونکہ دونوں لڑکیاں چچا کے ہاں منگی ہوئی تھیں۔ لڑکے پاکستان میں نوکر ہوئے نہیں کہ بیاہ تیار سمجھو۔ لیکن ہر گھر میں تو ایسی حالت نہ تھی۔ صبح ہیں، شام دیکھو تو گھر ڈھنڈور کر کے پاکستان سدھارے۔ موت کی سی چٹاپٹی تھی۔ صرف وہی لوگ رہ گئے تھے جنھیں تھوڑی بہت جائیداد کا سہارا تھا۔ تھوڑے دنوں ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد سب ہی کی اونچی ناک جھکنے لگی۔

کچے کنواروں کو لے کر، ریگستان الانگنا، اللہ میاں کے پچھواڑے جائے گا۔۔۔؟

اندھیا کے اپنی بیٹیاں خر سواروں میں دے دیں۔ چڑی ماروں کی بہوئیں اتنا جہیز لائیں کہ بچے کھچے لڑکوں کی مائیں بھی اپنی آن پر قائم نہ رہ سکیں۔ یہ پاکستان نہ جانے کتنی پرانی روایتوں کو توڑ کے نئے رشتے استوار کر رہا تھا۔

ادھر پاکستان سے جس کا خط آئے دو چار نئی شادیوں کا ذکر سن لیجیے۔ وہ بھی یوں ہی بے جوڑ۔ کسی نے سندھی لڑکی سے بیاہ کر لیا تو کسی نے پنجابی لڑکے کو بیٹی دے دی۔ لوگ انگلیاں اٹھاتے اٹھاتے تھکے جا رہے تھے۔ جب سارے محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے نظر آئیں تو کس کس پر ہنسا جائے! محل والی نواب بیگم، لنگڑے وکیل کی بیوی نے تو اچھا خاصہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا دفتر کھول لیا تھا۔

محل کا سلیقہ اور زبان درازی تو مشہور ہی تھی۔ سوئی جیسی بات کا بھالا بنانا محل والیوں کا شیوہ رہا۔ بیبیاں اس گھرانے کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتیں۔ نو بڑے لوگ ___جس نے نہ سنی ہوں سو تالیاں، وہ دیکھے محل والیاں۔ پاکستان کے بننے سے بہت سی تتر بتر ہو گئیں۔ اب صرف نواب بیگم، محل کی مجاور بنی وضع داری نبھائے جا رہی تھیں۔ اپنی پانچوں لڑکیوں کو انھوں نے جو علی گڑھ بھیج کر پڑھایا، تو کچھ سوچا ہی ہو گا۔

کیا جانتی نہ تھیں کہ بریلی کے شریف خاندانوں میں ان سے رشتے ناتے کبھی نہ ہوئے۔

سات پشت سے محل والوں کی ذات میں کھوٹ چلی آرہی تھی۔ پھر لڑکیاں خوبصورت ہوں تو کیا۔ ایک سے ایک دیدہ پھٹی، بے پردہ۔ ہر محفل مجلس میں چاند سے چہرے لیے موجود، بیبیوں کے منہ پر چڑھ کر بیٹھنے کا ارمان۔ لوگ سوچ سوچ کر تھکے جاتے کہ ان کا ٹھکانہ کہاں لگے گا۔۔۔؟

مگر نواب بیگم بڑی چلتا پرزہ تھی۔ ایک تو اس نے محل کی دولت سے ٹھاٹ باٹ

خوب بنائے تھے۔ پھر اپنی لڑکیوں کی زبان میں رہ کر مردوں کی طرح شائستہ زبان بولنے لگی تھی۔ ادھیڑ عمر میں بھی سنگار پٹار کا شوق تھا۔ بیاہ براتوں میں تو ان کی ساڑی دیکھ کر بہت سی بے صبر بیبیاں منہ پر کہہ دیتی تھیں:۔

"اے نواب بیگم، تم تو بالکل پرد۔سن لگو ہو۔"

پھر جیسے ہی پرمٹ بننے لگے وہ دو چار مہینے کے لیے گئی اور ایک ایک لڑکی کا بیاہ کر آئی۔ جانے قصائی تھے یا کنجڑے، صرف اتنا سنا تھا کہ اس کی پانچوں داماد گز۔ٹڈ عہدہ دار تھے۔ نہ جانے اسے رجھانے کا کیسا گر آتا تھا کہ یوں چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو جاتا۔ اپنی پانچوں لڑکیوں کو نبٹا کر لنگڑے وکیل کی وکالت کے سہارے نواب بیگم چین کی بنسی بجایا کرتیں۔ مگر کمر ہمت ابھی تک کسی ہوئی تھی۔ شہر میں جتنے ناتے رشتے ہوتے ان کا معاملہ محل سے ہی طے کیا جاتا تھا۔ ہر گھر کی لڑکیاں لڑکے ان کی نظر میں تھے۔ ساتھ ہی ان کے اقتصادی حالات اور نسلی امتیازات بھی۔

جس تقریب میں نواب بیگم موجود ہوں وہاں ڈپٹن اور واحد حسین کی بیوی کی بھی بولتی بند ہو جاتی تھی۔ دلہن بیگم تو ہمیشہ کی منہ مری ٹھہریں۔ نواب بیگم نہ جانے کتنی لڑکیوں کی طرف سے تو ایجاب و قبول کے وقت اقرار کر چکی تھیں۔ کتنی دلہنوں کو سجایا اور کتنی بیبیوں کو اپنے ہاتھ سے کفن پہنایا۔

پھر غلط بات پر جتانا، دو فریقوں کو بھڑکا کے ثالث بننا، بچوں کو ڈانٹنا اور لڑکیوں کو نصیحت کرنے کا اسٹائل بھی کچھ نواب بیگم کو ہی آتا تھا۔

لڑکیوں کو ان سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ عینک کے شیشوں سے جب وہ لڑکیوں کی ٹولی کو گھورتیں تو دوپٹے منہ میں ٹھونسنے کے باوجود ہنسی نہ رکتی۔

ان کے جاتے ہی ایک دوسری کی خبر لی جاتی۔

"کون پھنسی۔۔۔؟"

"ارے اب ناہید کا وارنٹ نکلنے والا ہے۔ آج نواب بیگم اس پر بہت مہربان ہیں۔۔۔"

"یا بچاری حشو، دیکھیو اب نواب بیگم تجھ سے کیسا انتقام لیتی ہیں۔"

لڑکیوں کا وہ گروپ جو اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اب اسکول چھوڑ کر کالج بھی جانے لگا تھا نواب بیگم سے قطعی نہ دبتا۔ سر محفل میں ان کی چال ڈھال پر قہقہے لگائے

جاتے۔ ان کی غلط سلط' اردو انگریزی درست کی جاتی۔ ان کی نقل کرنے سے بھی لڑکیاں نہ چوکتیں۔ پھر تو نواب بیگم کو بھی نئی تعلیم پر افسوس ہوتا۔

"ہماری لڑکیاں بھی کالجوں میں پڑھ چکی ہیں۔ لیکن ایسی شتر بے مہار نہیں بنیں۔ پڑھنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا علم اور اخلاق بڑھے اور---" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر کہنا شروع کرتیں۔

"جی اچھا' معلوم ہوا۔"

"معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔"

"تقریر جاری رہے---" پھر وہ سب ہنستی ہوئی کوٹھے پر بھاگ جاتیں۔

ایسے میں اطہر علی گڑھ سے کیا آیا کہ ہر طرف کے شکاری مچھلی پھنسنے کا انتظار کرنے لگے۔

"تم نے کچھ سنا---؟" سب ایک دوسرے کی ٹوہ لیتے۔

کل خالدہ کو اس کی ماں خوب بنا سنوار کر دلہن بیگم کے ہاں لے گئی تھیں۔ سنا ہے خالدہ نے انگریزی میں خوب اطہر سے باتیں کیں۔ اور اب وہ خالدہ کو پڑھایا کرے گا۔"

"سچ مچ---؟" کسی کا یقین کرنے کو جی نہ چاہا۔

"وہ ماں بیٹی تو یوں ہی دلی میں رہ کر پردہ-سنوں کے ڈھنگ سیکھ گئی ہیں۔"

لیکن اس کے دوسرے معنی یہ بھی نکلتے تھے کہ اب لڑکیوں کو گھر میں بٹھائے رکھنا فضول ہے۔

"مگر آج کل کے لڑکے کھرے کھوٹے کو خوب پہچانتے ہیں۔" احمد علی حکیم کی ماں نے وظیفوں کی کتاب بند کر کے کہا۔ "دل بہلانے کو خالدہ ہو یا کوئی اور لونڈیا' مگر بیاہ کے وقت تو دلہن بیگم ہڈی پرکھیں گی۔"

"وہ زمانے لد گئے خالہ جب ہڈی پرکھی جاتی تھی۔" چاندی کا پاندان کھول کر ڈپٹن نے بھی بحث میں حصہ لیا۔

"اب تو لڑکے پیسے کے دیوانے ہیں۔ نوکریاں ملتی نہیں اور تجارت کو پیسہ چاہیے۔"

"ہاں بیوی سچ ہے۔ آج کل دنیا پیسہ دیکھے ہے۔" مجو کی دادی کسی کام سے آئی تو تمباکو کھانے کے بہانے بیبیوں کی پائنتی بیٹھ کر ہاں میں ہاں ملانے لگی۔

بیبیوں کی باتوں میں دخل دینے کا اسے حق تھا نہ استطاعت' مگر جب سب ایک ہی

ناؤ میں سوار ہوں تو اونچ نیچ کا سوال دب جاتا ہے۔ مجیا بھی سولہ برس کی سانڈ ہو گئی تھی۔ پر نصیبوں جلی کے بھاگوں اپنا گھروا بھی نہ تھا' جہاں ہر وقت دانت نکوسے مجیا کے منہ کو آگ لگاتی۔ جس دن سے مزدوری کرتے میں بیٹا چھت پر سے گر کے مرا' وہ مجیا کو سینے سے لگائے تیرے میرے گھر نوکری کرتی پھر رہی تھی۔ چھ برس ہوئے اطہر میاں کے ہاں روٹی پکاتے۔

یہ قدرے محفوظ جگہ تھی۔ دلہن بٹیا کی خود سیانی سیانی لڑکیا تھیں۔ میاں لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر ایک دن شکار کھیلنے گئے تو خود شکار ہو کے کسی شیر کے منہ میں جا بسے۔ لڑکا تھا تو اسے گھر سے زیادہ علی گڑھ بھا گیا تھا۔ سال میں دو مہینے کی چھٹی ملتی تو گھر کی بجائے دوسرے شہر گھومنے نکل جاتا۔ دلہن بٹیا خود اتنی نیک بخت تھیں کہ چاہے ہنڈیا بھونتے میں آدھی بوٹیاں اڑا لو' ڈھیروں پان چھالیہ نتنے میں سمیٹ کر پار کر دو' مگر کبھی شک نہ کیا۔ "دیکھ لیجو' اللہ میاں اس کے لیے موتیوں کا محل بنوائیں گے جنت میں۔"

اصل میں خاندان رئیسوں کا تھا۔ خود بھی صدر اعلیٰ کی بیٹی تھیں۔ ذات کی کھری۔ اس گئی گزری حالت پر بھی آن بان تھی۔ کھلا ہوا ہاتھ۔ مزاج دیکھو تو اللہ میاں کی گائے۔ کبھی نو بڑھوں کی طرح تین پانچ کیا اور نہ اپنی دولت کی بڑھانگی۔

بس یہیں پر آکے لوگ کہتے کہ نجیب الطرفینوں کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ نادرہ فاطمہ کو دیکھو تو کالج میں پڑھتیں مگر کبھی خالدہ اور تسنیم کی طرح فیشن کی کٹ پتلی نہ بنیں۔ لڑکا تھا تو انگوٹھی کا نگینہ۔ اخباروں رسالوں میں اس کے مضمون چھپتے - ریڈیو پر وہ بولتا۔ پھر دو چار دن کو آتا تو چھوٹے کمہار اور بیری والی نانی کا مزاج پوچھنا بھی نہ بھولتا۔

گھر میں نوکروں کی فوجیں پال رکھی تھیں دلہن بٹیا نے۔ اس پر بھی کسی کو شکایت نہ تھی۔ ڈپٹی کی ماماؤں کی طرح آج تک کسی نوکر نے دوسرے گھر میں جا کر ان کی لڑکیوں کے عیب کھولے نہ انھیں گالیاں دی۔ بڑی بی خود زمانے بھر کی لتری جھوٹی۔ مگر دلہن بٹیا کے نام پر جھولی پسار دعائیں دینے بیٹھ جاتیں۔

کئی بار دلہن بیگم نے لوگوں سے کہہ سن کر مجیا کے بھی پیغام لگائے' مگر وہ گل چھپے والا سپاہی بھی پانچ سو کا جہیز مانگتا تھا۔ اور تو اور مجیا نے سنا تو اطہر میاں کے جوتے پر پالش کرتے میں اس سپاہی کو ہزار گالیاں دے ڈالیں۔

"اری مردار چپ رہ' یہ تیرے کہنے کی باتیں نہیں۔" دال بگھارتے میں بڑی بی گھبرا

کے چیخیں۔

"تو کیوں آیا تھا وہ باگڑ بلا ـــــ ارے ہاں۔"

"وہ پولیس والا ہے۔ گالیاں دے گی تو جیل بھجوا دے گا۔ اطہر میاں نے اسے ڈرانا چاہا۔

"اے نج ـــ آکے تو دیکھے۔ اس کی مونچھوں میں لٹک جاؤں گی۔"

سب کی ہنسی میں بڑی بی دلہن بٹیا کو بے بسی سے دیکھتیں۔ انھوں نے مجیا کو اپنے طور پر سارے ڈھنگ سکھا ڈالے۔ خود بیٹھ کر قرآن شریف اور "بہشتی زیور" پڑھایا۔ اردو کی دو چار کتابیں بھی رٹا ڈالیں اور نجن بی سے کہہ کر سینا پرونا بھی سکھایا۔ مگر اس کی چمر رگ کیسے بدل دیتیں ـــ ہر بات کا جواب دینے کو تیار شرم و لحاظ تو دھو کر پی گئی تھی۔ دن بھر اچھل کود ہوتی۔ نادرہ کے اچھے بھلے غرارے دو دن میں دھجیاں ہو کے لٹکنے لگتے۔

مگر کوئی گھر میں آجائے تو خاطر تواضع کرنے میں فاطمہ سے بھی آگے۔ اس کے سلیقے تمیز کو دیکھ کر آنے والے لوگ کہتے کہ قاضی کے ہاں چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ سونے پر سہاگہ، نادرہ کے من کو وہ ایسی بھائی تھی کہ گھر میں کوئی مجیا کو ڈانٹے، نادرہ پشتی لینے کو تیار۔

"ارے سچ مچ۔ وہ حرامی مجیا کے لائق نہ تھا۔" دلہن بیگم نے قالین بچھے ہوئے تخت پر اپنا بھاری بھرکم جسم پھیلاتے ہوئے کہا۔

"نہ جانے کیوں بڑی بی اس کی فکر میں مری جا رہی ہیں۔ نادرہ سے بھی تو چھوٹی ہے کم بخت۔" بڑی بہن فاطمہ نے اطہر سے کارڈز کھیلتے میں کہا۔

یہ سن کر اطہر بہت خوش ہوا کہ چلو اس گھر میں بھی انسانی حقوق کا تحفظ ہو رہا ہے۔ کالج میں رہ کر ایم۔اے تو اس کی قسمت میں لکھا تھا سو آٹھ برس میں کر آیا۔ ویسے تو خشک سا فلاسفر بن کر رہ گیا تھا۔ دن بھر یہ موٹی موٹی کتابیں آنکھوں سے لگائے بیٹھا ہے۔ "جمہوریت اور انسانیت" "عورت کی سماجی قدریں" اور "انسانی ارتقاء میں انا کا وجود" جیسے خشک مضامین لکھتے لکھتے چونکتا تو ہر ایک کو موڈ بدلا ہوا نظر آتا۔ فاطمہ کی سہیلیوں کی نقلیں اتاری جا رہی ہیں۔ مرغی کی ٹوٹی ٹانگ پر تجربے ہو رہے ہیں۔ چھوٹی کوٹھی میں رہنے والے شرنار تھیوں سے ان کے لٹنے کی کہانیاں سن رہے ہیں۔ اور آگے بڑھے تو دلہن بیگم کے پاس آنے والی خواتین سے مذاق بھی فرما لیا جاتا۔

یوں کہنے کو تو اب اگلے سال فاطمہ بھی بی۔اے کر لے گی اور نادرہ کو ٹائیفائیڈ نہ ہو جاتا تو اب سیکنڈ ایئر میں آجاتی، مگر انھوں نے اپنے کالج میں اطہر بھائی جیسے لڑکے چھوڑ پروفیسر بھی نہ دیکھے تھے۔ اتنے بے حس کہ چھوٹی خالہ کی صلاح پر وہ اپنی سب ہی پسندیدہ ہستیوں کو گھیر گھار کے لائیں۔ انھوں نے گھنٹوں اطہر سے ہنسی مزاق کیا۔ اپنے پسندیدہ ایکٹروں اور رنگوں کے نام تک بتا گئیں۔ لیکن یہاں ہاتھ رکھو تو وہی سرد خانہ۔ کوئی میک اپ کا اشتہار لگی تو کوئی فلم کی ایکسٹرا گرل۔ کوئی جلی ہوئی دیا سلائی بھی تھی۔

سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ لیکن راحت کی خالہ کہاں تک صبر کیے جاتیں۔

انھیں اطہر کے پاس ہونے کی بے حد خوشی ہوئی اور اس بہانے دلہن بیگم کے سب گھر والوں کی وہ شاندار دعوت ہوتی کہ ہاتھوں کی چکنائی چھٹانے کے لیے صابن منگوانا پڑا۔

بھائیوں، دیوروں کی آس پر جینے والی خالہ اس سے بڑھ کر اور کیا کی سکتی تھیں!

آسمان پر ایک کٹی ہوئی پتنگ کسی رنڈی کی طرح اٹھلاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

بھاگتے لوٹنے والے بچوں کی سانس پھول گئی۔ سب نے اپنے ہاتھوں میں کانٹوں والے بانس پکڑ لیے تھے اور نگاہیں پتنگ پر لگی تھیں۔ مگر کون جانے وہ کس کے ہاتھ لگے گی۔

بہت دیر تک تسنیم کٹی ہوئی پتنگ کو دیکھتی رہی، پھر جب چھت پر بھی لڑکوں نے شور مچانا شروع کیا تو جھنجلا کر وہ نیچے اترنے لگی۔

"ان آوارہ لڑکوں کو منع کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ کم بختوں نے شور کے مارے گلی سر پر اٹھا رکھی ہے۔۔۔" بڑے ادب کے ساتھ دلہن بیگم کو آداب کر کے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تو ڈپٹن نے انھیں سنایا:

"ذرا سا شور ہو تو تسنیم کے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔"

"آج کل کی سب ہی لڑکیاں نازک مزاج ہیں۔ ہماری لڑکیاں خود ایسی ہی نخروں پٹی ہیں۔" دلہن بیگم ہنس کر بولیں:

"اے بہن اطہر میاں کا بیاہ کر چکو بھئی۔" انتظار سے بے زار ہو کر ڈپٹن نے خود ہی ذکر چھیڑا۔

"کروں گی۔۔۔" انھوں نے لا پروائی سے کہا۔ "کوئی ڈھنگ کی لڑکی تو ملے۔"

"ارے واہ شہر میں لڑکیوں کی کمی ہے۔ ایک سے ایک سگھڑ' خوبصورت۔ یوں کہو تم بھی پاکستان کی طرف منہ کر رہی ہو۔"

"اے توبہ کرو بہن۔ تمہارے گھر کی چھالیہ بہت اچھی ہے کس دکان سے منگوائی۔۔۔؟"

وہ ایک اور پان منہ میں رکھ کر کہتیں۔

"ارے میرے گھر کی تو ہر چیز بے مثال ہے۔ تم آکر تو دیکھو۔" ڈپٹن کہنا چاہتیں۔ پھر بنارسی غراروں کا ذکر چلتا۔ پاکستان میں پانوں کی تباہی کا اور ان شادیوں کا جن میں جہیز کے نام کوڑی بھی نہ دی گئی۔

"میں تو اپنی تسنیم کا بیاہ ویسا ہی کروں گی جیسا باپ دادے کے وقتوں سے ہوتا آیا ہے۔"

"اللہ قسم تم نے میرے جی کی بات کہہ دی۔" دلہن بیگم نے لپک کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مگر ہمارے بچے تو بیاہ براتوں میں دھوم دھڑکے کے قائل ہی نہیں ہیں۔ اطہر تو کہتا ہے میں نہ اپنی بہنوں کو جہیز دوں نہ خود لوں۔" پھر وہ اپنے کہے پر پچھتانے لگیں۔

"بہن تمہارے ہی منہ بات رہے' ورنہ میں لڑکیوں کو تو اپنی حیثیت کا دوں گی۔"

دوسرے دن سارے شہر میں اڑ گئی کہ دلہن بیگم صرف الحمد شریف پر اپنی لڑکیوں کو اٹھائیں گی۔ اور یہ ساری جائیداد ان کی بہو کے لیے ہو گی۔ پھر تو۔۔۔؟

اچھی بی کی ماں تو اب کچھ مایوس ہونے لگی تھیں۔ آس پاس اور بھی نشانے باندھے۔ چادر اوڑھے رات کو ایک گھر سے دوسرے گھر جاتے وقت محلے کے کسی کنوارے لڑکے کو دیکھ لیتیں تو دوڑی ہوئی نواب بیگم کے گھر جاتیں۔ اب انھیں اچھی بی کے لیے کنوارے بر کی بھی تلاش نہ رہی تھی۔ کھاتا پیتا گھر ہو تو مرد ساٹھا بھی پاٹھا کہلاتا ہے۔ اس امید کے سہارے کتنے ہی ایسے گھروں کی بھی انہوں نے نواب بیگم سے مخبری کی' جہاں بیویاں یا تو لب دم تھیں یا آئے دن بیمار رہا کرتی تھیں۔

"میں نے سنا ہے تمہاری بھاوج کو تپ دق ہو گئی ہے۔۔؟" ایک دن چھت پر چڑھ کر انھوں نے اپنی پڑوسن سے پوچھا۔

"اے تمہارے بھیا تو اچھے خاصے جوان ہیں۔ کیا تنخواہ ہے ان کی۔۔۔!"

لیکن پڑوسن کی بھاوج سے وہ قطعی مایوس تھیں - جو عورت پانچ برس تک تپ دق میں جیئے جائے وہ پانچ برس اور بھی جی سکتی ہے۔

وہی لوگ خوش قسمت تھے جو پاکستان چلے گئے۔ ایک زمانہ تھا کہ فاطمہ اور نادرہ دنیا بھر کی مانی ہوئی پھوہڑ کہلائیں۔ کبھی کسی نئی وضع کا شرٹ قطع کرنے راحت کو بھیج دیا تو راحت کی خالہ سارے خاندان میں وہ کپڑا نچایا کرتیں۔

"ارے پیسہ کمالو مگر سلیقہ اور ہنرمندی تھوڑی کمائی جا سکتی ہے!"

مگر اب تو جو خوبیاں ان بہنوں میں تھیں وہ کسی میں نہ ہوں گی۔

مائیں زبردستی انھیں اپنے گھر بلا بھیجتیں۔ لڑکیاں ہیں کہ ان کی ناز برداری میں مری جا رہی ہیں۔

اطہر بھائی سے فوٹو کھنچوانے کا شوق سب ہی کو ہوا تھا۔ کتنی بار انگریزی مضامین کی اصلاح کے خالدہ نے اپنی کاپیاں بھجوائیں۔ کولرج کی کسی نظم کے متعلق تسنیم نے خط لکھ کر کچھ اطہر سے پوچھا اور اس کا تفصیلی جواب پا کر تو کٹی ہوئی پتنگ کی ڈور ہاتھ آ گئی۔

"آج کل تو اطہر بھائی ہم سے چھپ چھپ کر تسنیم کو خط لکھا کرتے ہیں۔"

ایک دن چائے پیتے میں فاطمہ نے چھیڑا۔

"تم سے کس نے کہا---!" اطہر نے کتاب سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔

"تسنیم نے کالج میں سب لڑکیوں سے کہا ہے۔"

"اچھا ہوا میں ابھی دیباچہ ہی پڑھ رہا تھا۔" اس نے کتاب بند کر کے رکھ دی اور خود بھی چائے کی میز پر آ گیا۔

سوئے سارا سنسار اور جاگے ایک مضمون نگار۔

لیکن آج اطہر کسی مقالے کے لیے ریسرچ نہیں کر رہا تھا۔ اسے تعجب تھا مسلسل دو مہینے سے وہ بریلی میں کیوں پڑا ہے---! چھوٹا سا شہر' جہاں دو چار دوست بھی تھے تو اس زمانے کے جب سب ہم خیال تھے۔ مگر اب تو بقول دلہن بیگم' اطہر میاں کو نہ گھر پسند تھا نہ گھر والے۔

انھیں تو کسی ولایت بھیجنا چاہیے۔

اطہر اسی ولایت کے متعلق سوچ رہا تھا۔

اگر دو چار مہینے اور فاطمہ نادرہ کے ساتھ تفریح میں گزار دیے تو ضرور دلہن بیگم کوئی

نہ کوئی زبردستی کا ڈھول اس کے گلے میں باندھ دیں گی۔

اس ہجوم میں اسے کبھی وہ لڑکی نظر نہ آئی جو بیوی بنائی جا سکے۔ ہر طرف بکاؤ مال کے لیے شوروم سجے ہوئے تھے۔ جتنے پیسے جیب میں ہوں ویسی چیز خرید لو۔ پھر چاہو تو اس خریدی ہوئی گڑیا کو الماری میں سجا کر رکھ دو یا ساتھ ساتھ لیے پھرو۔ لیکن ہاتھ چھوڑتے ہو وہ قدموں میں گر جائے گی۔

تو پھر یہ طے ہے کہ وہ علی گڑھ جا کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاری کرے گا' ساتھ ہی ملازمت کی کوشش۔ بڑے اطمینان سے بیڈ لیمپ گل کر کے اس نے لحاف منہ تک کھینچ لیا' لیکن بند ہوتی ہوئی پلکوں کے اندر پہلے ہلکا سے اور پھر واضح سا مجیا کا ہیولا دیکھ کر چونک پڑا۔

وہ لحاف پھینک کر اٹھ بیٹھا۔

"اطہر میاں---" مجیا نے یوں کہا جیسے تصور میں کوئی گنگنا رہا ہو۔

"اطہر میاں' آپ کو تکلیف تو ہوگی' ذرا یہ پڑھ دیجئے کہ اس بوتل پر ٹنچر ہی لکھا ہے نا---!"

بوتل چھوتے وقت مجیا کا ہاتھ کتنا سرد تھا۔ جیسے برف کو چھو لیا ہو۔ وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

"گھر آئی دولت کو ٹھکرانا حماقت ہے---" غالباً" دل کہہ رہا تھا۔

"یہ میری پناہ میں ہے---" اس کے اندر والا جمہوریت پسند مضمون نگار بھی نہ جانے کیوں جاگ اٹھا۔

"جا جا۔ آدھی رات کو سوتے سے اٹھاتی پھر رہی ہے۔" یہ اس کا اپنا قطعی ارادہ نہ تھا۔

مجیا کے جانے کے بعد بھی اس کی سسکیاں کمرے میں بھٹکنے لگیں۔

"آدھی رات کو وہ ٹنچر آئیوڈین کا کیا کرے گی---!" اس نے پریشان ہو کر سوچا اور لحاف پھینک کر اٹھا۔ مجیا دالان کے کونے میں کھڑی دانتوں سے شیشی کا کارک کھول رہی تھی۔

شیشی ہاتھ سے چھین کر اس نے پوری قوت سے اس کے تھپڑ مارے۔

"سالی بالشت بھر کی لونڈیا۔ چلی ہے لیلیٰ بننے۔"

اگر نادرہ کو بھی وہ ایسی حالت میں دیکھ لیتا تو اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ دلہن بیگم ٹھیک کہتی ہیں کہ کمینے نہیں بدل سکتے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا خود بھی اپنے بال نوچ ڈالے۔ سارا گھر ان کے ارد گرد اکٹھا ہو چکا تھا۔

"کون ہوتے ہیں آپ بیچ میں بولنے والے! ہم زہر پئیں یا دھتورا کھائیں۔ آپ کی بلا سے۔ میں اب زندہ نہیں رہوں گی۔ اللہ قسم میں مرجاؤں گی مگر اس شرابی میراثی سے بیاہ نہ کروں گی۔" بہت دیر تک وہ بڑی بی کے ڈنڈے کھا کھا کر چیختی رہی۔

اطہر اچانک خوش ہو گیا۔ اس لیے کہ مجیا گناہوں سے پاک تھی' بلکہ اسے اپنے گھر میں بھی دنیا بدلنے کا احساس ہوا تھا۔ دلہن بیگم چاہے اس پرانی کوٹھی کو کتنا ہی لیپے پوتے جائیں' لیکن شگاف پڑ رہے ہیں۔ اب بھی بازار میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جن کی قیمت کسی کی جیب میں نہیں ہے۔

صبح باقاعدہ پنچایت بیٹھی۔ اطہر خود جج تھا۔

بڑی بی مجیا کا بیاہ ایک رنڈوے میراثی سے طے کر رہی تھیں' جو مجیا کے بیان کے مطابق ذرا جاہل تھا۔ ہروقت شراب پی کر گالیاں بکتا پھرتا۔

"لوگو! اس کلموہی سے پوچھو کہ اس کے لیے شہزادہ کہاں سے لاؤں!" بڑی بی فریاد کر رہی تھیں۔

"اے واہ' کلموہی تو ذرا بھی نہیں ہے۔" نادرہ کو ہمیشہ اس پر ترس آتا۔

"بھائی جان میں نے دیکھا ہے اس میراثی کو۔ بنا بنایا شائیلاک لگتا ہے۔ یہ موٹا روئی کا تھیلا۔ مجیا بچاری اتنی نازک سی۔"

دن بھر کی تو تو میں میں کے بعد یہ طے ہوا کہ میراثی کا پیغام واپس اور مجیا کے لیے موزوں دولھا ڈھونڈنا اطہر کا فرض ہے۔ آنے جانے والے مذاق اڑانے لگے۔

"یہ نواب بیگم کا حق آپ نے کیوں چھین لیا بھائی جان---!"

"حجاموں ڈوموں کی روزی مت چھینئے اطہر بھائی۔"

"سنا ہے اطہر میاں تم لڑکیوں کا بیاہ کرتے پھرتے ہو۔ ہماری لڑکیوں کا بھی خیال رکھنا۔"

ڈپٹن اسے روک کر مذاق کا بہانہ ڈھونڈنے لگیں۔

"اچھی بات ہے خالہ---" وہ چو مکھے حملوں کا جواب دیے جاتا۔

"میرے رجسٹر میں لڑکی کا ناک نقشہ' عادت اطوار سب لکھوا دیجئے گا۔"

"اوئی یہ کیا! ہمارے ہاں تو لڑکی کا جہیز دیکھا جاتا ہے' ذات پرکھی جاتی ہے' ناک نقشے نہیں دکھائے جاتے۔"

"یہ نئے زمانے کا حجام ہے بہن۔" دلہن بیگم بھی ان کے ساتھ قہقہے لگاتیں۔

تو پھر کچھ دن ٹھہریے۔ ابھی خرید و فروخت کا شعبہ نہیں کھلا۔" وہ گھبرا کے جواب دیتا۔

صبح اطہر ٹہلنے کے بعد بیری والی نانی کے ہاں جاتا تو راستے میں اچھی بی کی ماں روک لیتیں۔

"اے میاں مجیا کلموہی کے لیے دولھا ڈھونڈتے ہو' اپنے لیے بھی تو دلہن ڈھونڈو۔"

"ڈھونڈ تو رہا ہوں چچی۔" سر کھجا کے وہ بے بسی سے جواب دیتا۔

"ہم سے کہو۔ یوں چاند سی بہو لا دیں کہ عمر بھر خالہ کا احسان نہ بھولو۔"

"زندگی چاند سی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

وہ گنگناتا ہوا آتا۔ دلہن بیگم کے گلے میں باہیں ڈال کے دھمکیاں دینے لگتا:۔

"اگر آپ نے میری شادی بریلی کی کسی لڑکی سے کی تو مجیا کی طرح زہر کھا لوں گا۔" پھر وہ جھاڑو دیتی ہوئی مجیا کو پکارتا:۔۔۔

"اب کوئی بات ہوئی تو مجیا ہم دونوں مل بانٹ کر زہر کھائیں گے۔ اچھا' بھولنا مت۔"

مجیا کھسیا کر پردے کے پیچھے چھپ جاتی۔

مذاق میں سہی۔ لیکن دلہن بیگم جانتی تھیں یہ اطہر کا فیصلہ ہے۔ یوں دنیا انھیں ایک سعادت مند بیٹے کی ماں سمجھے' مگر کوئی ان کے دل سے پوچھتا کہ اتنی جائیداد ہوتے ہوئے وہ کیوں اپنے بچے کو کلیجے سے دور رکھتی تھیں۔ لڑکیوں کو خاندان کی روایت کے خلاف پڑھایا اور پچیس برس تک اطہر کے سہارے کا ارمان لیے کیوں بیٹھے ہیں۔ ایسی ہٹ والے تو اللہ بخشے ان کے میاں بھی نہ تھے۔ جو بیگم نے چاہا سو منوا لیا۔ لیکن اطہر کی بات تو پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ یوں دنیا پر اس کا دل دکھتا پھرتا۔ کبھی گھر میں کوئی نوکر ماما رو دیتے تو سب سے پہلے وہی آنسو پونچھنے دوڑتا۔ شبراتن کے لڑکے کو بچانے کے لیے جلتی کوٹھڑی میں گھس گیا تھا۔ لیکن ماں کا جی کبھی نہ رکھا۔ ہزار دفعہ باراتوں میں سہرے بندھے دولھے دیکھ کر دلہن

بیگم کا جی بگڑ چکا تھا۔ اکیلے میں فاطمہ سمجھاتی:۔۔

"آپ کو اتنا ارمان ہے تو جہاں اطہر بھائی کہیں وہیں بیاہ کر دیجئے۔"

"مت کٹ گئی ہے تیری۔" وہ آنسو پونچھ کر کہتیں۔ "میں قیامت کے دن تمہارے دادا کو کیا منہ دکھاؤں گی!"

لے دے کے ایک ہی امید تھی کہ کوئی لڑکی ایسا جال پھینکے جو یہ اطہر میاں ہاتھ جوڑے دلہن بیگم کے سامنے دھرے نظر آئیں۔ اسی بہانے انھوں نے آنا جانا بڑھا رکھا تھا۔

"تو کیسا دولھا پسند کرے گی ری۔۔۔؟" نادرہ کی سہیلیاں مجیا کو چھیڑتیں۔

"عین مین تو چڑیلوں کی سی شکل ہے۔" راحت ناک سکیڑتی۔

"نہ جانے اطہر بھائی کیسے اس کے لیے اچھا دولھا ڈھونڈیں گے۔۔۔!"

"آج کل تو اچھی اچھی لڑکیوں کو بر نہیں ملتے۔"

"ہمارے آفس میں صورت شکل کی نہیں' جرات کی داد دی جاتی ہے۔" اطہر کھیل چھوڑ کر ان سے مخاطب ہوا۔ "تم بھی ایسی جرات پیدا کرو ہیرا دولھا لاؤں گا ہیرا۔"

پہلے تو سب کو ہنسی آگئی ۔۔۔پھر۔۔۔

"بہت منہ پھٹ ہو گئے ہیں اطہر بھائی۔"

"اے واہ' ہمیں بھی کوئی مجیا سمجھ رکھا ہے۔۔۔؟"

ادھر نواب بیگم ہر ایک کو یوں خوش کر دیتیں جیسے اطہر کی بارات انھیں کے دروازے پر لا رہی ہیں۔

"اب بیاہ کی تیاری شروع کر دو ڈپٹن۔۔۔" وہ جی خوش کرنے کی باتیں شروع کر دیتیں۔

ڈپٹن کے جاتے ہی میلی چادر اوڑھے موٹی سلیم شاہی جوتیاں گھسیٹتی اچھی بی کی ماں آجائیں تو ناب بیگم نے انھیں بھی کبھی مایوس نہ کیا۔

اور بڑی بی کانٹوں بھری جھاڑی بن کر اطہر کو لپٹ ہوئی تھیں کہ چھڑائے نہ بنتی۔

نہ جانے اطہر نے کتنے حجاموں ڈوموں سے دوستی گانٹھی۔ آئے دن ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی صورت مجیا کو جھنکائی جاتی۔

بڑی بی اس روز روز کے انٹرویو سے پریشان ہو گئی تھیں۔

"اے میاں' اب جو تمہیں اچھا لگے اس کو پکڑ لو۔" وہ اطہر کی خوشامد کرتیں۔
ایک دن مجیا صحن میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی کہ اطہر بھی وہیں آ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔
"ذرا بھئی ایک بار پھر اپنے میاں کی خوبیاں تو سمجھا دو تاکہ ڈھونڈنے میں آسانی رہے۔"
اندر سے نادرہ دوڑتی ہوئی آئی۔
"دیکھیے بھائی جان--- وہ ہے مجیا کا دولھا۔" اس نے کاپی آگے بڑھا دی۔ اس میں پنسل سے اطہر کا ایک کارٹون بنا ہوا تھا۔ سب ہنسنے لگے اور مجیا نے کھسیا کر وہ ورق پھاڑ ڈالا۔
"کس نے بنایا یہ کارٹون---؟"
"انھوں---" نادرہ کے پیچھے ایک اور دبلی سی شرمائی ہوئی لڑکی کھڑی تھی۔ بہت عام' واہیات سی شکل و صورت۔ کالی جینت کی شرٹ' سفید دوپٹہ اور سفید شلوار پہنے۔
"یہ ہماری نئی دوست ہیں نوید۔ بہت اچھی آرٹسٹ ہیں۔ انٹر کا امتحان دیا ہے۔"
کئی دن کے بعد ایک روز پھر وہ لڑکی نظر آئی۔ سر پہ دوپٹہ اوڑھے۔ کچھ چپ چپ سی۔ اس کی سنجیدگی بڑی گمبھیر سی لگی۔ یوں جیسے سطح کے نیچے طوفان دبے ہوں۔ جیسے کسی نے جلتے چراغ کو پردے میں چھپا دیا ہو۔ اطہر کے آتے ہی وہ اٹھ کر جانے لگی۔
"اگر میرا آنا پسند نہیں تو واپس جا سکتا ہوں۔" وہ بیٹھنے سے رک گیا۔
"اوہ--- ایسا خیال نہ کیجئے گا۔ مجھے پانچ بجے ایک ضروری کام پر جانا ہے۔" وہ جلدی سے چلی گئی۔
"یہ بھی ایک ادا ہے۔ خدا معلوم ان لڑکیوں کو اپنے متعلق کیا کیا خوش فہمی ہے---!"
اس لڑکی کے رویے سے اطہر جل گیا۔ یہاں تو اچھوں اچھوں کو منہ نہیں لگاتے۔
"آپ نوید کو غلط سمجھ رہے ہیں بھائی جان۔" نادرہ اسے رخصت کر کے واپس آئی۔
"بچاری بہت غریب ہے۔ اسے ٹیوشن پر جانا ہے۔"
"لڑکیوں کو ٹیوشن کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ شادی کیوں نہیں کر لیتی---!"
پھر نادرہ نے بتایا کہ نوید شادی نہیں کرے گی جب تک اسے کہیں ملازمت نہ مل جائے۔

چائے کی پیالی منہ سے لگاتے ہوئے اطہر نے سوچا۔ آج سے اس کا نام بھی رجسٹر میں لکھ لیا گیا۔

چھ مہینے گزر گئے۔

نواب بیگم نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ دلہن بیگم کے ہاں بیاہ کی تیاریاں مکمل ہیں۔ ڈپٹن اور راحت کی خالہ نے اطہر اور دلہن بیگم کے بڑھتے ہوئے خلوص کو بھانپ لیا تھا کہ پلڑا ان کی طرف جھک رہا ہے۔ صرف دو چار جھٹکوں کی دیر ہے۔ ادھر بڑی بی مجیا کو کوس کوس کر کھائے جا رہی تھیں اور دلہن بیگم کے ہاں ایک بڑا ہنگامہ مچ کر تھم چکا تھا۔ دلہن بیگم نے سب ہی ممکن ہتھیار آزما ڈالے۔ نادرہ فاطمہ اس وقت کو روتیں جب نوید سے دوستی بڑھی تھی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسی پریوں کے مقابلے میں یہ دبلی سانولی سی نوید بازی جیت لے گی۔

اطہر کی تو پرانی عادت تھی' ہمیشہ ایک منٹ میں فیصلہ کر ڈالتا اور چٹان کی طرح اس پر جم جاتا۔ بی۔اے کرنے کے بعد اچھی خاصی نوکری ڈھونڈ رہا تھا' اچانک ایک دن کھانا کھاتے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں آج علی گڑھ جا رہا ہوں ایم۔اے کرنے۔۔۔" کوئی سمجھائے بھی تو اس کان سنا اس کان اڑا دیا۔ سب ہی اس کی عادت سے واقف تھے۔

ایک نہ ایک دن تو یہ بھانڈا پھوٹنا ہی تھا۔ دلہن بیگم نے اعلان کر دیا کہ چند ماہ بعد اطہر کا بیاہ ہے۔ لڑکی کے متعلق انھوں نے اطہر کو پوری آزادی دے دی ہے۔

"اب وہ اور پڑھنے ولایت جا رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں سات سمندر بھیجنے سے پہلے اس کے سہرا باندھ دوں۔"

"مگر اطہر کی پسند نہ مانی جائے گی۔" راحت کی خالہ یہ سن کر پریشان ہو گئیں۔

راحت چڑیل تو ہمیشہ کی منہ پھٹ تھی۔ جب دیکھو بیٹھی اطہر سے بحثے جاتی۔ کبھی گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر اطہر کی ماں کا کام نہ کیا اور ثروت سے اطہر کی کبھی نہ بنی۔ آئے دن اس کے میک اپ پر ریمارک ہوتے رہتے۔

صرف ایک ڈپٹن تھیں جو مطمئن نظر آتیں۔ سنا ہے انھوں نے کوئی خواب بھی دیکھا تھا۔ ایک بزرگ انھیں بشارت دے گئے ہیں۔ اسی لیے تو انھوں نے اطہر کی شیروانی کا

ناپ تک درزی کو دے دیا تھا۔ پورے گھر پہ قلعی کروا رہی تھیں۔ ادھر اچھی بی کی ماں کا یہ حال تھا کہ مارے فکر کے رات بھر نیند ہی نہیں آتی تو بشارت دینے والے بزرگ بھی کیسے آتے؟ یوں زیارتوں کے چلے' نفلیں اور روزے ان کے بس میں تھے' سو کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آئے دن کبھی انڈوں کا حلوہ اطہر کے لیے بھیج رہی ہیں کبھی بری روٹی اور شاہی ٹکڑے۔

اتنا پیسہ نہ تھا کہ ہر مہینے خالدہ کی طرح اچھی بی کی سالگرہ کرتیں اور دلہن بیگم کے سارے گھر کی دعوت ہوتی۔ اطہر جدھر سے نکلتا چلمنوں کی اوٹ میں چھپے دل دھڑکنے لگتے۔

ڈپٹی صاحب' احمد علی حکیم اور واحد حسین اطہر کو زبردستی اپنی بیٹھکوں میں پکڑ لاتے۔

"بھئی ہمارا جی نہیں ٹھکتا اطہر میاں کہ تمہیں اتنی دور سمندر پار بھیج دیں۔"

"تمھیں اپنے مستقبل کی کیا فکر ہے میاں۔ یو۔ پی کا فوڈ منسٹر اپنا پرانا یار ہے۔ یوں چٹکی بجاتے تمھیں گز۔ٹڈ پوسٹ دلا دوں گا۔" ڈپٹی صاحب اسے تسلی تشفی دیتے۔

اور اطہر میاں تھے کہ اپنی محبت میں جٹ کر مجیا کے متعلق سب بھول بھال گئے۔

یا تو پھر کتاب آنکھوں سے لگی رہتی تھی یا دیکھو تو باغ میں بیٹھے گنگنا رہے ہیں۔ آئینے کے سامنے کھڑے کنگی کیے جارہے ہیں۔ دن بھر نادرہ فاطمہ کی سہیلیوں میں بیٹھے فلمی گیت سن رہے ہیں۔ جو بات کرو تو دماغ غائب۔ مجیا تک چھیڑتی۔

سارے خاندان میں بات پھیل رہی تھی۔ سب یوں تیار بیٹھے تھے جیسے سلامی کے وقت سپاہی اپنی پوزیشن درست کر لیتے ہیں۔ راحت کی خالہ نے جلدی جلدی اپنی بیٹی کو پاکستان سے بلا بھیجا۔ کہیں بھائی کی وجہ سے ہی اڑنگا نہ پڑ جائے۔

"لڑکا تو میرا دیکھا بھالا ہے۔ مگر صرف اس لیے آگے پیچھے ہوتی ہوں کہ نوکر نہیں ہے۔"

"کیا تسنیم کا پیغام آگیا---؟" اچھی بی کی ماں ہڑ بڑا کے پوچھتیں۔

"آتے کتنی دیر لگے گی۔ دلہن بیگم تو پچاسیوں دفعہ اپنی زبان سے جتا چکی ہیں۔"

ڈپٹن اطمینان سے جواب دیتیں۔

"مگر سنا ہے اطہر تو راحت پر لٹو ہے۔ دن رات اس کے ساتھ چوسر کھیلتا ہے۔"

اچھی بی کی ماں رائٹر کی نامہ نگار بنی اطہر کی ہر ہر جنبش کی اطلاع پہنچایا کرتیں۔

"اور بڑی بی تو قسمیں کھا کے کہتی ہیں کہ اطہر اس پردیسن نوید سے بیاہ کرے گا۔"

کوئی اور اندیشہ ظاہر کرتا۔

"اونہہ--- بڑی بی ہمیشہ کی لتری جھوٹی۔ اب تو پوتی کا بر ڈھونڈتے ڈھونڈتے اور بھی سٹھیا گئی ہیں۔"

کبھی آتے جاتے بڑی بی اطہر کا راستہ روک لیتیں تو ہوں ہاں کر کے ٹال جاتا۔ آج کل گھر میں کیا ہو رہا ہے اسے کچھ خبر ہی نہ تھی۔ صرف شاعری کا موڈ سوار تھا آدھی رات کو جب دنیا سوجاتی تو اس کا دماغ جاگ پڑتا۔ نہ جانے کہاں سے شعروں پر شعر لڑھکتے چلے آتے اور وہ باغ کی چاندنی میں جا بیٹھتا۔

تہجد کے وقت دلہن بیگم دیکھ لیتیں تو درود پڑھنا شروع کر دیتیں: "اس موئی چڑیل نے کوئی جادو کر دیا ہے۔"

آج بھی اس پر بالکل سرسامی کیفیت تھی۔ اکیلا فوارے کے حوض پر بیٹھا رات کی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ آج اچھی بی کے ہاں خدائی رات تھی۔ عورتوں کی چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ لگے ہاتھوں لڑکیاں اچھی بی کے سہاگ گانے لگیں۔

"بٹیو--- سروں پر پلو ڈال کے بیٹھو۔" نواب بیگم چیخ رہی تھیں۔

"ایسے وقت بزرگ نیچے اتر کے رشتے ملاتے ہیں۔" ایک منٹ کو گیت رک گیا۔ شاید ڈھول بجانے والی لڑکیاں بھی سہم گئیں۔ پھر لے تیز ہو گئی:

میں بھلر تر بھاگ آئی' سنو جان میری
تیری بہنوں کے کھیلنے کی گڑیاں
میں چولھے میں جھونک آئی' سنو جان میری
میں بھلر تر بھاگ آئی---

جوں جوں بیاہ کے دن قریب آرہے تھے وہ گھبرا رہا تھا۔ نوید اس کے معیار پر پوری تھی۔ عام لڑکیوں کے برخلاف خوددار اور اپنی ہمت پر جینے والی۔ مگر نہ جانے کیوں وہ چاہتا تھا' نوید بھی یوں یہ بھلر تر بھاگ کر اس کے پاس آجاتے کہ ہر چیز تہہ و بالا ہو جائے۔ وہ زندہ لڑکیوں کی طرح کھل کر قہقہے لگانا بھی سیکھ جائے۔

اپنے آس پاس اس نے بھی کسی بزرگ کا سایہ ڈھونڈا۔

تیرے بھائی کے کھیلنے کی گیندیں
میں کنویں میں پھینک آئی' سنو جان میری

میں بھلا تا بھاگ آئی---

اس بار لڑکیوں کے نازک ترنم میں نواب بیگم کی کرخت آواز بھی شامل ہو گئی۔ درمیان میں قہقہوں کی آتش بازی بھی چھوڑی جا رہی تھی۔

اطہر کے سامنے ان لڑکیوں کے بہت سے ہیولے ناچنے لگے۔ اب تک وہ نوید کو کتنے ہی زاویوں سے ایک شعر میں ڈھال چکا تھا' مگر وہ پھسل کے الفاظ کے جامے سے باہر آ جاتی۔ پھر لڑکیوں کا یہ شور ڈھنگ سے کچھ سوچنے بھی دے---؟

رفتہ رفتہ وہ مدھم چاندنی کے دھندلکے میں پھر ابھری۔ لمبے درختوں کی پرچھائیوں کے سہارے دیوار پر چڑھ گئی۔ ایک منٹ تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ پھر آگے بڑھ کے اس نے لٹکتی ہوئی ٹانگ پکڑ لی۔

"مجھے چھوڑ دو میاں۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اللہ کے واسطے۔ رسول کے واسطے۔"

آہستہ سے اس کی کمر پکڑ کے اطہر نے نیچے اتارا--- مجیا خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"کیوں ری کس کے ساتھ چلنے کا پروگرام بنایا ہے--- سچ بتا!" مجیا کے نرم گالوں پر تھپڑ مارنے میں کافی لطف آیا۔

"کوئی نہیں اطہر میں۔ اللہ قسم' قرآن کی قسم۔ آپ خد دیکھ لیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولی۔

"میں تو جدھر سینگ سماتے بھاگ جاؤں گی' مگر ان لچے لفنگوں سے بیاہ نہ کروں گی۔"

وہ زور زور سے رونے لگی۔

"اچھا تو ادھر آ---" اس نے مجیا کا ہاتھ پکڑ کے اپنے پاس فوراے پر بٹھا لیا۔

"مجھے ٹھیک ٹھیک بتا تو کیسا میاں چاہتی ہے۔ راج کپور کی صورت یا اشوک کمار کی صورت۔"

" جلدی بتا---" وہ خود پریشان ہو گیا' مگر مجیا روئے چلی جا رہی تھی۔

"اب بتاتی ہے یا میں سب کو اٹھاؤں---؟" آج چاندنی رات میں روتے ہوئے مجیا بری نہ لگ رہی تھی۔

"مجھے صورت لے کر کیا چاٹنا ہے۔" وہ سسکیاں لے کر بولی۔ "مگر وہ زندگی بھر نبھانے کا وعدہ تو کر سکے۔"

"یہ گارنٹی کون دے سکے گا---؟" اطہر نے تعجب سے پوچھا۔

"اتنی ہمت والے مرد ابھی پیدا نہ ہوئے ہیں--- تو پھر میرا ہاتھ چھوڑیے۔ میں کہیں جا کے ڈوب مروں گی۔" وہ زبردستی ہاتھ چھڑا کے پھر جامن کی طرف بڑھی۔

اطہر شرمندہ ہو کے پیچھے کو ہٹ گیا۔ مجیا گالیاں بھی دے سکتی ہے---؟ گلاب کی ایک پتی مسلتے ہوئے اس نے سوچا۔

"اچھا تو پھر ٹھہر۔ میں تجھے یہ گارنٹی دیتا ہوں۔" اسے اپنے ارد گرد وہی بزرگ نظر آئے جو آج کی رات نیچے اتر کے دلوں میں گرہیں دیتے پھر رہے تھے۔

اس نے کوٹ کاندھے پر ڈالا اور مجیا کے ساتھ گیٹ سے باہر نکلتے وقت نیا شعر موزوں کرنے لگا۔

تیرے باپ کی اونچی حویلی میں
میں کیسی آگ لگا آئی' سنو جان میری
میں بھار تل بھاگ آئی' سنو جان میری ___

اچھی بی کے آنگن میں لڑکیوں کے ساتھ چیختے چیختے نواب بیگم اب جوش میں آچکی تھیں۔

○

چھمیا

کوئی بے غیرتی کا لبادہ اوڑھے تو بچھمیا کی طرح۔
کچھوے کی کھال کی مانند اس پر نہ تو گالی کوسوں کا اثر ہوتا اور نہ لکڑی پتھر کا۔
"بے غیرت ہے مٹی۔ کندہ نا تراش۔ چکنا گھڑا۔ وہی مثل ہے کہ ___ خاک پڑے عقل پر جانے کیا مثل تھی ___ مثل یاد نہ آنے کی تلافی میں خالہ ایک ہی معنی کے کئی جملے گھسیٹی جاتیں۔
دالان کے در سے لگی، گھر اور محلے کے بچوں میں گھری، کوا کھنی بنی وہ بیٹھی تھی اور سب خوف و اشتیاق کی ملی جلی نظروں سے بچھمیا کوئی قومی ہیرو ہو جو ایک عظیم قربانی دینے پھانسی پر چڑھائی جا رہی ہے۔
"اماں کیلیں لگی چھڑی لا رہی ہیں۔ اب پتہ چلے گا تھمو کو۔" منی نے تالیاں بجا کے کہا۔
بچھمیا اس نئے اعزاز کی خوشی میں فخر سے اکڑ گئی اور ناخنوں سے دیوار کا چونا کھرچنے لگی۔ مگر بہت دیر سے آئی ہوئی ہنسی اچانک نکل بھاگی۔ ساتھ ہی ناک سے رطوبت کے غبارے نکل کر گھٹنے پڑھنے لگے۔
"اماں اب ہنس رہی ہے---" منی رائیٹر کا نامہ نگار بنی اس کی ہر ہر جنبش کی اطلاع اماں کو پہنچایا کرتی۔ اماں سب کاموں سے نبٹ کر واقعی لکڑی ڈھونڈنے لگیں تو بچھمیا رونے کا پرانا والا سر ڈھونڈ کر گنگنانے لگی---"ہونک اوں۔ اوں۔اوں۔"
پھر تابڑ توڑ پڑنے والی لکڑیوں سے مدھم اور بلمپت بھول کر اچانک درت پر آگئی مگر اماں کے ہاتھ نہ رکے ___۔"بول کبھی اب چرائے گی! آج جب تک یہ اقرار نہ کرے گی نہیں چھوڑوں گی۔"
بچھمیا کے دھان پان جسم پر لکڑیاں توڑتے توڑتے وہ خود تھکی جا رہی تھیں۔
"اس کا اقرار تو جیسے عدالت کا فیصلہ ہو گا نا۔" رئیسہ نے اپنی چونچ نما ناک کو زیادہ لمبا بنا کے کہا--- "نہ جانے ماں چڑیل نے کیوں پیدا کیا تھا اسے---؟"
جیسے خالہ بچاری کو خبر ہی نہ ہو کہ بچھمیا کے پیدا ہونے کا مقصد کیا تھا۔ یہ بچھمیا کا ہی تو دم تھا جو گھر کے بچے میاں اور بی بی پکارے جاتے۔ منی شہزادیوں کی طرح ننگے پیر

زمین پر نہ رکھتی اور اماں کو پیر دبوائے بغیر نیند نہ آتی۔ اگر وہ نہ ہوتی تو اماں اپنا غصہ اتارنے کے لئے کسی کو مار مار کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتیں۔ خالہ کی دوائیں ہر روز کھرل میں پیس پیس کر کون سرمہ بنا دیتا۔ ہر وقت بچوں کو کولھے پر لادے کون پھرتا۔ چلچلاتی دوپہریوں میں چار میل دور بچوں کے اسکول کھانا لے کر کون جاتا۔ پھر تو دسترخوان کے بچے ہوئے ٹکڑے بھی بوری میں پھنک دیے جاتے۔ رشیدہ بی بی کے پھٹے پرانے کپڑے اماں فقیروں کو دے دیتیں۔ اگر وہ سچ مچ کمی ہوتی تو اماں اسے کب کی نکال باہر کر چکی ہوتیں اور وہ بڑے مزے سے اناج کی گاڑیوں' بگھیوں کے اسٹینڈ اور موٹروں کے پیچھے لٹکتی جھومتی پھرتی۔ سڑکوں پر لونڈوں کے ساتھ گولیاں کھیلتی۔ باجے کے ساتھ نکلنے والی سینما کی گاڑیوں کے ہمراہ پورے شہر کا چکر کاٹ کر اتنے اشتہار لوٹ لاتی کہ چار آنے کی ردی میں بک جائیں۔ اس معاملہ میں وہ بڑی سگھڑ تھی۔ گھر کی تو ہر چیز دیکھ کر اس کی رال تک ٹپکنے لگتی تھی مگر باہر کی کوئی چیز بھی اس کی دسترس سے بچنا مشکل تھی۔ رنگ برنگے پتھر' پنیاں' فلموں کے اشتہار اور ریشمی کپڑوں کی کترنیں۔ سب کو باورچی خانے میں پڑے ہوئے ایک مٹی کے چھوٹے گھڑے میں جمع کرتی رہتی۔ تب کبھی اسے فرصت ملتی ایک ایک پنی کا ٹکڑا اور کپڑے کی کترن یوں احتیاط سے نکالتی جیسے رئیسہ بی بی اپنے زیور کا صندوقچہ سنبھال کے کھولتی ہیں۔ پھر وہ پنی کو مروڑ کے ایک انگوٹھی سی بنا کے بڑے فخر سے پہن لیتی۔ گھنٹوں اپنے ہاتھ کو گھما گھما کے دیکھے جاتی تھی۔

اس گھڑے سے ننھمیا کو والہانہ عشق تھا۔ کبھی اماں گھڑا پھینکنے کی دھمکیاں دیتیں تو گویا اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ پڑ جاتا۔ کئی ہفتے وہ شریف بنی رہتی۔ اس کی' چمر رگ' نہ پھڑکتی۔

مگر کب تک۔۔۔

اس کے ندیدے پن کی تو انتہا ہو گئی تھی۔ برتن دھوتے وقت پلیٹوں کو لگا ہوا سالن اور جھوٹی ہنڈیا تک چاٹتی رہتی۔ رئیسہ کا جی متلا جاتا۔

مگر اتنے عیب ہونے پر بھی وہ دکھتی ٹانگ کی طرح برداشت کی جاتی تھی۔ اس گھر میں وہ ٹانگوں سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ پرسوں ہی اماں نے ایک لڑکے کو نوکری کے لیے بلوایا تو اس کے باپ نے پندرہ روپے تنخواہ' مہینے میں چار بار چھٹی اور بچوں کے ساتھ کھانا کھانے کی شرط رکھی۔

"جوتی ماری ہوتی حرامی کے منہ پر۔" رئیسہ نے سنا تو بھنا کے کہا۔

"ایسا قیامتی وقت آگیا ہے کہ موری کی اینٹ چوبارے چڑھنے لگی۔"

مجبوراً" بتمیا کو بھگتنا پڑتا۔ وہی صبح اٹھ کر سارے گھر کی ضرورت کا پانی کنوئیں سے بھرتی۔ جھاڑو دیتی۔ پھر رشیدہ بی بی کی چٹھیاں لے کی ان کے دوستوں کے گھر دوڑنا۔ بچوں کو سنبھالنا۔ کوڑی پھیرا بازار کا کرنا۔ ساتھ ہی وہ جس طرف سے گزرتی گالی کوسوں کی بوچھاڑ ہوتی رہتی۔ صبح سے رات کے گیارہ بجے تک جلے پاؤں کی بلی بنی وہ گھومے جاتی تھی۔

شروع میں بتمیا ان کاموں کو دیکھ کر گھبرا گئی اور یہاں سے بھاگنا چاہا۔ لیکن پھر اسے اپنا گھریاد آگیا جہاں وہ خوفناک مونچھوں والا چچا اب مستقل طور پر آگیا تھا' جو بتمیا کی ماں کی طرف دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں بھکاریوں جیسی گھگھیاہٹ آجاتی' مگر بتمیا کو دیکھ کر اس کی موچھیں سانپ کا پھن بن جاتیں۔ بتمیا کوئی خطا کرے یا نہ کرے وہ جب تک اسے مار کر جی کی بھڑاس نہ نکال لیتا اسے بتمیا کی ماں کا مسی تھپا منہ اچھا لگتا نہ اس کے شتر غمزے بھاتے۔ ایسے اس کی ماں رو رو کر کہتی تھی کہ اپنی بچی کو اس گھر میں نہ رکھے گی۔

جس دن اس کی ماں بی بی کے پیر چھو کر بتمیا کو سپرد کر گئی تھی تو بتمیا کو اس گھر میں دلچسپی کے بہتیرے سامان نظر آئے۔ سامنے ہی بچے کھیل رہے تھے۔ آپس کی چہلیں' شور--- قہقہے--- ادھر ادھر لڑکتی ہوئی گیندیں--- سلولائیڈ کے بوے اور چھوٹی چھوٹی موٹریں دیکھ کر وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اچانک کسی نے بچوں کو ڈانٹ دیا۔

"خاموش--- کم بختوں نے دماغ چاٹ لیا ہے---"

بچوں کی آواز رک گئی۔ بتمیا نے سہمی ہوئی نظروں سے ادھر دیکھا۔ سامنے والے کمرے میں ایک دبلی پتلی سی عورت بیٹھی تھی۔ طوطے کی طرح مڑی ہوئی ناک۔ کڑوی دوا پینے کے بعد والے تاثرات چہرے پر لیے بیٹھی تھی۔ جیسے اس کی نظر میں دنیا کی کوئی چیز قابل التفات نہ رہی ہو۔ پھر اس نے ماتھے پر بہت سی شکنیں ڈال کے بتمیا سے کہا:---

"اے لونڈیا---پانی پلا---"

"ہمارا نام بتمیا ہے---" اس نے گردن اٹھا کے اعلان کیا اور گھبرا کے سر کھجانے لگی۔

"ارے رہنے دے۔۔۔۔" رئیسہ نے ناک سکوڑی۔۔۔ "جوئیں ہیں کم بخت کے۔"

وہ سہم گئی۔۔۔ جی چاہا اپنی ساری جوئیں نکال کے اس کے پانی میں گھول دے اور جب وہ ابکائیاں لیتی چاروں طرف پھرے تو اسے بھنگن بنا کے سب اپنے انٹ باندھے اس سے بچتے پھریں۔

سرے کمرے میں کئی لڑکیاں اور کئی مرد ایک ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی ججمیا کے کالے بھجنگ رنگ اور گندے پھٹے کپڑوں کو بھی دیکھ لیتے۔

"دیکھیے اشتیاق بھائی' میں نے بچوں کی نفسیات پر یہ مضمون لکھا ہے۔"

رشیدہ نے ججمیا سے ایک کاپی اٹھانے کو کہا تھا اور پھر اشتیاق سے بولی:۔

"اس لڑکی ہی کو لیجئے۔ ممکن ہے یہ بری صحبتوں میں پڑ کر چوری کرنے اور جھوٹ بولنے کی عادی ہو چکی ہو۔ مگر ہمارے گھر کا اچھا ماحول اسے پھر اچھا بنا سکتا ہے۔ آپ پوچھیں گے کیسے۔۔۔؟"

"نہیں۔ میں نہیں پوچھوں گا۔۔۔" اشتیاق نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ مجھے اس سیاہ فام مخلوق سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" پھر وہ سب ہنسنے لگے۔ مگر ججمیا کمرے سے باہر آئی تو اس کی مسرت خوف میں بدل چکی تھی۔ یہاں ابھی سے سب اسے چور سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ ججمیا کے چیتھڑے لگے میل تھپے جسم کے اندر روح ابھی تک صاف ستھری تھی۔

اس نے بھیانک مفلسی میں آنکھ کھولی تھی۔ پیدا ہوتے ہی ماں کو نوکری پر جانا پڑتا اور نانی اسے پانی سے بہلایا کرتی۔ چالیس دن کے بعد سوکھی روٹی کے ٹکڑے چوسنے لگی' مگر کچھ تو اپنی فطرت اور کچھ ماں کی سخت نگہداشت کا نتیجہ تھا کہ وہ چوری کرنے کو بھی ایک "ہوا" سمجھنے لگی اور جھوٹ بولنے کی سزا اتنی بڑی تھی جو کسی گز سے نہ ناپی جا سکے۔ اللہ میاں سچے انسان پر ہمیشہ مہربان رہتے ہیں۔ اس کا باپ بھی سچا تھا جس نے اپنے مالک کے قتل کی سازش میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا تو سیٹھ کے قاتلوں نے اسے بھی لگے ہاتھوں ٹھنڈا کر دیا۔

ججمیا کی ماں کہتی تھی۔ "تیرا باپ بھوکا رہتا تھا اور مالک کی گالیوں سے پیٹ بھرتا تھا مگر اس نے کبھی بے ایمانی نہیں کی۔ اب وہ خدا کے ہاں راجوں مہاراجوں کی طرح رہتا

پھر جب وہ مسجد کے مولوی جی کے پاس پہلا سپارہ پڑھنے جانے لگی تو خوفناک تھپڑوں، فولادی مکوں اور نیم کی دھڑیوں نے ایک ہی بات دماغ میں دھنسائی کہ چوری مت کرو۔ جھوٹ مت بولو اور سات برس کی بتمیا کے ذہن میں تعمیر ہونے والی دنیا کی بنیاد اسی پر جم گئی - یوں بھی اس کی دنیا میں خواہشوں کا گزر نہ تھا۔ اس کے پڑوسی بچے بھی اس کی طرح نادار تھے۔

پھر اس نے اپنے دل کو تسلی دی۔ یہاں سے جا کر تو جھونپڑی کے اندھیرے میں بغدادی قاعدے سے سر پھوڑنا پڑے گا۔ پھر چچا کی ننگی ننگی گالیاں اور پتھریلے مکے۔

اس کے مقابلے میں یہاں رشیدہ بی بی کے خوبصورت کپڑے کتنے اچھے تھے۔ جس وقت وہ بالوں کو جالی میں مرغیوں کی طرح بند کیے ہونٹوں کو سرخی لگا کے کالج جاتیں تو جی چاہتا ان کے خوبصورت جوتے اٹھا کے کلیجے سے لگا لو۔ ان کا کمرہ کتنا پیارا تھا۔ سنہری اور روپہلی شلواریں۔ چمکتے ہوئے دوپٹے، رنگین شیشیاں اور ڈبے، جن پر رشیدہ سے زیادہ خوبصورت عورتیں بیٹھی ہنس رہی تھیں۔

شام کو وہ بچوں کو لے کر ڈاکٹر صاحب کے باغ میں جاتی تھی۔ محلے کے اور بچے بھی اپنے کھلونوں سمیت وہاں آ جاتے تھے۔ خوابوں میں اچکنے والے مینڈک اور کھلونے اس وقت بتمیا کی دسترس میں ہوتے۔ وہ انہیں جی بھر کے چھو سکتی تھی۔ کودنے والے مینڈک کے ساتھ خود بھی الٹی قلابازیاں کھاتی اور بچوں کو خوش کرنے کے لیے پیروں کے انگوٹھے پکڑ کے اچکتی۔ گدھے، بلیوں اور کتوں کی نقل اتار کے سب کو خوب ہنساتی تھی۔

شام کے یہ دو گھنٹے بتمیا کے لیے وہ سامان مسرت لے کر آتے کہ وہ دن بھر کڑی سے کڑی محنت برداشت کرنے کو تیار رہتی۔

مگر باغ سے لوٹتے ہی اماں سب کھلونوں کی جانچ پڑتال کرتیں۔ شک بھری نظروں سے بتمیا کو دیکھتیں اور حفظ ماتقدم کے طور پر سنا دیتیں :-

"تو منی کی گڑیا کیوں چھو رہی تھی۔ اگر کوئی کھلونا چرایا تو ہاتھ توڑ دوں گی۔"

وہ رشیدہ کے کمرے میں جھاڑو دینے جاتی تو رشیدہ دروازے میں کھڑی پہرہ دیتی۔

"تو نے میرے آئینے میں منہ کیوں دیکھا---!"

"کریم کی شیشی کیوں چھوئی---؟"

"ساٹن کی قمیض کو ہاتھ کیوں لگایا---!" پھر بڑے فخر سے اعلان کرتیں:--

"میں بنجمیا پر ریسرچ کر رہی ہوں۔ اسے ہر وقت ٹوکتی رہتی ہوں کہ بری عادتیں چھوٹ جائیں۔"

بنجمیا کو بڑا تعجب ہوتا۔ آج تک اس نے بغیر پوچھے پانی بھی نہیں پیا' پھر سب اسے چور کیوں سمجھتے ہیں۔ بی بی اس کے کام میں خوش تھیں۔ اماں کی عیب جو طبیعت بھی بنجمیا میں ہی عیب ڈھونڈ پائی کہ وہ جلدی میں اچھے بھلے کام بھی بگاڑ دیتی ہے۔

گھر کے دوسرے لوگ نوکروں کے متعلق اپنی مخصوص رائے کو اہمیت نہ دیتے تھے' مگر ہر وقت سارس کی چونچ بنائے رہنے والی رئیسہ تو اپنے میاں کے ہاں سے دھتکارے جانے کا انتقام ہر شخص سے لے سکتی تھی۔ دن بھر وہ بنجمیا کے عیب بھی شمار کیے جاتی۔ یوں بھی اب اسے دن بھر ایک ہی کام تھا۔ گھر کے بچوں بوڑھوں میں عیب نکالنا۔ گھر کے انتظام میں خرابیاں ڈھونڈنا' کھاتے وقت سالن میں ہزار برائیاں ڈھونڈ کر سب کے جی سے اتار دینا اور نوکروں کو ان کی محنت کے صلے میں گالیوں سے نوازنا۔ اسے آتے دیکھ کر بچے بھاگ جاتے۔ خالہ چپ ہو جاتیں۔ رشیدہ اسٹڈی کرنا بھول جاتی اور بنجمیا کسی مرغی کی سات پشتوں کو کوسے دے کر اس کی ٹانگ توڑ دیتی۔ مگر وہ کمرے سے باہر بہت کم نکلتی تھی۔ دن بھر مسہری پر لیٹی کتیا کی طرح کراہے جاتی۔ اسے تو بنجمیا میں بے شمار عیب نظر آتے تھے۔

"ندیدی ہے۔ کھانے کے وقت آس پاس منڈلاتی رہتی ہے۔" یہ سچ ہے ہی تھا۔ ہی تھا۔ اس گھر میں آکر بنجمیا کی زبان طرح طرح کے مزوں کو جان گئی تھی۔ پہلے کبھی کبھار اسے ایک پیسہ مل جاتا تو جی ہزار چیزوں کو دوڑتا' مگر وہ اماں کے کہنے پر عمل کرنے اور ذرا دیر کے چٹخارے کی بجائے پیسہ اپنی مٹی کی گولک میں ڈال دیتی۔ جب کئی پیسے جمع ہو جاتے تو ایک دن اماں کو ادھار دینے پڑتے' جنھیں واپس کرنے کی نوبت کبھی نہ آتی۔

مگر یہاں آکر اس کی زبان نے نئے ذائقے محسوس کیے۔ ہزاروں طرح کی خوشبوئیں اس کی ناک میں گھسیں۔ طرح طرح کے کھانوں کی پلیٹیں اس کے ہاتھوں میں آئیں' جنہیں وہ کھانے کی میز پر رکھ آتی۔ بے قراری سے سب کے کھا چکنے کا انتظار کرتی۔ جب اماں بچوں میں کوئی مٹھائی تقسیم کرتیں تو بنجمیا کے قدم جم جاتے اور باوجود نگاہیں جھکانے کے اسے بار بار تھوک نگلنا پڑتا تھا۔

اپنے اطراب پر وہ زیادہ دن قابو نہ پا سکی۔

ایک دن کمرہ خالی پا کر اس کے ہاتھ بے اختیار میز کی جانب بڑھے اور گرم حلوے کا ایک بڑا سا لقمہ منہ میں ڈال کر وہ باتھ روم میں بھاگی--- ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ اس کے جسم پر لرزہ سا چڑھ رہا تھا اور گرم حلوے نے زبان پر چھالے ڈال دیے تھے۔ بہت دیر بعد جب وہ منہ پونچھتی باتھ روم سی باہر نکلی تو خدا سے دعا کر رہ تھی کہ آج اس کی پہلی اور آخری خطا معاف کر دی جائے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ اس کی عادت بننے لگی۔ اب وہ سب کو کھاتے دیکھ کر اتنی بے قرار نہ رہتی' نہ سب کا منہ تکتی۔ اب اس نے ایک سیکنڈ میں پوری گلاب جامن اور سالم کباب نگلنے کی مشق کر لی تھی۔ واجد اور منی اسے اپنے کھیل میں شامل کرتے مگر ذرا ہی دیر میں لاتیں گھونسے مار کے نکال دیتے۔ وہ کیچڑ بھرے پاؤں لیے صوفے پر چڑھ جاتی یا جوش میں آ کر منی کی لاتوں کا جواب دینا چاہتی تو واجد لاتیں مار کے اس کے اصلی مقام پر لوٹا دیتا تھا۔

پھر جھاڑو دیتے میں وہ پوری سنجیدگی سے سوچتی کہ وہ دوسرے بچوں کی طرح کیوں نہیں کھیل سکتی۔ اسے اچھی چیزیں کھانے کو کیوں نہیں ملتیں۔ اس کی ماں اپنے گھر میں گدگدے صوفے کیوں نہیں بچھاتی---!

امتحان کا زمانہ قریب آ رہا تھا اس لیے بچوں کا کھیلنا قطعی موقوف کر دیا گیا۔ اگر بھولے سے بجمیا کہیں کھیل کا ذکر کر دیتی تو اماں ڈانٹ دیتیں۔

"اب تمھارے بچے تو ہاتھ سے گئے اماں---" رئیسہ ارشاد فرماتیں۔

"جبھی تو کہتے ہیں کہ کمینے بچوں کے ساتھ کھلینا تو وہی مثل ہے کہ--- کہ---"

ہمیشہ خالہ کو عین وقت پر مثل چھانسہ دے جاتی۔

واجد اور منی کی ہر بری بات رئیسہ کی نظر میں بجمیا کیصحبت کا نتیجہ تھی۔ ہر بگڑے کام کا الزام اس پر آ جاتا۔ اماں اسے کتنی ہی شریف سمجھتی ہو مگر یہاں اپنی شرافت نبھانا فضول تھا۔ ہر وقت کی لعنت پھٹکار نے گناہ اور عذاب کے خوف کا ملمع بھی اتار پھینکا۔

اب وہ انتقاماً" ہر چیز چھپا کر باہر لے جاتی۔ چاہے کہیں نہ بکنے پر کوڑے میں پھینکنا پڑے۔ ہر کھانا میز پر پہنچنے سے پہلے وہ ضرور چکھتی۔ کتنا ہی مارو' اس کی کھال سنگ مرمر کی ہو گئی تھی جس پر سے ہر چوٹ پانی کی طرح پھلس جاتی اور وہ یوں ہنسے جاتی جیسے کوئی اور پٹ رہا ہو۔ یہ زخموں کے گھاؤ تو بہادری کے تمغے تھے جنھیں دکھا کر وہ لوگوں سے داد حاصل

کرتی تھی۔ اپنی ہر خطا کا جواز اس کے پاس موجود تھا--- وہ کیا کرے جو جھاڑو دینے میں اشتیاق میاں کا کیمرہ ٹوٹ گیا۔ اسے کیا معلوم کہ کیمرہ اتنا نازک' پانچ پھول کی رانی ہو گا' کہ اک چھوئے سے ہی خراب ہو جائے گا۔ ایسا ہی تھا تو ایک دن اسے کھول کر بتا کیوں نہ دیا---؟

اس کی بر محل تاویلوں کے آگے قانون پڑھنے والا اشتیاق بھی لاجواب ہو جاتا۔

"دیوانی ہے---"

"اس پر تو کسی کا سایہ ہے۔" ایک دن مسالہ پیستے میں امامن نے نیا انکشاف کیا۔

"اس کی ماں نے کوئی منت مانی تھی وہ پوری نہ کی--- جبھی تو لونڈیا اپنی سدھ بدھ کھوئے رہتی ہے۔" چلچلاتی دھوپ میں رسیوں سے بندھی ہوئی ببھمیا نے یہ سنا تو اس پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ اگر منت کی وہ مٹھائی اماں اسے بچپن میں ہی کھلا دیتی' تب دیکھتے کون سا سایہ ہے جو سر پہ پاؤں رکھ کر نہیں بھاگتا--- پھر اسے ڈر لگنے لگا---

اگر امامن کا کہنا سچ ہوا تو ___ میل سے چکٹے ہوئے بالوں کو جھٹک کر اس نے زور زور سے سر ہلایا۔ اے ہے پھر تو بڑا مزا آئے گا۔ رحیم دھوبی کی لڑکی کی طرح لوگ اسے بھی نہلا دھلا کر درگاہ لے جائیں گے اور وہ بال کھولے جھوما کرے گی۔ کبھی کبھی جی چاہا تو کسی کے دو چار لاتیں بھی مار دے گی۔ اپنے چچا کی مونچھیں پکڑ کے جھولا کرے گی۔ اللہ کرے کبھی وہاں رئیسہ بی بی آ جائیں۔ پھر تو زندگی بھر کا انتقام لیا جائے گا۔

پھر اس دن اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔

اس دن حامد صاحب آئے تھے۔ کھانستے چھینکتے' زکام زدہ صورت لیے۔ وہ رئیسہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جب بھی آتے رئیسہ کے کمرے میں بیٹھتے' اس کی تعریفوں کے پروجیکٹ بنایا کرتے اور رئیسہ جیسی ازلی کاہل خود بہ نفس نفیس ان کی خاطر مدارت کرتی۔ ہر منٹ پر ببھمیا کو بازار دوڑنا پڑتا۔ مگر اس دن رئیسہ نے حامد کے سامنے ببھمیا کو خوب ذلیل کیا۔

"بڑی ندیدی اور چوٹی ہے یہ لونڈیا۔ حامد بھائی آپ اس سے سگریٹ مت منگوایے گا۔ آدھے پیسے ہضم کر لے گی۔"

"ارے---- یہ اتنی سی چھوکری! چلو اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔"

جیسے بچارے کی زندگی بھر کی کمائی ہوئی دولت لٹ جانے والی تھی اور ببھمیا اتنی گئی

گزری ہے کہ ان مرتھلے کنجوسوں کے پیسے بھی چراتی پھرے گی۔ رئیسہ اگر اپنے ہاتھ سے اٹھا کر آدھا کیلا بھی دے دیتی تو دن بھر پڑا سوکھتا۔ بتمیا اسے ہاتھ بھی نہ لگاتی۔

مگر آج تو بھری مجلس میں اس کی ذلت ہوئی تھی۔ جیسے رئیسہ نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہو۔ دن بھر وہ انتقام کی آگ میں سلگتی پھری۔ پھر کئی دن کے بعد وہ کافی سنبھل گئی۔ اپنا کھویا ہوا وقار واپس لانے کے لیے اس پر سوار ہونے والا سایہ منت کی رشوت لیے بغیر ہی اترنے لگا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو قابو میں رکھتی۔ پلیٹوں میں بچے ہوئے پراٹھے کے ٹکڑے اور جھوٹی ہڈیاں راکھ میں پڑی سڑتیں۔ کتنی بار منی کرنی چھپلیں' اماں کا بٹوا اور خالہ کی تلے دانی اس کی جانب کھسک آئیں کہ ہمیں لے کر فرار ہو جاؤ' مگر اس نے سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔

اب یہ دکھانا ہے کہ وہ نجیب الطرفین ہے۔ اس کے جسم میں کوئی چمرگ نہیں ہے۔ اماں تخت پر روپیہ رکھ کر بھول گئیں تو اس نے لا کر دے دیا۔ رشیدہ کا قلم کھو گیا مگر صبح کو مسہری کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ وہ چاہتی تھی گھر والوں میں بھی اپنی نیک چلنی کا احساس جگائے۔

اب رات کو وہ بی بی سے الف بے پڑھنے لگی اور پانچوں کلمے فر فر سنا کر امامن پر اپنی قابلیت کا رعب گانٹھا کرتی۔

مگر ٹھیک ان دنوں جب وہ گھر والوں کی رائے بڑی حد تک اپنے متعلق اچھی پا رہی تھی' رئیسہ نے اس پر گھڑی چرانے کا الزام لگایا اور جلتی لکڑیاں مار مار کے اقرار کروانا چاہا۔ رشیدہ نے بڑے افسوس کے انداز میں اس سے چرانے کی ترکیب پوچھی۔ واجد اور منی دور کھڑے آنکھیں جھپکا کے تماشا دیکھتے رہے۔ خالہ نے گھسے پٹے کوسوں کے درمیان کوئی موزوں سی مثال سوچنا شروع کر دی۔ اماں نے سنا تو پلنگ پر لیٹی لیٹی جوتی اٹھا کر ماری جو سیدھی رئیسہ کے گال پر آ لگی۔ آج اس کی گہری خاموشی اور بھی بری ثابت ہوئی۔ نفسیات کی اسٹڈی کرنے والی رشیدہ نے بھی کہہ دیا کہ چور وہی ہے۔ پہلی بار اتنی قیمتی چیز چرانے کی ہیبت ہے جس کی وجہ سے بتمیا سہم گئی ہے اور ہمیشہ کی طرح جھوٹی قسمیں نہیں کھاتی۔ رشیدہ کی ہاں میں ہاں ملا کے اشتیاق بھی قانونی تاویلیں پیش کرتے رہے۔ کمرے میں پڑے چھینکتے کھانستے حامد میاں نہ جانے مچھر کی طرح کیا بھنبھنائے جا رہے تھے۔ بہت دیر تک اس معزز عدالت میں کھڑی وہ اپنے لیے رحم کے الفاظ ڈھونڈتی رہی' جہاں سماجی

نفسیاتی اور معاشی پہلوؤں سے اس کے جرم پر روشنی ڈالی جا رہی تھی۔ پھر اپنی بے بسی کا احساس کر کے وہ زندگی میں پہلی بار پھوٹ کے رو پڑی۔ آج ہر چوٹ اس کے دل پر لگ رہی تھی اور ہر گالی تیر کی طرح اس کی کھال میں پیوست ہو رہی تھی۔ بڑی دیر تک اپنے سوجے ہوئے گال کو ہاتھ سے چھپائے رئیسہ بکتی رہی۔

"لو بھئی۔ اب کسی ثبوت کی کیا ضرورت ہے۔ ذرا صورت دیکھ لو۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات نظر آ رہے ہیں۔"

رئیسہ اسے پولیس کے حوالے کرنے پر بضد تھی مگر اماں نے پہلے اس کی ماں کو بلوایا تھا کہ اگر وہ گھڑی ماں کو دے آئی ہے تو معاملہ یوں ہی طے ہو جائے۔

زخموں سے چور شکستہ جسم کو ٹھنڈے پتھروں سے بچا بچا کر وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

ایک بار اس کے چچا کو پولیس والے پکڑ کے لے گئے تھے۔ پھر وہ بہت دنوں کے بعد لوٹ کے آیا تو برسوں کا بیمار لگتا تھا۔ اس نے اماں کو بتایا تھا کہ جیل میں بھوکا رکھتے ہیں' کوڑوں سے مارتے ہیں۔ بتمیا کا حلق جیل کے تصور سے خشک ہو گیا۔ یوں ہی سوچتے سوچتے اب آدھی رات بیت چکی تھی۔

آنگن کا نل کھول کر پانی پینے میں اس نے دیکھا' دالان میں ایک ہلکا سا بلب جل رہا ہے اور سب سو چکے تھے۔ بی بی کا کمرہ بند تھا۔ سامنے والے کمرے میں ابھی تک روشنی ہو رہی تھی۔ غیرارادی طور پر وہ کمرے کے اندر چلی گئی۔ رئیسہ آرام کرسی پر بیٹھے سو گئی تھی' اس کی گود میں کتابیں پڑی تھیں اور ایک ہاتھ اوپر اٹھا ہوا تھا۔

اسے دیکھتے ہی بتمیا کے دل میں دبے ہوئے شعلے بھڑکنے لگے۔ جی چاہا چھری اٹھا کر روئی کی طرح اسے دھنک ڈالے۔ اس کی روتی بسورتی صورت بگاڑ کر اتنی مضحکہ خیز بنا دے کہ حامد بھی نفرت سے منہ پھیر لے۔ انتقام کا جوش اس کے ہاتھوں میں سمٹ آیا۔

پھر اچانک وہ ساکت ہو گئی--- رئیسہ کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ میں سنہری گھڑی کی زنجیر جگمگا رہی تھی--- دوپہر اسے مارتے وقت رئیسہ کہہ رہی تھی:

"پورے دو سو کی تھی میری گھڑی۔ کمبخت نے اگر بیچ دی تو خوب گل چھرے اڑائے گی۔"

سانس روکے' بڑی آہستگی سے بتمیا نے گھڑی اتار لی اور دھڑکتے دل سے دروازے

کی جانب بڑھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سر پہ کوئی پہاڑ اٹھائے چل رہی ہو۔

امرود کے پیڑ پر چڑھ کر وہ باہر والے صحن میں کودی اور دروازہ کھولنے سے پہلے سانس روک کر اس نے سوچا:---

کیا اللہ میاں اور پولیس والوں کو یہ بھائی نہ دے گا کہ اس پر کسی کا سایہ ہے---؟ پسینے سے بھیگی' دھڑکتی ہوئی مٹھی میں گھڑی دبائے' وہ تیزی سے اندھیری گلی میں دوڑنے لگی___۔

○

نئی عورت (افسانے)

سرورق: ریاض

فکشن ہاؤس

۱۸۔ مزنگ روڈ، لاہور